

تحریت خمس نبوت

شورش کاشمیری

تحریک ختم نبوت

(۱۸۹۱ء سے ۱۹۰۴ء تک)



شورش کاشمیری



مطبوعات پٹانے = میکلوڈر وڈ لاہور

واحد تقسیم کنندگان : الفیصلہ

ناشران تاجران کتب
حیدرآباد دکن لاہور

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

مارچ 2003ء

کتاب :	تحریک ختم نبوت
مصنف :	شورش کاشمیری
مطبع :	تعریف پرنٹرز لاہور
ناشر :	مطبوعات چٹان لاہور
اشاعت :	چہارم
قیمت :	125/- روپے

واحد تقسیم کنندگان: الفیصل ناشران و تاجران کتب
غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

انتسابے



شہیدانِ تحریکِ ختمِ نبوت کے نام



بنا کر دندِ خوش رستمِ جاکِ و خونِ غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاکِ طینت را



ہندوستان میں برطانوی حکومت

۱۸۵۷ء ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار کا سالِ وفات تھا، لیکن یہ سانحہ اچانک نہیں تھا۔ ادنگ زیب نے مارچ ۱۸۵۷ء میں انتقال کیا تو اس کے جانشینوں ہی سے سلطنت کو گھن گنا شروع ہو گیا۔ فی الجملہ ڈیڑھ سو سال میں کئی حادثوں اور سانحوں نے سلطنت کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا۔ ان کے جانشینوں کا یہ حال تھا کہ ان کی بدولت سلطنت کا مرکزی وجود متزلزل ہو گیا۔ کئی ایک صوبیداروں نے خود مختاری اختیار کی۔ مرہٹوں اور روہیلوں نے سر اٹھایا، پٹھان روگردان ہو گئے، سکھوں نے پنجاب پر قبضہ کیا۔ ادھر رنجیت سنگھ نے آنکھیں بند کیں اور ہمارے مارچ ۱۸۴۹ء میں پنجاب انگریزوں کی حکمرانی میں آ گیا۔ ہندوستان کے ساحلی علاقے اور ان سے ملحق صوبے کیسے سالما کیسے جزو اپنے ہی انگریزوں کے ہاتھ میں تھے بنگال، بہار، اڑیسہ کے علاوہ بنارس کا ایک علاقہ ایٹ انڈیا کمپنی کی دستبرد میں تھا۔ مختصر یہ کہ بہادر شاہ کا مصلوب اقتدار ۱۸۵۷ء میں قلعہ معلیٰ کی چار دیواری کے اندر تھا، یا پھر کسی حد تک مرحوم دہلی ان کے زیر نگین تھی۔ اگر ۱۸۵۷ء کے وسیع ہنگامے پیدا نہ ہوتے اور قلعہ معلیٰ جو مغلیہ اقتدار کی آخری چمکی تھا ان ہنگاموں کی علامت نہ ہوتا یا پھر علماء جہاد کا تصور نہ پھونکتے، فوج جگہ جگہ باغی نہ ہوتی اور کئی ایک راجاڑے یا نواب علم رتیخربند نہ کرتے تو ایک سلطنت جو ختم ہو چکی تھی، اس کے متعلق یہ کہنا مشکل تھا کہ اُس کا زوال ۱۸۵۷ء میں ہوا۔ فی الجملہ ۱۸۵۷ء اس جان بلب مریض کی جانحی کا آخری سال تھا۔

اس سال سلطنت کا عالم نزع ختم ہو گیا۔

اورنگ زیب کا بیٹا معظّم شاہ بہادر شاہ کے نام سے تخت پر بیٹھا، لیکن اس کی تخت نشینی سلطنت کے زوال کا آغاز تھا۔ اُس نے اپنے ہی بھائیوں سے جگلیں کیں اور پچھ سال میں رحلت کر گیا۔ اُس کا جانشین جہاندار شاہ آپس کی غوریز لڑائیوں کے بعد تخت پر متمکن ہوا، لیکن اس کا ایک ہی کارنامہ تھا کہ اُس نے خاندان کے تقریباً تمام شہزادوں کو قتل کر دیا۔ خود اول درجہ کا نالائق اور پرلے درجے کا عیاش تھا۔ اس کو سزا دینے کے لیے بہادر شاہ کا پوتا فرخ سیراٹھا، اُس نے جہاندار شاہ کو شکست دی جہاندار شاہ اپنی داشتہ لال کنور کے لباس میں قلعہ معلیٰ سے بھاگ نکلا، لیکن جاتا کہاں؟ پکڑا گیا اور قتل کیا گیا۔ فرخ سیر نے پہلے مغل شہزادوں کو اندھا کیا، پھر قتل کیا، لیکن سادات باراہہ نے آخر کار اس کی آنکھیں نکلوا دیں اور قتل کروا دالا۔ سادات باراہہ نے قلعہ معلیٰ کا اقتدار ہاتھ میں لے کر مغل شہزادوں کو بچانا شروع کیا۔ وہ (سادات باراہہ) بادشاہ گر تھے۔ انہوں نے ایک بدقوق شہزادے رفیع الدرجات کو تخت پر بٹھایا، لیکن وہ چند ہی ماہ میں فوت ہو گیا۔ ایک دوسرے شہزادے رفیع الدولہ کو جو بمشکل پندرہ برس کا تھا اور سات آٹھ بیگمات کا شوہر تھا، بادشاہ بنایا۔ وہ اپنی ماں کے پاس رفتار ہا کہ میں نہیں بچوں گا۔ وہ غفرلہ ہو گیا، تو سادات نے شہزادہ روشن اختر کو تخت بخشا۔ وہ محمد شاہ زنگیلا تھا۔ اس کے عہد میں سادات باراہہ کا خاتمہ ہو گیا۔ اس دوران نادر شاہ نے ۱۷۳۹ء میں حملہ کیا اور دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ سلطنت کیا؟ ایک مہیب مذاق تھا۔ زنگیلا کا سب بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس کے باورچی خا کا مامانہ خرچ ۳۴ کروڑ تھا۔ وہ ہر روز تین تین سو کبیاں اپنے سامنے نگلی بچوایا کرتا۔ اس کے دور ہی میں مرہٹوں، سکھوں، رومیلیوں اور افغانوں کی بغاوتیں اپنے عروج کو پہنچیں۔ وہ لہو و لعب کی معراج پر رہا۔ زنگیلا کے بعد اختر شاہ حکمران ہوا، لیکن اُس کے کمانڈر انچیف غازی الدین نے اس کی اور لاکھ کی آنکھیں نکلوا کر دونوں کو اندھا کر دیا۔ اُس کی جگہ بہادر شاہ کا پوتا عالمگیر ثانی تخت پر بیٹھا۔ اُس نے ڈوموں اور ڈھاریوں کو درباری عمداں پر فائز کیا۔ ایک کبوتر پر دل آگیا، تو اُس کو ملکہ بنا کر قلعہ میں ڈال لیا۔ غازی الدین نے اس کو بھی ۵۹ لاکھ میں ذبح کر دیا۔ اُس کا جانشین شاہ عالم کبوتر کے بطن سے تھا۔ اُس نے انگریزوں کی پناہ لی اور بنگال، بہار، اڑیسہ کی دیوانی انیس ۲۶ لاکھ سالانہ مالگذاری میں عطا کی۔ گویا پناہ لینے کے عوض کئی کروڑ روپے کی دیوانی ۲۶ لاکھ روپے میں بیچ دی۔ اس کے

عہد (۱۷۶۱ء) میں احمد شاہ ابدالی نے حملہ کیا۔ اور پانی پت میں کامیابی کے بعد لوٹ گیا۔ غلام قادر روہیلہ نے اسی کے زمانہ میں شاہی خاندان کی عورتوں کو بُری طرح ذلیل کیا اور انہیں قلعہ کے اندر بچوایا۔ پھر شاہ عالم کی آنکھیں نکلوا دیں، لیکن اس کا بدلہ مرہٹہ سرداروں نے لیا کہ غلام قادر روہیلہ کو بکرے کی طرح ذبح کیا اور اس کا سر کاٹ کر شاہ عالم کے پاس بھیجا۔ اُدھر شاہ عالم کی عیاشی کا یہ حال تھا کہ اندھا ہو کر بھی خواجہ سراؤں کو خوبصورت لڑکیوں کی فراہمی کا حکم دے رکھا تھا۔ شاہ عالم ۱۸۰۳ء میں مر گیا۔ ادھر ایسٹ انڈیا کمپنی نے تمام اقتدار غصب کر رکھا، لیکن اپنی مصلحتوں کے باعث وہ بادشاہ کو بظاہر رکھنا چاہتی تھی؛ چنانچہ شاہ عالم کا جانشین اکبر شاہ بنایا گیا۔ پھر ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوا، لیکن بیس سال بعد معزول ہو کر مانڈے (برما) جلاوطن کر دیا گیا یہ گویا ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت کا حرف آخر تھا۔ —!

ہندوستان کالی کٹ (الابار) میں پہلے پہل ۲۰ مئی ۱۷۹۸ء کو داسکو ڈی گاما کی زیر سرکردگی، یورپی اقوام میں سے پرتگیزی، ایک عرب، مہاراجپوت احمد بن ماجد نجدی کی راہنمائی میں وارد ہوئے۔ پھر دوسری یورپی قوموں نے آنا شروع کیا۔ ولندیزیوں نے فضا کو اپنے لیے غیر مفید پایا، تو جزائر شرقی ہند کی طرف چلے گئے۔ ان کے بعد فرانسیسی اور انگریز آئے لیکن ہندوستان کے اقتدار کا پلڑا انگریزوں کے ہاتھ رہا۔ اور وہ آہستہ آہستہ برطیمن پر حکمران ہو گئے۔ انہوں نے دوستی اور دشمنی کے طویل المیعاد منصوبے باندھ کر ہندو کو فتنہ کر لیا۔

سب سے پہلے بنگال، بہار، اڑیسہ میں قدم جاتے۔ سراج الدولہ ان علاقوں کا اصل ناظم تھا۔ اُس سے جھگڑا پیدا کیا، پھر صلح کر لی۔ امیروں اور درباریوں خصوصاً میر جعفر سے ساز باز کر کے راستہ ہموار کیا۔ آخر سراج الدولہ ۱۷۵۷ء میں قتل کر دیا، اُس کی لاش کو ہاتھی پر رکھ کر پھرایا اور میرن نے قیہ قیہ کیا۔ سلطان ٹیپو بجز ۳ سال ۱۷۹۲ء میں تخت نشین ہوا۔ وہ اس سے پہلے ۱۷۸۱ء تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف کئی ایک لڑائیوں میں حصہ لے چکا تھا۔ ۱۷۹۹ء میں انگریزوں نے سرنگاپٹیم کا محاصرہ کیا۔ سلطان ٹیپو اور ان کے جانثاروں کی عظیم الشان شجاعت کے سامنے غنیم کے چھٹے چھوٹ گئے، لیکن غلام نے قلعہ کی تفصیل میں شگاف کر دیا اور وہ داد شجاعت دیتا ہوا شہید ہو گیا۔ ولزلی نے شکر کا سانس لیا — شہادت کی دو تاریں کسی گئی ہیں۔ اول شمشیر گم شد دوم ذہب عنہ الردم

والمهند متعلجا۔

علامہ اقبالؒ کے نزدیک سلطان کی شہادت ہندوستان میں مسلمانوں کی غفلت کا حرفِ آخر اور اُن کے زوال کا وسط تھا۔ ہیسٹنگز، کلایو کا جانشین تھا، اس کے ہاتھوں ۱۷۵۷ء میں روہیلوں کی خوفناک تباہی ہوئی اور ۵ لاکھ انسان بے گھر ہوئے۔ ۱۷۵۹ء میں نانا فرنیس، حیدر علی، نظام دکن اور مرہٹہ ریاستوں میں اتحاد ہو گیا۔ حیدر علی نے مدراس پر چڑھائی کی اور انگریزوں کو شکست دی۔ نانا فرنیس نے بمبئی پر حملہ کیا اور جنرل گوڈارڈ کو ہجکا دیا۔ اس سے گھبرا کر دارن ہیسٹنگز نے اس اتحاد کو رشوت و ترغیب کی چالوں سے پارہ پارہ کیا۔ آخر ۱۷۵۸ء میں انگریز تاجر ہندوستان کی سب سے بڑی بحران طاقت بن گئے۔ میسور ختم ہو گیا، مرہٹہ معدوم ہو گئے، حیدر آباد مغلوب ہو گیا اور اودھ کا نصف علاقہ دارن کے قبضہ میں آ گیا۔ ۱۷۵۸ء میں ولیم بیٹنگ نے تاج محل کو گرہ لگا کر مرمر فروخت کرنا چاہا، لیکن قلعہ آگرہ کی نیلامی تسلی بخش نہ ہوئی تو باز آ گیا۔ میران سندھ کو مغلوب کیا، ان کی بیگمات کا سونا لوٹا، ہندوستان کے باہر افغانستان پر چڑھائیاں کیں۔ ۱۷۵۹ء میں جنرل پالک کابل کے پُر رونق بازار کو آگ لگا کر واپس آ گیا۔ سرحد میں حضرت سید احمدؒ اور شاہ اسماعیلؒ کی شہادت (۶ مئی ۱۷۵۳ء) کے بعد اپریل ۱۷۵۹ء میں انگریزوں کی عملداری شروع ہو گئی۔ وہاں معرکہ بالا کوٹ کی فیجابی کے بعد کچھ حکمران تھے اور یہ سب ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے قصر ربیع الشان کے تدریجی انہدام و انحطاط کا نقشہ تھا، بالآخر ۱۷۵۵ء میں سلطنت کا ٹٹماتا ہوا چراغ گل ہو گیا۔ اور انگریز برعظیم کے فرمانروا ہو گئے۔ بلاشبہ انگریز مستقبل کی ایک زنگارنگ طاقت تھے۔ اُنہوں نے مسلمانوں کو جسمانی طور پر مغلوب کیا، پھر مختلف معرکوں اور غیاریوں کے بعد اُن کی حکومت کا ہر نشان مٹا ڈالا۔ مگر ہر نوعی استبداد کے باوجود مسلمانوں کو من حیث القوم دماغی طور پر مغلوب یا مفتوح نہ کر سکے۔ ادھر زمانہ اس حال میں تھا کہ اشبح شخصیتیں رزمگاہ شہادت میں قربان ہو رہی تھیں ادھر اس زمانہ ہی میں نادۂ روزگار وجود دین کے افق پر طلوع ہو رہے تھے۔ شاہ ولی اللہؒ اور ان کا خاندان اس عبد انحطاط ہی کا اُجالا تھا۔ سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیلؒ اس دور ہی میں دولہ جہاد پیدا کرتے ہوئے جنگال سے سرحد تک گئے تھے۔ ان مختصر مسلمانوں کا دینی اور تمدنی سرمایہ اس دور ہی میں اپنی رفعت کو پہنچ رہا تھا، لیکن مسلمانوں میں جسمانی عمر وارد ہو چکا تھا۔ اُن کا ذہنی علوم معراج پر تھا۔ تمام بیگانہ و بیگانہ رکادٹوں کے باوجود مسلمانوں کے ذہن جہاد سے معمور تھے۔ انگریزوں کو ایک سو برس کی ٹنگ تاز

میں بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کے لیے جہاد جانیس (ڈٹامن) کا درجہ رکھتا ہے اور وہ اس سے سرشار ہیں ان میں علماء نے قسطنطنیہ کی اساس پر ایک ایسی رُوح پھونک دی ہے کہ جہاد کا، ہمہ ان کے شریانون میں خن کی طرح دوڑتا ہے۔ جس طرح بعض نظریے انسانی فطرت میں وخیل ہو کر ان کی فطرت بن جاتے ہیں اور انہیں موت کی آخری ہچک چمک علیحدہ نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح جہاد کو مسلمانوں کے جسد سے خارج کرنا ممکن نہیں۔ وہ ہمہ وجود اس کے شیعہ ذاتی ہیں۔ انگریزوں کی دُور اندیشی کے نزدیک مسلمانوں کی فطرت کا یہی حصہ خطرناک تھا۔ وہ کئی واسطوں سے محسوس کرتے تھے کہ اپنے ہیمنانڈ تشدد سے انہوں نے مسلمانوں کو ضرور دبا لیا ہے اور وہ لاچار ہو کر سپر انداز ہو گئے ہیں لیکن ان میں دو چار فیصد قدار پیدا کیے جاسکتے ہیں۔ کچھ فی صد لاچار بھی بھل آئیں گے، لیکن قلبی وفادار پیدا کرنا ناممکن ہے۔ اُن کے دل بہر حال باغی ہیں اور اس بغاوت کو حکومت کی معرفت فرو کرنا ممکن نہیں۔

انگریزوں نے سلطنت کی فقیہی کے بعد مسلمانوں کی ملی وحدت کے حصار میں شگاف پڑشگاف پیدا کرنے شروع کیے اپنے ہمنوا علماء کی ایک جماعت اُٹھائی۔ پیدا احمد شہید، شاہ اسماعیل اور مجاہدین کا زور توڑنے کے لیے انہیں دبا بی قرار دیا تاکہ اُن پڑھ مسلمانوں کے ذہنی منفرد سے فائدہ اٹھا سکیں۔ انہی دنوں حجاز میں ترک اپنے مخالفوں کو اس الزام سے مارتے اور کچلتے تھے۔ انگریزوں نے ہندوستان میں اس سے کما حقہ فائدہ اُٹھانا چاہا، لیکن جماعت مجاہدین کو زیر کرنا، یا اس کے ہمہ گیر اثرات کو توڑنا سخت دشوار تھا۔ جہاد ایک ناقابلِ تغیر جذبہ تھا۔ انگریزوں کو شمال مغربی سرحد سے جو خدشہ تھا، وہ جماعت مجاہدین کی بدلت ان کی سلطنت کے لیے، کئی حادثوں کا سبب ہو سکتا تھا اور اب وہ اسی غرض سے جہاد کا قلع قمع چاہتے تھے۔ غرض ان کے سامنے ہندوستان میں برطانوی عملداری کو استحکام دینے کے لیے چار سوال تھے :

۱۔ ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی دراز ٹی ٹرا اور سیاسی استحکام اس وقت تک ناممکن ہے جب تک مسلمانوں میں رُوح جہاد کا فرما ہے۔

۲۔ مسلمانوں اور ہندوؤں میں مغائرت و منافرت کیونکر پیدا کی جاسکتی ہے۔ اب تک عقیدوں کی منہ کے باوجود اُن کے ذہنوں میں تصادم نہیں تھا۔ دونوں مذہبی بعد کے باوجود انگریزوں سے متحد ہو کر لڑنے نکلے اور تب سوال صرف مسلمانوں کی بادشاہت کا تھا۔

۳۔ اسلام اور پیغمبر اسلام پر کریم حملوں کا محاذ کھولا جائے۔ اس طرح مسلمان جہاد سے روگردان ہو کر

مداخلت کے محاذ پر آجائیں گے۔ مجادلہ کی جگہ مناظرہ لے گا۔ جہاد کا خدشہ بڑھے گا۔ مسلمانوں کی کایا کلیپ ہوگی؛ نتیجہ برطانوی سلطنت کے استحکام کی راہیں ہموار ہوں گی۔

۴۔ مسلمانوں میں نئے اور پرانے فرقوں کی معرفت متحارب و متصادم عقائد پیدا کئے جائیں، جن سے ان کی ملی وحدت پر لگندہ ہو جائے اور وہ باہمی لفاق کی مخلوق ہوں۔

انگریز ہر چار سوالوں کا جواب پیدا کرنے میں کامیاب رہا۔ اُس نے بعض مراحل گزر جانے کے بعد، ہندوستانی مسلمانوں کی اجتماعی طاقت کو پہلی جنگ عظیم کے آغاز تک اس قدر لاغر کر دیا کہ مسلمان نظر بہ ظاہر مسلمان ہی تھے، لیکن ان کی اکثریت یمن و یسار کے مذہب کا شکار ہو کر غلامی پر قانع ہو گئی۔ ہندوؤں نے آزادی کا سفر شروع کیا، تو مسلمان اس سے بدظن تھے جس قوم کے نصب العین کاقتل جہاد پر تھا، اُس نے انگریزوں کی خاطر خلافت عثمانیہ کو فساد فی الارض کا ترنگ قرار دے کر عربوں اور ترکوں کے خلاف جہاد کیا۔

انگریزوں کی پریشانی کا اندازہ، ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" OUR INDIAN MUS S ALMANS سے ہو سکتا ہے۔ اُس نے واضح طور پر لکھا ہے کہ مسلمانوں میں جہاد کا تصور ان کی سلطنت کے لیے ایک متقل خطرہ ہے۔ انگریزوں نے ایک طویل استبداد کے بعد یہ محسوس کیا کہ بیہانہ تشدد اجتماعی ہو یا انفرادی مسلمانوں سے اس جذبہ کو محسوس کر سکتا، تو انہوں نے جہاد کے خلاف مباحث پیدا کر کے علماء سے فتوے حاصل کرنا شروع کیے اور کلام اللہ کی تفسیروں کا مزاج بدلوانا چاہا۔ ڈاکٹر ہنٹر کی حوالہ کتاب سے اُن علماء و فضلاء کا پتہ چلتا ہے جو اس وقت سیخ جہاد کا فتویٰ دے رہے تھے۔ کتاب کے آخر میں مکہ معظمہ کے حنفی، شافعی اور مالکی مفتیوں کا فتویٰ درج ہے جو ان سے حاصل کیا گیا اور ہندوستان کے مسلمانوں میں شد و مد سے تقسیم کیا گیا۔ استفادہ تھا کہ ہندوستان کے عیسائی حکمران اسلام کے تمام احکام مثلاً صوم و صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ وغیرہ میں مداخلت نہیں کرتے تو کیا ہندوستان دارالاسلام ہے کہ نہیں؟ ہر سہ مفتیوں نے ہندوستان کے دارالاسلام ہونے کا فتویٰ دیا اور لکھا کہ ہندوستان دارالحرب نہیں اور جہاد دارالحرب میں جائز ہے۔ ہنٹر نے اس فتویٰ کو عیاری قرار دیا۔ اور اس سے بھی جہاد کے معنی پیدا کیے۔ ایک دوسرا استفتاء بجاگل پور میں کشنر کے پرنسپل اسسٹنٹ سید امیر حسین کی طرف سے تھا۔ اس کا جواب، ۱۸ جولائی ۱۸۷۸ء کو شمالی ہند کے نو علماء کی طرف سے تھا۔ ان علماء میں سے سات لکھنؤ،

اور دو راپوری تھے۔ انہوں نے لکھا کہ اس ملک میں جہاد واجب نہیں۔ ایک پرخ یہ بھی لگائی ہے کہ جہاد کیا جاتے، تو اس میں مسلمانوں کی فتح اور اسلام کی برتری کا قیاس غالب ہو۔ اگر اس قسم کے قیاس کا امکان نہ ہو تو جہاد ناجائز ہے جن علماء کے نزدیک ہندوستان دارالاسلام تھا اور جہاد واجب نہیں تھا، ان کی مخالفت کرتے ہوئے مٹھن سوسائٹی کلکتہ کی جانب سے مولوی کر امت علی نے لکھا کہ اگر کوئی شخص دارالاسلام کے مفروضہ پر انگریز حکمرانوں سے جنگ کرتا ہے، تو مسلمان عوام اپنے حکمرانوں کا ساتھ دینے کے مترقا پابند ہیں۔ انہی دنوں سرکاری مسلمانوں نے کلکتہ میں ایک جلسہ کیا۔ مولوی کر امت علی جو پوری، شیخ احمد آفندی انصاری مولوی عبدالحکیم اور خان بہادر، مولوی عبداللطیف نے جہاد کے خلاف تقاریر کیں شیخ آفندی کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا کہ آپ مدینہ منورہ کے معزز شہری اور حضرت ابوالیوب انصاری کی اولاد میں سے ہیں۔ آفندی نے اسی شرف کے تحت انگریزوں کی وفاداری پر زور دیا اور جہاد سے پرہیز کا اعلان کیا۔ ڈاکٹر ہنٹر نے شیخ احمد آفندی کی مذکورہ تقریر اپنی کتاب کے حاشیہ میں من و عن درج کی اور اس پر سنڈیگی کا اظہار کیا ہے۔

سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی تحریک کے سب سے بڑے مخالف مولانا فضل حق خیر آبادی (۱۸۶۱ء) بمبئی دہلی کے حکم میں سرشتہ دار اور دوسرے مخالف مولوی فضل رسول بدایونی (۱۸۶۲ء) بدایون میں کلکٹر کے سرشتہ دار تھے۔ انگریزوں نے ان کے علاوہ اس وقت کے بعض نامور علماء اور کئی ایک جید فضلا کو سرکاری خدمات کے لیے حاصل کر لیا۔ ان میں مفتی صد الدین آزرہ (۱۸۶۸ء) مولوی فضل امام خیر آبادی (۱۸۶۹ء) اور خیر آباد کے علماء کا پورا قبیلہ تھا۔ اس کے علاوہ اد بھی کئی نامور لوگ تھے۔ انہوں نے منصب افتاء و قضاۃ سے انگریزوں کی منشاء کے مطابق تسبیح جہاد کے فتوے جاری کیے اور اس طرح انگریزی اقتدار کو بحال مضبوط کیا۔ انگریزوں نے تحریک مجاہدین کو دہلی لکھنؤ اپنے ہمنوا علماء کے ہاتھ میں ایک ہتھیار دے دیا پھر جو شخص انگریزوں کا باغی تھا، اس کو دہلی کہہ کر پٹوایا۔ ان دنوں دہلی، اور باغی، مترادف الفاظ تھے۔ نوبت بہ اینجا رسید کہ علماء سونے عوام کو بھڑکا کر مسجدوں میں ان کا داخلہ روک دیا۔ سر عبدالرحیم نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس ۱۹۲۵ء کے صدارتی خطبہ میں بیان کیا تھا کہ بنگال میں دہلی تحریک کی آڑے کر مسلمان زمینداروں کی تمام املاک، جو وسعت میں بنگال کا ایک چوتھائی تھا، انگریزوں نے ضبط کر لی اور انہیں افلاس و نامرادی کے حوالہ کر دیا اور وہ در بدر ہو گئے۔

مولوی محمد حسین بٹالوی ان علماء میں سے تھے جنہوں نے مرزا غلام احمد کے دعوائی نبوت کی چھٹا کا آغاز کیا اور اس کو آڑے ہاتھوں لیا۔ وہ متعل معنوں میں وہابی تھے اور انہیں وہابی ہونے کی سزا کا اندازہ تھا۔ انہوں نے انگریزوں کی حمایت کو واجب قرار دیا اور اس کے عوض گورنر جنرل سے وہابی جماعت کے لیے اہم دیٹ کا نام حاصل کیا۔

مولوی محمد حسین بٹالوی (۱۳۲۸ھ) نے جہاد کی منسوخی پر ایک رسالہ "الاتقادی مسائل الجہاد" فارسی میں تصنیف کیا۔ اس کے مختلف زبانوں میں ترجمے کیے گئے۔ پنجاب کے دو گورنروں نے اس پر خوشنودی کا اظہار کیا۔ اس کے انگریزی، عربی اور اردو متن کی ہزار ہا کاپیاں ملک سے باہر بھیجی گئیں۔ مولانا مسعود عالم نے ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک میں لکھا ہے کہ اس کے عوض مولوی صاحب کو ہاجر عطا کی گئی۔ اُنکے نزدیک پوری کتاب تحریف و تدیس کا عجیب و غریب نمونہ ہے۔

ہندوستان میں دیوبند کا وجود انگریزوں کے لیے سونیاں روح تھا۔ اس کا توڑ پیدا کیا گیا، لیکن وہ توڑ نہیں خلفشار تھا۔ سرسید نے علیگڑھ کی بناؤالی، تو مسلمانوں کی نئی پود میں، حکومت انگلیشہ سے تعاون کی نیواٹھاٹی۔ سرسید صاحب دل انسان تھے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ مسلمانوں کا ٹوٹا ہوا ڈھانچہ اب اسی طرح بن سکتا ہے کہ وہ مغربی تعلیم حاصل کریں۔ انگریزوں کی نگاہوں میں اپنے کسی تصور کے تحت کھنکس نہیں اور سیاست بالآخر ہر حکومت کے ہو جائیں۔ دیوبند اور علیگڑھ دو مختلف دھارے تھے۔ دیوبند جہاد کا ذہن تھا اور علیگڑھ تعاون کا ذہن تھا، لیکن اس کے باوجود آپس میں دست و گریبان نہ تھے۔ انگریز دیوبند کو اپنے لیے خطرہ سمجھتا تھا، اسی لیے بعض شرعی وجود اور دینی سلسلے پیدا کیے گئے جنہوں نے تین جہاد کی غنی کارگزاری کے تحت فزعی مسائل کو حقیقی مسائل بنا دیا۔

بعض چیزیں پیش آمدہ حالات میں ناگزیر تھیں، لیکن اپنے مقاصد کی پیوند کاری کے بغیر انگریز کوئی سا اصلاحی قدم نہ اٹھاتا۔ مثلاً فورٹ ولیم کالج (۱۸۲۷ء تا ۱۸۵۷ء) کا قیام، اردو ادب کا رنچ پھیرنے کی ایک تحریک تھا۔ اس تحریک کے مافی الضمیر میں مسلمانوں کے ذہن کو خلاف استعمار رجحانات سے پٹا دینا تھا، چنانچہ اس زمانہ میں اہل قلم کی پوری کھپ (الامامہ اللہ) ادب برائے ادب کی ہو کے رہ گئی۔ انگریز مطمئن ہو گیا، شاعری کا مزاج بھی پلٹ گیا۔ اس میں نعرہ رستخیز نہیں تھا اور نہ ہونا چاہیے تھا۔ جن لوگوں نے نثر کا مزاج بدلا اور انکی نثر مسلمانوں کی نئی پود کا ذہنی احاطہ کر گئی۔ اس کے بانی سرسید احمد تھے۔

نثر کا چھٹا دور جو ۱۸۵۵ء کے بعد شروع ہوا، اُس کے عناصر راجہ محمد حسین آزاد، ذکاء اللہ دہلوی، ڈپٹی نذیر احمد اور خواجہ الطاف حسین حالی تھے۔ ان کے نثری کارناموں پر تبصرہ کرنا اس مضمون سے خارج ہے۔ لیکن ڈپٹی نذیر احمد اور ذکاء اللہ دہلوی برطانوی اقتدار سے غایت درجہ غلصہ تھے۔ محمد حسین آزاد کے والد دہلوی محمد باقر کو دہلی کالج کے ایک استاد مسٹر ٹیلر کے قتل کی پاداش میں جیل ہنس لے گئی سے اڑا دیا۔ اور یہ کوئی معمولی داغ نہ تھا، لیکن انگریزوں نے اپنے دام تزدیر کو جس طرح پھیلدا رکھا تھا۔ اُس کے سحرے انگریزی حکومت نے محمد حسین آزاد کو حاصل کیا اور چار آدمیوں پر مشتمل ایک جاسوسی ٹیم ۱۸۶۵ء میں وسطی ایشیا روانہ کیا۔ اس ٹیم میں پنڈت من پھول، محمد حسین آزاد، منشی فیض بخش لپٹاوری اور لالہ کرم چند تھے۔ آزاد نے روسی ترکستان کے مختلف علاقوں میں اپنے سیاسی فرائض کی بجا آوری میں سخت سے سخت مصائب برداشت کیے، مختلف روپ ہمارے، ان کے اپنے الفاظ ہیں کہ ”میں ۱۸ مہینے وسطی ایشیا کے دوران سفر ریگستان میں مارا مارا پھرتا رہا۔ بعض اوقات میری جان خطرے میں پڑ گئی“ لیکن ان خدمات کے صلہ میں ملا کیا۔ تین سو روپے کا انعام اور ایک سو روپیہ ماہوار تنخواہ۔ اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں استاد کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔

ڈپٹی نذیر احمد ۶ دسمبر ۱۸۳۶ء کو پیدا ہوئے، ۳۱ مئی ۱۹۱۲ء کو فالج کے حملہ سے رحلت کر گئے جس زمانہ میں مسئلہ جہاد انگریزوں کے لیے ایک مستقل خطرہ تھا۔ اُس زمانہ میں آپ نے شاہ عبدالقادر کے بعد پیلا ترجمہ کیا۔ تب شاہ عبدالقادر کے ترجمہ کو ۱۰۹ برس گزر چکے تھے۔ آپ کا ترجمہ ۱۹۰۰ء میں طبع ہوا تھا اور ڈپٹی صاحب کا ترجمہ ۱۸۹۹ء میں۔ انگریز مسئلہ جہاد کی بیخ کنی اپنی وفاداری بشرط ہتھوڑی کے لیے علماء کی ایک کمیٹی کا مہلے رہا تھا۔ ڈپٹی صاحب نے اس ترجمہ کے بعد ۱۹۰۶ء میں الحقوق والفرائع لکھی۔ اس کے بعد ۱۹۰۸ء میں الاجتہاد۔

سرولیم میور ۱۸۶۶ء میں یو۔ پی کالیفرنیا گورنر تھا۔ اس بد بخت نے رسول اکرمؐ کے حلاف ہندوستان میں سب سے پہلے تحریری بدزبانی کی نیورکھی اور ایک کتاب حیاتِ محمدؐ (LIFE OF MUHAMMAD) تصنیف کی۔ اُس نے لکھا کہ انسانیت کے دوسرے دشمن ہیں محمدؐ کی تنوار اور محمدؐ کا قسار۔ (نعموز اللہ) اسی بد بخت نے ملگرمہ کی پہلی عمارت ایم۔ اے۔ او سکول کا سنگ بنیاد رکھا۔ وہ قرآن محمدؐ سے عناد کے باوجود ڈپٹی نذیر احمد پر انتہائی مہربان تھا۔ اُس نے اپنی گورنری کے زمانہ میں نذیر احمد کو

ان کی بعض تصانیف پر گراں قدر انعامات عطا کیے گئے۔ تعریفی ریویو لکھے شمس العلماء کا خطاب دلویا۔ پھر جب سکدوش جوکر انگلستان واپس گیا، تو ایڈنبرا یونیورسٹی کا چانسلر ہو گیا اور ڈپٹی صاحب کو ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری عطا کی۔ اسکا وادیب انگریزی اقتدار کی طاعت میں ڈپٹی صاحب کی تفسیر اور حمایت میں بعض دوسری تحریریں تھیں۔ انہوں نے اطیعوا اللہ اطیعوا الرسول واولی الامر منکر میں اولی الامر کا مصداق انگریزوں کو بٹھرایا تھا۔

نذیر احمد نے لکھا کہ — خدا نے حکام وقت کی اطاعت فرض کر کے احکام شریعت کو ہمارے حق میں خود معطل کر دیا ہے۔ مزید فرمایا کہ احکام شریعت کا مقصود قیام امن ہے اور یہ مقصد انگریزی قانون سے بھی حاصل ہے۔ فرق صرف تذبذب یعنی طریق کار کا ہے۔ ”الحقوق والفرق“ حصہ دوم کے صفحہ ۳۱ پر لکھا ہے کہ ”ہمارے لیے انگریزی قانون بھی اسلامی شریعت ہے“ اس کتاب میں جہاد کا باب قائم نہ کرنے پر جو معذرت کی ہے اس میں لکھا ہے کہ :

”جس طرح احکام زکوٰۃ مفلس سے جو مالک نصاب نہ ہو اور احکام حج نامستطیع

سے متعلق نہیں، اسی طرح احکام جہاد مسلمانان ہند سے متعلق نہیں۔۔۔۔ ہم نے جہاد کا باب

اس لیے قائم نہیں کیا کہ عوام کا لالعام کے لیے، سرودستان یاد دہیندن نہ ہو جائے۔“

مشہور فاضل ڈاکٹر فلام جیلانی برقی نے ڈپٹی نذیر احمد سے متعلق صحیح کہا ہے کہ ان کا اسلام انگریزوں

کے ہاں گرو ہو چکا تھا۔ اور یہ ایک المیہ تھا کہ ایک طغر ملک کے طول و عرض میں علمائے حق پر جہاد کی

پاداش میں مقدمہ چلا کر انہیں موت یا کالا پانی کی سزائیں دی جا رہی تھیں، دوسری طرف اصل قلم کا ایک نامور

گروہ مسلمانوں میں انگریزی حکومت کی وفاداری کی ذہنی آبیاری کر رہا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مذہب کا

اختلاف شروع سے تھا، لیکن ان میں وہ تصادم نہیں تھا جو انگریز چاہتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں

نے اس تصادم کی فصل کا شت کرنا شروع کی اور اس میں بہت جلد کامیاب ہو گئے۔ انہیں ملاقاتنا کہ ہندو

مضنین اپنی کتابوں کا آواز بسم اللہ سے کرتے اور فارسی وارڈوں میں رنگے ہوئے ہیں۔ اس چیز کو انہوں نے

بہت جلد ختم کیا۔ حتیٰ کہ تعلیم کو یورپی سانچے میں ڈھال کر ہندو مسلم بنا ڈالا۔ پھر وہ اردو جو کبھی مشترکہ تھی، مسلمانوں

کی ہو گئی۔ یہ ایک طویل رُوداد ہے، لیکن اس کتاب کا حصہ نہیں؛ ورنہ ہم بیان کرتے کہ ہندو مسلم اختلاف

کیونکر تصادم بنا اور انگریزی استعمار نے اپنی اس خواہش کو کیونکر پروان چڑھایا۔ جن لوگوں کے پیش نگاہ

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈھائی سو سال (۱۶۰۸ء تا ۱۸۵۷ء) کے عرصہ میں اور اس کے ۲۵ سالہ دورِ حکومت (۱۸۳۳ء تا ۱۸۵۷ء) کے واقعات ہیں۔ پھر اس کے بعد ۱۸۵۹ء تا ۱۸۸۳ء کی سیاست کے ۲۵ سال ہیں۔ مزید برآں مسٹر بیک پرنسپل علی گڑھ کالج (۱۸۰۵ء تا ۱۸۹۹ء) ان کے جانشین مسٹر مایسن ۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۵ء اور ان کے جانشین اچیا لڈ (۱۹۰۵ء تا ۱۹۱۱ء) کے اعمال و افکار کی سرگزشت ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ ہندو مسلم کیونکر متحاب تو ہیں ہو گئیں اور انگریزوں نے کس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کو دست و گریبان کر کے دم لیا اور یہی ان کی سیاست کا مقصود تھا۔ اگر ہندو اور مسلمان متحد رہتے تو انگریزی حکومت کے لیے سکون نہ تھا۔ ”تفریق و الو اور حکمرانی کرو“ ان کا اصولِ حکومت تھا اور وہ اس کی آبیاری ہی سے ہندوستان میں اپنی حکومت کو طول دے کر مستحکم کر سکتے تھے۔ جب ان کے پاؤں اچھی طرح جم گئے تو مسلمانوں کو جہاد کی طرف سے پٹا دینے کے لیے انگلستان سے پادریوں کی ایک کھیپ درآمد کی گئی۔ انہوں نے یہاں اگر قرآن و اسلام پر کیک حملوں کا آغاز کیا۔ حضور سرور کائنات کی ذات پر کھینچ ڈھچکا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ علماء جواب تک جہاد کے محاذ پر تھے، اُس سے ہٹ کر مناظرے کے میدان میں آگئے اور صورتحال کھرب تبدیل ہو گئی۔ اب مسلمانوں کے لیے یہ مسئلہ تھا کہ وہ اپنے ذہن کی سچائی کیونکر قائم رکھ سکتے ہیں۔ اس سے بڑی خطرناک بات کیا ہو سکتی ہے جیسا کہ اوپر لکھا کہ سرولیم میور نے یوپی کا گورنر ہو کر حضور سرور کائنات کی ذات مبارک کے خلاف دریدہ دہنی کی۔ اور حیاتِ محمدؐ لکھ کر زہر اگلا۔ سرستید احمد جو انگریزی حکومت کے تعاون میں پیش منظر آئے انہوں نے بھی اس کتاب کے زہر کو محسوس کیا اور خطباتِ احمدیہ کے نام سے جواب لکھا، لیکن انگریز اپنی چال میں کامیاب رہا کہ عامۃ المسلمین کے لیے اصل مسئلہ اب اسلام کا دفاع اور سیرتِ انسؐ کی تجدید نہ ہو گیا۔ ایک دوسرے مسئلہ انگریزوں کے سامنے یہ تھا کہ مسلمانوں کی ملی وحدت پارہ پارہ ہو۔ ایک شکل یہ نکالی کہ بعض نئے فرقوں کو جنم دیا انہیں پروان چڑھایا یا انکا اتحاد بنایا۔ ہم ان فرقوں کا نام لیکر اپنے اس معصوم کو کج کرنا نہیں چاہتے، لیکن ان فرقوں نے اپنے آپ کو تمام علماء کے خلاف پیدہ کر دیا، جو انگریزی حکومت کا شکار ہونے سے انکار کر چکے اور برطانوی اقتدار کے خلاف تھے ان نوزائیدہ فرقوں نے نہ صرف مسلمانوں کی وحدت توڑ ڈالی بلکہ کفر کا ایک نیا دفتر کھولا۔ وہ تمام لوگ کافر قرار پائے جو استقلال و عزیمت میں ڈھلے ہوئے آزادی کی جدوجہد میں شریک تھے۔ ان نوساختہ فرقوں کے پیشواؤں نے انگریزی حکومت کی رضا جوئی لازمہ دین سمجھا اور ہمیشہ اس کی خوشنودی کو ملحوظ رکھا جن علماء نے اختلاف کیا، ان پر سب و شتم کیا۔ بسا اوقات کفر کے فتویٰ جاری کیے۔ مشائخ کے

خافقہ ہی سلسلوں کو اس طرح منظم کیا کہ وہ اعتکاف کے ہو گئے۔ ان کے لیے جہاد ساقط ہو گیا۔ وہ اس تصور ہی سے خالی الذہن ہو گئے کہ پرانی حکومت پر نکتہ چینی ہو سکتی ہے یا سیاست میں حصہ لیا جاسکتا ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں پنجاب کے اکثر مشائخ نے برطانوی فوج کے لیے مریدوں کو بھرتی کر دیا اور انہیں اس مطلب کے لیے تعویذ دیے کہ ترک فوج کی گولی ان پر اثر نہیں کرے گی۔ پھر جب انگریزوں کو فتح حاصل ہوئی، تو ان مشائخ نے سمراتیکل ادوار گورنر پنجاب کو سپانامہ پیش کیا۔ یہ اس شخص کو خراج تھا، جس نے جنیالوالہ باغ میں عوام کو جنرل ڈائر کی بے روک گولیوں سے بھنوا یا تھا۔ الغرض انگریز مسلمانوں کی تہی و حدیث کی توڑنے میں کامیاب رہا اور ایک ایسی فضا پیدا کی جس سے نامسلمانوں کے مسلمان ہونے کا سلسلہ ٹھنڈا ہو گیا۔ لیکن مسلمانوں نے مسلمانوں کو کافر بنانا شروع کیا۔ اس خوفناک دراڑ کے باوجود، انگریز اپنی سیاسی ضرورتوں کے تابع مسلمانوں سے مطمئن نہ تھا۔ چونکہ اس کے ذہن میں خلافت عثمانیہ کی بندر بانٹ کا منصوبہ تھا، اسلئے وہ محسوس کرتا تھا کہ برطانوی عملداری کے خلاف جہاد کی روح مسلمانوں میں انگڑائی لے کر ہر لحظہ جاگ سکتی ہے۔

میرزا غلام احمد — ایک استعماری ضرورت

اُن تمام تحریکوں کے باوجود جو ہندوستانی مسلمانوں میں برطانوی وفاداری کی فصل اُگا چکیں اور پھل دے رہی تھیں۔ انگریز جہاد کی رُوح سے بدستور ہر اساتھ۔ اُس کے لیے ۱۸۵۰ء کے بعد بنگال میں کوئی خطرہ نہ رہا تھا۔ اُس نے ہندو اکثریت کے تمام صوبے اپنی مٹھی میں اس طرح کیے تھے کہ ان میں جہاد خارج از بحث ہو چکا تھا۔ صوبہ جات متحدہ میں مسلمان ایک ثقافتی طاقت رہ گئے تھے۔ اور دہلی کا مسلمان ایک تہذیبی طاقت ہو چکا تھا۔ سندھ اور بلوچستان کے مسلمان اپنے اپنے سرداروں کی ملکیت تھے۔ ان سرداروں پر انگریزوں نے کچھ اس طرح قبضہ پایا تھا کہ ان سے جہاد کا پیدا ہونا ناممکن ہو چکا تھا، لیکن انگریز کے استعماری منصوبوں کی نگاہیں ہندوستان سے ملحق مسلمان ریاستوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔

جنگ اہلبیلہ ۱۸۵۳ء کے فوراً بعد انگریزوں نے جہاد کی پاداش میں پانچ مقدمہ ہائے سازش قائم کیے۔ پہلا مقدمہ سازش انبالہ ۱۸۶۳ء میں اس میں گیارہ ملزم تھے۔ دوسرا مقدمہ سازش پٹنہ ۱۸۶۵ء میں۔ تیسرا مقدمہ سازش راجہ محل ۱۸۶۸ء میں، چوتھا مقدمہ سازش الودہ ۱۸۷۰ء میں اور پانچواں مقدمہ سازش ۱۸۷۱ء پٹنہ ہی میں۔ اس کے سات ملزم تھے۔ ان مشہور مقدمات کے علاوہ اور کئی مقدمے قائم کیے گئے۔ ان کے ماخوذین کی استقامت نے انگریزی حکومت کو سخت پریشان کیا۔ کئی ایک ملزم جنہیں موت کی سزا دی گئی، اُن کی

منہ اس بنا پر عقیدہ میں بدلی گئی کہ وہ موت کو پیار کرتے تھے اور شہادت کی لگن میں ان کا ذہن بڑھ گیا تھا! انگریز محسوس کرتا تھا کہ جہاد کا شعلہ کسی وقت بجھ چکا تھا ہے۔ گو انگریزوں نے پنجاب کے بل پر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو ختم کیا اور تجربہ سے معلوم ہو چکا تھا کہ اس صوبہ کا سپاہی اس کے لیے بہت بڑی متاع ہے۔ لیکن برطانوی استعمار کے آئندہ ارادے مسلمان رعایا کو جس سانچہ میں ڈھالنا چاہتے تھے، ان کا خاکہ عجیب و غریب تھا۔ خلافت عثمانیہ، برطانیہ اور اس کے نصرانی اتحادیوں کی نگاہ میں تھی اور وہ اس کی بندر بانٹ کا منصوبہ تیار کر چکے تھے۔ ان کے پیش نظر ترکوں اور عربوں کو ایک دوسرے سے بھڑانا ہی نہیں تھا بلکہ عربوں کو مختلف ریاستوں میں بانٹ دینے کا منصوبہ ان کے ذہن میں تھا۔ اس منصوبہ کے لیے پنجابی سپاہی منتخب کیا گیا۔ پنجاب کی سرحدوں سے ملحق سرحدی صوبوں میں روج جہاد کا دلولہ باقی تھا۔ اس سے آگے افغانستان اور ایران واقع تھے۔ ان سے پیوست اسلامی ریاستوں کا سلسلہ تھا۔ ان مملکتوں کے شانہ پر روس تھا اور اس کو برطانوی عملداری اپنے لیے خطرہ محسوس کرتی تھی۔ انگریزوں نے پنجاب پر قبضہ کرنے ہی قبائلی علاقے کو مطیع و منقاد بنانے کے لیے بہت کوشش کی۔ پہل منڈھے نہ چڑھی تو لارڈ کرزن نے اس پالیسی کو بدل ڈالا۔ قبائلی خواتین کے دلیطفے مقرر کیے، افغان ملیشیا کی نیواٹھائی اور ۱۹۰۱ء میں سرحد کے موجودہ اضلاع کو پنجاب سے الگ کر کے علیحدہ صوبہ بنادیا۔ لارڈ کرزن نے ”مسلمانان ہند“ میں لکھا ہے کہ ”وہ ان علاقوں میں مذہب کے دیوانوں کو سر نہیں کر سکتے اور نہ انہیں گھروں میں واپس لاسکتے ہیں۔ ان میں جہاد کا شعلہ سر نہ نہیں ہوا۔ ان پر مذہبی دیوانوں اور جہادی ملاؤں کا اثر نہایت قوی ہے اور وہ کسی لحظہ بھی ان کے جذبات کا آتشکدہ بھڑکا سکتے ہیں“

انگلستان کی حکومت نے ہندوستان سے برطانوی عمال کی ان یادداشتوں کا جائزہ لینے اور صورتحال کا بلا واسطہ مطالعہ کرنے کے لیے ۱۸۶۹ء کے شروع میں برٹش پارلیمنٹ کے ممبروں بعض انگلستانی اخبار کے ایڈیٹروں اور چرچ آف انگلینڈ کے نمائندوں پر مشتمل ایک وفد ہندوستان بھیجا۔ وفد کا مقصد یہ تھا کہ وہ پتہ چلائے کہ ہندوستانی عوام میں وفاداری کیونکر پیدا کی جاسکتی ہے اور مسلمانوں کے جذبہ جہاد کو سلب کر کے انہیں کس طرح رام کیا جاسکتا ہے۔ اس وفد نے واپس جاکر دو رپورٹیں مرتب کیں جن ارکان نے مسطنت کی آمد کے عنوان سے رپورٹ لکھی، انہوں نے لکھا کہ :

THE ARRIVAL OF BRITISH EMPIRE IN INDIA

”ہندوستان میں برطانوی

” ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت اپنے دُرحافی رہنماؤں کی آندھا دھند

میں دھکا رہے۔ اگر اس دقت ہمیں کوئی ایسا آدمی مل جائے جو

ایسا سناٹا پُرانت (حواری بنی) ہونیکا دعویٰ کرے، تو اس شخص کی

نبوت کو حکومت کی سرپرستی میں پردان چڑھا کر برطانوی مفادات

کیلئے مفید عام لیا جاسکتا ہے۔“ (تخصیصات)

میرزا غلام احمد ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ (پنجاب) کی کچہری میں ایک معمولی تنخواہ پر (۱۸۶۴ء تا ۱۸۶۸ء)

ملازم تھے۔ آپ نے ملازمت کے دوران سیالکوٹ کے پادری مسٹر بلر ایم۔ اے سے رابطہ پیدا کیا۔ وہ آپ

کے پاس عموماً آتا اور دونوں اندر خانہ بات چیت کرتے۔ بلر نے وطن ہانے سے پہلے آپ سے غلبہ میں کئی

ایک طویل ملاقاتیں کیں۔ پھر اپنے ہم وطن ڈپٹی کمشنر کے ہاں گیا، اس سے کچھ کہا اور انگلستان چلا گیا۔ ادھر میرزا

صاحب استعفیٰ دیکر قادیان آگئے۔ اس کے تھوڑا عرصہ بعد، مذکورہ وفد ہندوستان پہنچا اور لوٹ کر محولہ پوٹیس

مرتب کیں۔ ان رپورٹوں کے فوراً بعد ہی مرزا صاحب نے اپنا سلسلہ شروع کر دیا۔

برطانوی ہند کے سنٹرل انٹیلی جنس کی روایت کے مطابق ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ نے چار اشخاص

کو انٹرویو کے لیے طلب کیا۔ ان میں سے میرزا صاحب نبوت کے لیے نامزد کیے گئے۔

میرزا صاحب کی پہلی تصنیف براہین احمدیہ (صفحات ۵۶۲) چار حصوں میں شائع ہوئی۔ ۱۸۸۰ء میں

پہلے دو حصے میں شائع ہوئے۔ ۱۸۸۲ء میں تیسرا اور ۱۸۸۴ء میں چوتھا۔ آپ کے دوسرے بیٹے میرزا

بشیر احمد ایم۔ اے کی تالیف سلسلہ احمدیہ کے مطابق آپ کو ماموریت کا تاریخی الہام، پارچ ۱۸۸۲ء میں ہوا۔

اس سے پہلے آپ نے ۱۸۸۰ء میں ہم من اللہ ہونے کا اعلان کیا اور اپنے مجدد ہونے کا ناد پھونکا۔ دسمبر

۱۸۸۸ء میں اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بیعت لینے کا حکم فرمایا ہے۔ ۱۸۹۱ء میں اپنے مسیح موعود ہونے

کی خبر دی اور ظلی نبی ہونے کی اصطلاح ایجاد فرمائی۔ پھر ۱۸۹۱ء میں نبوت کا دعویٰ کیا اور نومبر ۱۹۰۴ء

میں کرشن ہونے کا اعلان فرمایا۔ یہی وہ سال تھے جب انگریزی سیاست اپنے استعماری عزائم کو پردان

چڑھانے کے لیے پنجاب اور سرحد کے مسلمانوں کا شکار کر رہی تھی۔ اور اس کے سامنے بیرون ہندوستان

کی مسلمان ریاستوں کو اپنے دام میں لانے کا منصوبہ بھی تھا۔ میرزا غلام احمد ان چاروں نکات کے

جامع ہو کر سامنے آئے، جو انگریزوں کے ذہن میں تھے۔ انہوں نے انگریزی سلطنت کے استحکام و طاعت

کی بنیاد ہی اپنے الہام پر رکھی۔ اور ایک نبی کا روپ دھار کر انگریزی سلطنت کی وفاداری سے انحراف کو جہنم کی سزا کا مستحق قرار دیا۔ اپنی ربانی سند کے مفروضہ پر جہاد کو منسوخ کر ڈالا۔ اور ان لوگوں کو حرامی قرار دیا جو اس کے بعد جہاد کا نام لیتے یا اس کی تلقین کرتے تھے۔

ہندوؤں میں آریہ سماج ایک پروگریسو فرقہ اٹھ رہا تھا، سوامی دیانند اس کے بانی تھے۔ میرزا صاحب نے اس فرقہ کو ہدف بنا کر ہندو دھرم پر ایک حملے کیے نتیجہ آریہ سماج نے رسول اکرم اور مسلمان و اسلام کے خلاف دریدہ دہنی کا آغاز کیا۔ اسی طرح میرزا صاحب نے عیسائی مشنریوں کے خلاف یدھ رچایا، حضرت یحییٰ سے متعلق نازیبا زبان استعمال کر کے محمد عربی (ندو اُمی دانی) کے خلاف مشنریوں کی زبان کھلوائی؛ میوہ پنجاب کے مسلمان جہاد سے روگردان ہو کر ہندو دھرم اور عیسائی مذہب سے نبوہ آزما ہو گئے۔ محاذ کارِ خلیفہ گیا۔ مرزا صاحب کے دعویٰ نبوت سے خود مسلمانوں میں ایک ایسا محاذ کھل گیا کہ علماء کے لیے ختم نبوت کا مسئلہ، حفظِ ایمان کے لیے ضروری ہو گیا۔ میرزا صاحب نے مسلمانوں کے حصارِ وحدت کو منہدم کرنے کے لیے ایک ایسی کڈال اٹھائی کہ وہ انگریزوں کے خنجر کو بھول کر اس کڈال کے پیچھے پڑ گئے۔ گو مسلمانوں کے ہر دائرہ میں انگریزوں کی ہر خواہش پورا کرنے کے لیے مختلف افراد پیدا ہو چکے تھے، لیکن مرزا صاحب اس رعایت سے ان سب کے جامع تھے کہ جہاں انگریز اپنا قلعہ مضبوط رکھنا چاہتا تھا، وہاں مرزا صاحب نے "حواری نبی" ہونے کا دعویٰ کر کے اس ضرورت کا سفر شروع کیا۔ اُدھر علماء کے محاسبہ سے مرزا صاحب کی شہرت کا آغاز ہو گیا۔ اور یہی وہ چاہ رہے تھے؛ درنہ مرزا صاحب خود حقیقتہً الوحی کے صفحہ ۲۱۱ پر تسلیم کرتے ہیں کہ :

"ہماری معاش کا دار و مدار والد کی ایک مختصر آمدنی پر تھا۔ اور بیرونی لوگوں میں ہمیں ایک شخص بھی نہیں جانتا تھا۔ میں ایک گناہم انسان تھا، جو قادیان جیلے ویران گاؤں کے زاویہ گناہی میں پڑا ہوا تھا"

مرزا صاحب نے عیسائیوں اور آریوں سے منافرت کی آڑ میں مسلمانوں سے چندہ مانگنا شروع کیا، تو تین لاکھ سے زائد روپیہ جمع ہو گیا۔ (حقیقتہً الوحی) اپنے الہامات کو مدار بنا کر انگریزی حکومت کی تائید و حمایت میں اس قدر کتابیں لکھیں کہ تریاقِ التسلوب، مصنفہ میرزا غلام احمد، صفحہ ۵۱ کے مطابق وہ تمام کتابیں اکٹھی کی جاتیں تو ان سے ۵۱ لاکھ بھر سکتی ہیں۔ انگریز اسلامی ملکوں میں اپنے آئندہ منصوبوں

کے لیے نقب لگا رہا تھا۔ مرزا صاحب کی طاعت و حمایت کے مذکورہ پلندے اس منصوبہ کا راسخ تھا۔ ان الہامی کتابوں کے عربی، فارسی اور انگریزی میں تراجم کرائے گئے۔ پھر ان کتابوں اور مرزا صاحب کے سینکڑوں اشتہاروں کو عرب، مصر، شام، کابل اور روم بھجوا دیا گیا۔ (ملاحظہ ہو تریاق انقلاب معضد میرزا صاحب) مرزا صاحب نے اس مہم کے سلسلہ میں بہت سے کتابچے، کئی ایک کتابیں اور بے شمار خطوط اور اشتہار شائع کیے۔ ان سب کا لب لباب یہ تھا کہ مسلمان سلطنت برطانیہ کے پتے خیر خواہ ہو جائیں۔ غنی مددی اور غنی مسیح کی بے اہل روایتوں کو ترک کر دیں اور جہاد کا جوش دلانے والے مسائل جو حقوق کے دلوں کو خراب کرتے ہیں، ان کے دلوں سے معدوم ہو جائیں۔ (تریاق العلوب ص ۱۵)

مرزا صاحب نے اپنی کتاب شہادت العتران میں اپنے ایک اشتہار (صفحہ ۳) کو نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں، ”میرزا صاحب جس کو میں بار بار ظاہر کرتا ہوں۔ یہی ہے کہ اسلام کے دو حصے ہیں۔ ایک یہ کہ خدا تعالیٰ کی اطاعت کرے۔ دوسرے اس سلطنت کی جس نے امن قائم کیا اور ظالموں کے ہاتھ سے اپنے سایہ میں پناہ دی ہے اور وہ سلطنت برطانیہ ہے۔“

ایک دوسری کتاب تبلیغ رسالت جلد ہفتم کے صفحہ ۱۰ پر فرماتے ہیں کہ میں اس وقت ساٹھ برس کا ہوں اس عمر تک اسی ایک اہم کام میں مشغول رہوں، کہ مسلمانوں کے دلوں کو حکومت انگلشیہ کی سچی محبت خیر خواہی اور ہمدردی کی طفر پھیر دوں اور کم فہموں کے دلوں سے جہاد کا غلط خیال دور کروں۔ میں دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں کے دلوں پر میری تحریریں کا بہت ہی اثر ہوا۔ اور لاکھوں انسانوں میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔“ تبلیغ رسالت جلد ہفتم کے صفحہ ۶۵ پر گورنمنٹ کے نام ایک عرضینہ ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ:

”میں نے بیسیوں کتابیں عربی، فارسی اور اردو میں اس غرض سے لکھی ہیں کہ اس گورنمنٹ منہ سے جہاد ہرگز درست نہیں، بلکہ پتھے دل سے اطاعت کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ میں نے یہ کتابیں بصرہ ذر کثیر چھاپ کر بلاد اسلامیہ میں پہنچائیں۔ ان کتابوں کا بہت سا اثر اس ملک پر بھی پڑا ہے۔“

اسی عرضینہ میں درج ہے کہ میرے مریدوں کی ایک جماعت تیار ہوئی ہے، جو اس گورنمنٹ کے دلی جانثار ہیں۔ ایک دوسری جگہ رقمطراز ہیں:

”میں نے اس معنون کی ۵۰ ہزار کے قریب کتابیں، رسائل اور اشتہارات چھپوا کر ملک اور دوسرے بلاد اسلام میں بھجوائے ہیں کہ انگریزی حکومت ہم مسلمانوں کی دشمن ہے۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کی پستی

اطاعت کرے اور دل سے اللہ کا شکر گزار ہو، دُعا گو رہے۔ میں نے یہ کتابیں اسلام کے دو مقدس شہروں مکہ اور مدینہ میں بھی بخوبی شائع کی ہیں۔ اس کے علاوہ روم کے پایۂ تخت قسطنطنیہ، بلادِ شام، مصر اور افغانستان کے متفرق شہروں میں جہاں تک ممکن تھا، ان کی اشاعت کی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں انسانوں نے جہاد کے وہ غلیظ خیالات چھوڑ دیے جو نافعہ ملاؤں کی تعلیم سے ان کے دلوں میں تھے۔ مجھے اس خدمت پر فخر ہے۔ برٹش انڈیا کے تمام مسلمانوں میں سے اس کی کوئی نظیر کوئی مسلمان نہیں دکھلا سکتا۔ (ستارہ قیصرہ ص ۳)

غرض میرزا صاحب خود ساختہ نبوت کے بل پر جہاد کی تبلیغ اور مانعیت کے لیے لگاتار الہام پر الہام شائع کرتے رہے اور وہ العلامات و نگاشات عربی، فارسی اور انگریزی میں ترجمہ ہو کر برطانوی عملداری کی معرفت ان تمام کالک میں تقسیم ہوئی رہیں جو اس وقت تک برطانوی اقتدار میں آچکے اور باقی اس کی استعماری نگاہ میں تھے۔ مینارۃ المسیح کی تعبیر کے لیے فراہمی چندہ کے اشتہار میں میرزا صاحب نے لکھا کہ (تبلیغی) اس منارہ کو کسی حصّۂ دیوار میں نصب کر لیا جائے گا کہ آسمان کے دروازوں کے کھلنے کا وقت آگیا۔ اب سے زمینی جہاد بند کیے گئے اور لڑائیوں کا خانہ ہو گیا۔ آج سے دین کے لیے لڑنا حرام کیا گیا۔ اب اس کے بعد جو دین کے لیے تلوار اٹھاتا ہے اور غازی کھلا کر قتل کرنا ہے، وہ خدا اور اس کے رسول کا نافرمان ہے۔

تبلیغ رسالت جلد ہفتم صفحہ ۱۱ پر لکھا ہے کہ :

”جیسے جیسے میرے مرید بڑھیں گے، دیے دیے مسئلہ جہاد کے متعقد کم ہوتے جائیں گے، کیونکہ

مجھے مسیح و مہدی مان لینا ہی مسئلہ جہاد کا انکار کرنا ہے“

میرزا صاحب نے ایک رسالہ نور الحق تصنیف کیا، اس میں لکھا کہ :

”اس حکومت کے پاس میرا کوئی ہمسرد نصرت و تائید میں میرا مثیل نہیں۔ میرا وجود انگریزی حکومت

کے لیے ایک قلعہ، ایک حصّہ اور تعویذ کی حیثیت رکھتا ہے“

میرزا صاحب نے طاعتِ برطانیہ اور حرمتِ جہاد کے سلسلہ میں بلاشبہ ایک ضخیم دفتر مرتب کیا تبلیغ رسالت

میں واضح طور پر اقرار کیا کہ :

”میرے پانچ اصول ہیں جن میں دو حرمتِ جہاد اور اطاعتِ برطانیہ ہیں“

میرزا صاحب کے فرزند میرزا محمود احمد نے مسیح جہاد کے موروثی سوال پر کہا :— ”بعض اہم سوال

کرتے ہیں، اس گورنمنٹ سے جہاد کرنا درست ہے یا نہیں؟ یہ گورنمنٹ ہماری مومن ہے۔ اس کا شکریہ ادا

کرن فرض اور واجب ہے محسن کی بدخواہی ایک بدکار اور حرامی کا کام ہے۔“

(الفضل جلد ۲۴ - ۱۲ دسمبر ۱۹۳۹ء)

میرزا غلام احمد نے ۲۳ فروری ۱۸۹۸ء کو لکھا تھا:

”ہم نے سرکار انگریزی کی راہ میں اپنا خون دینے سے کبھی گریز نہیں کیا“ (تبلیغ رسالت جلد ہفتم)
لیکن آپ کے فرزند میرزا محمود احمد (خلیفہ ثانی) نے فرمایا کہ:

”میں مع موعد فرماتے ہیں۔ میں ممدی ہوں۔ برطانوی حکومت میری تلوار ہے۔ تمہیں بغداد کی فتح سے کیوں

خوشی نہ ہو۔ عراق، عرب، شام ہم ہر جگہ اپنی تلوار کی چمک دیکھنا چاہتے ہیں“ (الفضل، دسمبر ۱۹۱۵ء)

میرزا غلام احمد نے برطانیہ کی اطاعت اور جہاد کی مخالفت میں مسلمان ملکوں میں اپنا لٹریچر بھجوا دیا، لیکن

میرزا محمود نے برطانوی مقاصد برآری کے لیے جنگ عظیم اول سے پہلے افریقہ میں مشن قائم کئے اور عرب ملکوں

میں سکاٹ لینڈ یارڈ کے ماتحت اپنے معتمدین بھجوائے۔ جو اس کے حسب ہدایت کام کرتے، چنانچہ اسلامی ملکوں

میں کام کرنے کے لیے برطانیہ کے حکمہ جاسوسی کی تجویز پر مرزائی امت کا دفتر لندن میں قائم کیا گیا، تاکہ براہ راست

کنٹرول ہو سکے۔ اس غرض سے خواجہ کمال الدین دسمبر ۱۹۱۲ء کو انگلستان روانہ ہو گئے۔ انہوں نے وہاں بات

چیت کے بعد خلیفہ اول حکیم نور الدین کو لکھا، تو حکیم صاحب نے چودھری فتح محمد ایم۔ اے کو پہلا احمدی مبلغ

مقرر کیا اور وہ ۲۸ جون ۱۹۱۳ء کو لندن روانہ ہو گیا۔ دوسرا مشن سکاٹ لینڈ یارڈ کے حسب ہدایت افریقہ

کے جزیرہ ماریشش میں قائم کیا گیا۔ اس کا انچارج صوفی غلام محمد بی اے کو بنایا گیا جو فروری ۱۹۱۵ء میں

روانہ ہو گیا اور پہلی جنگ عظیم کے دوران سکاٹ لینڈ یارڈ کے حسب ہدایت خدمات انجام دیتا رہا۔

پہلی جنگ عظیم ۱۸-۱۹۱۴ء میں عرب ریاستوں کے احوال و آثار اور اسرار و وقائع چوری کرنے کے لیے

مرزا محمود نے اپنے پیروؤں کی ایک کھیپ متیا کی۔ ہندوستانی فوج کی ہر کیمپ کے ساتھ جاسوسی کے فرائض انجام

دینے کے لیے ایک یا دو قادیانی منسلک کئے گئے کئی ایک معتمد ترکی بھیجے گئے۔ جنہوں نے مقامی ملازمت کے

پر دے میں سکاٹ لینڈ یارڈ کی حسب ہدایت کام کیا۔ دمشق میں مرزا محمود کا سالانہ ولی الشہزین العابدین ترکوں

۱۰۔ راقم اس سلسلہ میں ایک مفصل کتاب لکھنے کا ارادہ کر چکا ہے کہ مرزائیت نے ممالک اسلامیہ میں برطانوی سلطنت

کے لیے سرافرمانی کے فرائض کس طرح انجام دیے۔

کی پانچویں ڈویژن کے انچارج جمال پاشا کی معرفت قدس یونیورسٹی میں دینیات کا لیکچرار لگ گیا، لیکن جس روز انگریزی فوج دمشق میں داخل ہوئی، وہ انگریزی کمانڈر کے ماتحت ہو گیا۔ اور کئی ایک معتد ترکوں کے قتل کرانے میں حصہ لیا۔ اُس کا چھوٹا بھائی میر حبیب اللہ شاہ فوج میں ڈاکٹر تھا۔ اُس کو بغداد فتح ہونے پر عارضی گورنر مقرر کیا گیا جب ۱۹۲۳ء میں عراقی حکومت کو مرزائیوں کے خط و خال کا پتہ چلا، تو ان کی فہرہ ارادہ سرگرمیوں کے باعث ان سب کو وہاں سے نکال دیا۔ میرزا محمود نے جمعہ کے خطبہ (مطبوعہ الفضل ۳۱ اگست ۱۹۲۳ء) میں اعتراف کیا کہ:

”عراق فتح کرنے میں احمدیوں نے خون بہایا اور میری تحریک پر سینکڑوں لوگ بھرتی ہو کر گئے۔“

میرزا محمود نے مصطفیٰ کمال کو قتل کرنے کے لیے اپنے ایک معتد نوجوان مصطفیٰ اصغر کا انتخاب کیا۔ اس کو انگریزی حکومت نے میرزا معراج الدین سپرنٹنڈنٹ سی۔ آئی۔ ڈی کے ہمراہ ترکی روانہ کیا، لیکن وہ اقدام قتل سے پہلے پکڑا گیا اور پھانسی پا گیا۔ میر محمد سعید حید آبادی کہ کمرہ میں قادیانی کا مشن کا انچارج تھا اور وہاں برطانوی حکمہ جاسوسی کے ایک اہم عہدیدار کرنل ٹی۔ ڈبلیو لارنس کی ہدایت پر کام کرتا تھا۔ لیکن جب عربوں کو اس کا پتہ چلا تو وہ اپنے ساتھیوں سمیت فرار ہو گیا۔ شام میں جلال الدین شمس کو مقرر کیا گیا، لیکن جب اصل شام کو معلوم ہوا کہ برطانوی جاسوس ہے، تو ۲۴ دسمبر ۱۹۲۴ء کو اُس پر قاتلانہ حملہ کیا، لیکن وہ بچ گیا۔ اسے عراق میں برطانوی گرفت و حیل پڑنے پر ۱۴ مارچ ۱۹۲۵ء کو حیفہ آگیا۔ اس کے بعد برطانوی سرکار کی ہدایت پر فلسطین کو قادیانی کاندنوں کا ہیڈ کوارٹر بنایا گیا۔ وہاں برطانیہ کی جاسوسی کے حکمہ کا افسر اعلیٰ ایک یہودی تھا۔ قادیانی مشن کو اس کے ماتحت کیا گیا اور یہی احمدیت و یہودیت کے درمیان گٹھ جوڑ کا آغاز تھا۔ لائیڈ جارج وزیر اعظم انگلستان نے فلسطین میں قادیانی خدمات کا حکم کھلا اعتراف کیا۔ ۱۹۲۲ء میں میرزا محمود خود فلسطین گیا اور اعلان کیا کہ یہودی اس خطہ کے مالک ہو جائیں گے۔ میرزا محمود نے برطانوی ہائی کمشنر سے ملاقات کی اور آئندہ خدمات کا نقشہ تیار کیا۔ جلال الدین شمس کے ساتھ دیمودی نژاد محمد المغربی الطرابلسی اور عبدالقادر عودہ صالح منسلک کیے گئے۔

روس سے برطانیہ کو ہندوستان میں ابتداء ہی سے خطرہ تھا۔ یہ ذکر آچکا ہے کہ ایک چار رکنی وفد جس میں مولانا محمد حسین آزاد بھی شامل تھے، اس عرض سے وسط ایشیا بھجوا دیا تھا کہ وہاں کے حالات کا جائزہ لیا جائے لیکن پھر یہ کام قادیانیوں کو سونپا گیا، چنانچہ ۱۹۲۱ء میں ایک قادیانی محمد امین خاں ایران کے راستہ روس میں داخل ہوا اور روسی حکومت نے پکڑ کے جیل میں ڈال دیا۔ وہ برطانوی حکومت کی مداخلت سے رہا ہوا۔ واپس آیا، تو میرزا محمود سے ہدایات لے کر دوبارہ ایک دوسرے شخص ظہور حسین کے ہمراہ لوٹ گیا۔ ظہور حسین بھی

روس حکومت کے ہاتھ آگیا اور دو سال ماسکو کے جیل میں رہا۔ بالآخر برطانوی سفیر مقیم ماسکو کی کمک و دوسے رہا ہوا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ۱۹۱۹ء میں افغانستان اور انگریزوں میں جنگ چھڑی تو قادیانی ایک کمپنی کی شکل میں برطانوی خدمات انجام دینے میں لگ گئے۔ میرزا محمود کا چھوٹا بھائی، ڈرائیوٹ کور میں کام کرتا رہا۔ اُس کے پیرو قبائلی علاقے کے حالات کی فراہمی کا مشن تھا۔ ایک شخص نعمت اللہ قادیانی کو افغانستان میں جاسوسی کے لیے مقرر کیا گیا۔ لیکن جولائی ۱۹۲۲ء میں وہ گرفتار ہو گیا اور افغان گورنمنٹ نے سنگار کر ڈالا۔ پھر فروری ۱۹۲۵ء میں دو اور قادیانی ملاں عبدالحمید اور ملا نور علی اسی پاداش میں قتل کیے گئے۔ پہلا قادیانی جو افغانستان میں ہلاک کیا گیا، وہ صاحبزادہ عبداللطیف تھا، جو میرزا محمود کے بیان کے مطابق (الفضل ۷ اگست ۱۹۳۵ء) جہاد کی مخالفت کے جرم میں قتل کرایا گیا۔

پہلی جنگ عظیم کے نتائج سامنے آ گئے، تو افریقہ کے بعض حصوں میں قادیانی مشن قائم کیے گئے۔ کوئی ۹ سال پہلے چرچ آف انگلینڈ کے ایک نمائندہ نے افریقہ میں قادیانی مشن کی سرگرمیوں پر ۱۹۶۶ء میں ایک کتاب لکھی، جس میں اس فرتے کا تجزیہ کیا۔ اُس نے لکھا کہ میں نے انگلینڈ واپس آکر وزارت خارجہ سے تذکرہ کیا کہ جہاں تہاں برطانوی اقتدار رہا یا اب جن علاقوں میں مسلمان حکومت قائم ہے، وہاں قادیانی مشن عیسائیت کے خلاف شد و مد سے پروپیگنڈہ کرتے اور حضرت مسیح کی توہین کرتے ہیں۔ آخر انہیں برطانوی سرپرستی کیوں حاصل ہے؟ وزارت نے کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ کہا تو یہ کہ آپ ان کا چرچ کی سطح پر مقابلہ کیجئے۔ ہماری سیاسی ضرورتیں مختلف ہیں۔ پہلے ہندوستان فلام تھا، تو قادیانی مسلمان ملکوں میں ہندوستانی مسلمان کی حیثیت سے تبلیغی ڈھونگ رچاتے تھے۔ پاکستان بنا، تو دہوہ کی معرفت پھیلاؤ پیدا کیا۔ لیکن تمام مشن برطانیہ کے جاسوسی مشن تھے۔ تمام کارکن پختہ قادیانی ہوتے جو غیر قادیانی مسلمانوں کو عقیدۂ کافر سمجھتے۔ جب تک انگریز رہا۔ برطانیہ کے لیے جاسوسی کرتے رہے۔ پاکستان بنا، تو آزادی کے بعد استعماری گماشتہ ہو گئے۔

مرزا صاحب نے آریوں اور عیسائیوں کے خلاف عہد قائم کیا تو اس کا مقصد مسلمانوں اور ہندوؤں میں انگریزوں کی سیاست کے مطابق متغیر و تضاد پیدا کرنا تھا۔ میرزا صاحب گل کھلانے میں کامیاب ہو گئے۔ ہندو مسلم فساد کی نیورمکی، دوسرا عیسائیوں سے مناظرہ معض مناظرہ ہوتا تو گورا تھا لیکن مرزا صاحب نے حضرت مسیح کے خلاف دریدہ دہنی کا انبار لگایا۔ حضرت مریم کی اہانت کی۔ اس سے پادریوں کو رسول کریم کے خلاف یادہ گوئی کا حوصلہ ہوا اور کسراں دسیرت کے خلاف رکیک ہے رکیک زبان استعمال کی لیکن برطانوی

ڈپوٹیس نے مرزا صاحب کو اس یادہ گوئی کی اجازت اس لیے دی، جیسا کہ مرزا صاحب نے ملکہ وکٹوریہ کے نام خط میں لکھا کہ وہ مسلمانوں میں اپنا اعتبار قائم رکھنا چاہتے تھے اور عیسائیوں کو اس لیے رگیدتے رہے کہ مسلمان ان پر اعتماد کریں اور سیکھیں کہ حرمت جہاد کے پس پردہ انگریز نہیں ہیں۔ گویا عیسائیوں کو گالی دیجر وہ مسلمانوں میں اپنا اعتبار جہانتے۔ اور برطانیہ کے لیے جہاد منسوخ کرتے تھے چونکہ ان کے دعویٰ بتوت اور حرمت جہاد کا تعاقب علماء کی جانب سے مسلسل ہو رہا تھا اور مرزا صاحب میں ان سے مقابلہ کا حوصلہ نہ تھا اس لیے انہوں نے آریوں اور عیسائیوں سے مناظرے اور مجادلے کی نیور کھی اس طرح مسلمان عوام سے محفوظ ہو گئے اور ان کا احتساب علامہ تک محدود رہا؛ ورنہ ممکن تھا کہ مرزا صاحب مسلمان عوام کے ہاتھوں اپنے دعویٰ کے ساتھ شروع ہی میں دفن ہو جاتے۔ مرزا صاحب کی تصنیف تریاق القلوب کے صفحہ ۳۱۰ پر یہ عنوان ”محضور گورنٹ عالیہ میں ایک عاجزانہ درخواست“ کے صمیمہ نمبر ۳ میں درج ہے کہ :

”لہذا یہاں کے عیسائی اخبار ”نور انشال“ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت نعوذ باللہ نہایت گندے الفاظ استعمال کیے گئے۔ مجھے (عیسائی مشنریوں) کی ایسی کتابیں اور اخبار پڑھنے سے ناہیثہ ہوا کہ مبادا مسلمانوں کے دلوں میں کوئی اشتعال دینے والا سخت اثر پیدا ہو تب میں نے ان کے جوشوں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے صحیح اور پاک نیت سے یہی سمجھا کہ ان تحریروں کا سختی سے جواب دیا جائے تاکہ سترلع غضب انسانوں کے جوش فرو ہو جائیں اور ملک میں کوئی بے امنی پیدا نہ ہو۔“ (تلخیص)

گویا میرزا صاحب نے تسلیم کیا کہ وہ عیسائیوں کے خلاف جو کچھ لکھتے رہے ان کی بدزبانی سے مسلمانوں میں پیدا ہونے والے اشتعال کو ٹھنڈا کرنے کے لیے لکھتے اور حکومت اس لیے گوارا کرتی کہ مرزا صاحب حرمت جہاد کے مشن پر مامور تھے۔ حضرت پیر مہر علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف میرزا صاحب نے تحفہ گوڑو دیہ لکھا، تو اس میں بیان کیا کہ ”مرے مقابل کوئی پادری نہیں ٹھہر سکتا۔ میرا رعب عیسائی علماء پر خدا نے ایسا ڈال دیا ہے کہ ان میں طاقت ہی نہیں رہی کہ مرا مقابلہ کر سکیں۔ خدا نے مجھے روح افدس سے تابید بخشی ہے اور اپنا فرشتہ میرے ساتھ کیا ہے۔“ میرزا صاحب نے ۱۸۹۳ء میں ڈپٹی عبداللہ آتھم نامی ایک عیسائی سے مناظرہ کرنے کے لیے ڈاکٹر مارٹن کلارک مقیم امرتسر کو خط لکھا۔ اس میں شرط لگائی کہ مغلوب غالب کا مذہب اختیار کرے گا؛ ورنہ اپنی نصف جائیداد فریق غالب کے حوالے کر دے گا۔ اس خط و کتابت میں مرزا صاحب نے سب بازی کرنا چاہی۔ اور اس قسم کی اشتہار بازی کی کہ بہت سے مسلمان بھی عیسائیوں سے بعد و عناد کے باعث مرزا کے طرفدار ہو گئے۔

پادری کلارک نے ۳ مئی ۱۹۹۳ء کو اشتہار شائع کرایا کہ کوئی مشنڈخص اسلام کا نمائندہ نہیں ہو سکتا جب اس طرح بات نہ بنی تو ۲۲ مئی سے ۵ جون ۱۹۹۳ء تک پندرہ روز ڈاکٹر مارٹن کی کوشش میں مناظرہ ہوتا رہا۔ مرزا صاحب کو شکست ہوئی۔ اس مناظرہ کی روداد جنگ مقدس کے نام سے شائع کی گئی۔ اُس وقت کے بعض علماء نے اعلان و اعتراف کیا کہ مرزا صاحب نے اس مباحثہ میں اسلام کے دامن عزت پر بدنما و متبہ لگایا اور مسلمانوں کے جذبات کو عیسائی ہینچائی ہے۔ مرزا صاحب نے عبداللہ آتھم کے ہلاک ہونے کی پیش گوئی کی۔ پھر اُس پر امرتسر میں کئی دفعہ حملے کرائے۔ آتھم فیروز پور چلا گیا۔ وہاں چار حملے ہوئے۔ دو مرتبہ گولی چلائی گئی۔ ایک دفعہ کوبرا سانپ بند کر کے آتھم کے مکان میں ڈال دیا گیا، لیکن آتھم بچتا ہی رہا۔ مرزا صاحب نے ایک پیشگوئی میں اس کی موت کی آخری تاریخ ۶ ستمبر ۱۹۹۲ء مقرر کی، لیکن آتھم نے ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۲ء میں صحت یاب ہو گیا۔ ۶ ستمبر کو عیسائی آتھم کو فیروز پور سے امرتسر لائے۔ اُس کا شاندار جلوس نکالا۔ ملک کے ہر حصہ میں عیسائیوں نے جشن منایا، کئی ایک مرزائی بپتسمہ لے کر عیسائی ہو گئے۔ بعض پادریوں نے مرزا صاحب پر قاتلانہ سازشوں کی منصوبہ بندی کے الزام میں مقدمے دائر کیے، لیکن مرزا صاحب انگریز ڈپٹی کمشنروں کی عدالت سے چھوٹ جاتے رہے۔ کبھی معافی مانگ کر خلاصی پاتے، کبھی اپنی خدمات جلیلہ کے عوض جان بخشی کراتے بعض دفعہ انٹیلی جنس بیورو اشارہ کرتا تو مقدمہ ختم ہو جانا۔ ڈاکٹر مارٹن کلارک نے گورداسپور کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کپٹن ڈگلز کی عدالت میں استغاثہ دائر کیا کہ مرزا صاحب نے ان کے قتل پر ایک نوجوان کو مامور کیا ہے اور وہ نوجوان پولیس کے پاس اعتراف کر چکا ہے، لیکن حکومت نے پولیس کی معرفت اُس نوجوان کو بیان سے مخرب کر دیا۔ کپٹن ڈگلز نے اپنے ایک ہم وطن اور ہم عقیدہ کے استغاثہ کو مسترد کرتے ہوئے مرزا صاحب کو باعزت بری کر دیا۔

مرزا صاحب کا حال یہ تھا کہ ہندو دھرم اور عیسائی مذہب کو غلیظ سے غلیظ گالی دیتے — لیکن حکومت ٹس سے مس نہ ہوتی؛ البتہ مشنریوں نے جواب آں غزل میں سرور کائنات کے خلاف بدزبانی کا راستہ کھول دیا اور حضور پر سب و تمام روزمرہ ہو گیا۔

انگریز ہندوستان میں اپنی حکومت کا استحکام اسی میں پاتے تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں تصادم و اختلاف بڑھتا جائے اور دونوں قومیں اپنے ہی ملک میں ایک دوسرے کی حریف ہوں۔ مرزا صاحب نے یہی کیا۔ اُنہوں نے مذہب کی بنیاد پر ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں لا کھڑا کیا۔ آریہ سماج ہندو دھرم کی ایک پروگریسو تحریک تھی۔ اس کا مزاج اصلاحی تھا۔ لب لباب یہ تھا کہ ہندو عود و ساختہ خرافات چھوڑ کر دیوں

کی طرف لوٹ جاتیں۔ اس کے بانی سوامی دیانند سرسوتی گجرات کا ٹھیکہ دار کے باشندہ تھے۔ انہیں سنسکرت اور اڑی زبان کے سوا دوسری کوئی زبان نہ آتی تھی۔ وہ اُردو پنجابی، ہندی وغیرہ سے نا بلد تھے۔ ان کی تحریک کو اپنے گھر مہاراشٹر، گجرات اور کاٹھیاوار کے مقابلہ میں پنجاب کے ہندوؤں میں محدود رجہ کامیابی ہوئی۔ جن لوگوں نے اس صوبے میں قومی تحریک کا علم اٹھایا اور برطانوی استعمار کے خلاف نبرد آزما ہوئے۔ مثلاً لالہ لاجپت رائے ڈاکٹر گوپی چند بھارگو، ڈاکٹر ستیبہ پال وغیرہ سب آریہ سماجی تھے۔ ہندوؤں کے نامور روزنامے بھی آریہ سماج کے پیروؤں کی ملکیت تھے۔ انحصار پنجاب کا تعلیم یافتہ ہندو زیادہ تر آریہ سماج کا رکن تھا۔ میرزا صاحب نے سوامی دیانند کو اپنی اثر آفرینی کا ہدف بناتے ہوئے دیدوں سے متعلق لکھا کہ :

”اس قدر لغو بیانی تو مجاہدین اور مطلوب الحواس کے کلام میں بھی نہیں ہوتی، مزید لکھا کہ ہندوؤں کا ہمیشہ آپ ہی لوگوں کو بد فعلی اور پلیدی میں ڈالنا چاہتا ہے“

”مکذیب براہمن کے صفحہ ۲۶۳ پر تحریر کیا۔“ دہریوں کے بعد تمام دنیا میں آریوں سے بدتر اور کوئی

مذہب نہیں۔“

سوامی دیانند، میرزا صاحب کی دعوت مباہدہ پر گورداسپورہ گئے اور بہت دن تک ٹھہرے، لیکن میرزا صاحب نے مقابلہ میں نہ آئے۔ پھر سوامی صاحب امرتسر آ گئے۔ میرزا صاحب کو ان کے دعوتی خطوط کا جواب لکھا کہ خدا کے واسطے آئیے اور گفتگو فرمائیے، لیکن مرزا صاحب کو سامنے آنے کی جرأت ہی نہ ہوئی۔ سوامی دیانند ۳۰ اکتوبر ۱۸۹۳ء کو انتقال کر گئے، تو مرزا صاحب نے براہمن احمدیہ میں ان کی تاریخ وفات فردمباہات سے پیشگوئی کے طور پر درج کی جس سے آریہ سماج کے رہنما چڑ گئے اور انہیں میرزا صاحب کی تعلیموں پر غصہ آ گیا۔

سوامی صاحب کی واحد تصنیف ستیا رتھ پر کاشش پہلی دفعہ ۱۸۹۵ء میں براہمن احمدیہ سے پانچ چھ سال پہلے چھپی۔ اس کے ناشر راجہ جے کشن داس بہادر سی۔ ایس۔ آئی (بنارس) تھے۔ تب اُس میں صرف بارہ باب تھے، لیکن نیز حواں اور چودھواں باب نہ تھا۔ جب مرزا صاحب نے آریہ سماج کے خلاف گندی زبان استعمال کی اور سوامی دیانند کی موت کو اپنی پیش گوئی کا حاصل قرار دیا تو ستیا رتھ پر کاشش میں تیر حواں اور چودھویں باب کا اضافہ کیا گیا۔ ان کا مصنف کوئی اور تھا۔ اس نے قرآن و اسلام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق دشنام و انتہام اور خرافات و مہضوات کا انتہائی دل آزار مواد تحریر کیا۔ ممکن تھا آریہ سماجی یادہ گوئی سے احتراز کرتے، لیکن مرزا صاحب اس سارے کیے دھرے کے منہول تھے انہوں

نے آریوں کو اس طرز کلام کا چمکڑا لالہ اور وہ گالی دینے میں کھل گئے۔ جب مرزا صاحب کو خود ملانے لگا تو اُس نے ازلہ اوہام میں لکھا کہ :

”سارا قسطنطنیہ شریف گایوں سے پڑے۔ قرآن پاک میں کفار کو شراہیہ قرار دینا اور تمام رذیل و پلید مخلوقات سے انہیں بدتر ظاہر کرنا دشنام دہی میں داخل نہیں؟“

یہ ایک خیل اقباس کی تحفیں ہے۔ مزید لکھا ہے کہ قسطنطنیہ شریف جس آواز بلند سے سخت زبانی کے طریقے کو استعمال کر رہا ہے۔ ایک غایت درجہ کا غبی اور سخت درجہ کا نادان بھی اُس سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ مثلاً زمانہ حال کے نزدیک کسی پر لعنت بھیجنا ایک سخت گالی ہے لیکن قرآن شریف کفار کو ناسنا کر ان پر لعنت بھیجتا ہے۔

سوامی دیانند سرسوتی کی موت کو جب میرزا صاحب نے اپنے الہام کا نتیجہ قرار دیا۔ تو اُن کے ایک پیرو پندت لیکھرام نے میرزا صاحب کے مصرع طرح پر گہر لگائی اور ان کے الہامات کو چیلنج کیا۔ میرزا صاحب حسب معمول ایچ بیچ پر آگئے اور اول فول بکنا شروع کیا۔ لیکن لیکھرام سخت جان واقع ہوا۔ میرزا صاحب تبلیغ میں تار بازی کے عادی تھے۔ اُنہوں نے اعلان کیا کہ ”کوئی غیر مذہب والا اُن کے پاس ایک سال رہ کر کوئی آسانی نشان نہ دیکھے اور تنہی پاکر مسلمان نہ ہو تو اس کو دوسروں پر یہ ناجوار کے حساب سے ہرجانہ یا جرمانہ دیں گے“ لیکھرام نے اعلان کیا کہ مرزا صاحب سال کا یکشت سرکاری خزانہ میں جمع کرا دیں تو وہ سال بھر اُن کے پاس رہنے کو تیار رہے۔ میرزا صاحب نے گریز کیا اور کہا کہ یہ اُن کے لیے ہے جو اپنی قوم میں معزز علماء اور مشورہ مقتدا ہیں۔ آپ اس حیثیت اور مرتبہ کے آدمی نہیں ہیں۔ غرض یہ ایک طویل کشمکش رہی۔ لیکن میرزا صاحب نے پندت لیکھرام کو قادیان آنے کی دعوت دی، لیکھرام پہنچ گیا۔ اس زمانہ میں مراد آباد کے ایک اور سماجی منشی اندر من نے میرزا صاحب کو یکالہ قیام کی پیشکش کی۔ لیکن مرزا صاحب اُس سے بھی فرار کر گئے۔ قادیان کے سربراہ اور وہ ہندوؤں نے تعاقب کیا تو میرزا صاحب نے ان سے بھی کئی کترا گئے۔ اگر کوئی نتیجہ مرتب ہو رہا تھا تو وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں تغیر کے مستقل ذہن متھل ہونا تھا۔ یہی مرزا صاحب کا مقصد تھا اور وہ اس میں کامیاب ہو رہے تھے۔ لالہ مرلی دھر نے ہوشیار پور میں مرزا صاحب کے مکان پر جا کر مناظرہ کیا۔ اس کا دوسرا جلسہ ۱۴ مارچ ۱۸۸۶ء کو شیخ مہر علی رئیس اعظم ہوشیار پوری کے مکان پر ہوا۔ لیکن مرزا صاحب کے مناظرے تحریری ہوتے اور حاصل کچھ نہ ہوتا میرزا صاحب نے اس مناظرہ کی روداد سرمرچشم آریہ کے نام سے شائع کی۔ لیکھرام نے اس کے جواب میں ”نسخہ خط احمدیہ“ لکھا۔ میرزا صاحب کے ان مناظروں سے اسلام کے خلاف یہودہ گوئی کا دروازہ کھل گیا۔

لیکھرام نے میرزا صاحب کو زچ کیا تو میرزا صاحب نے ۱۸۹۳ء میں پیشگوئی کی کہ لیکھرام قتل کیا جائے گا۔
 چنانچہ ۶ مارچ ۱۸۹۶ء کو لیکھرام لاہور میں قتل ہو گیا۔ اس سے ہندو مسلم کشیدگی پیدا ہو گئی۔ مرزا صاحب کے
 خلاف ہندوؤں میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ میرزا صاحب نے قیسن کھا کھا کر برأت کا اعلان کیا کہ اس میں اس کا
 ہتھ نہیں، لیکن میرزا صاحب کی نبوت نے پنجاب میں ہندو مسلم فساد کی نیواٹھادی۔ اس سے پہلے ہندوؤں
 اور مسلمانوں میں آمنے سامنے کے اجتماعی فساد کبھی نہ ہوتے تھے۔ میرزا صاحب ان فسادات کے داعی و بانی ہوئے۔
 ہندو مسلمانوں سے اور مسلمان ہندوؤں سے اس طرح کچھ گئے کہ ان میں وطنی اتحاد خواب و خیال ہو گیا کبھی
 اتحاد ہوا تو عارضی۔ اس کا سفینہ جلد ڈوب گیا۔ فی الجملہ مرزا صاحب ہندوؤں اور مسلمانوں کو لڑانے میں کامیاب
 ہو گئے اور اس لڑائی کا شعار ہمیشہ کے لیے مستقل ہو گیا۔ مرزا صاحب نے دوسرا کارنامہ یہ انجام دیا کہ آریوں
 میں حضور کے خلاف دریدہ دہنی کا حوصلہ پیدا کیا۔

مرزا صاحب نے استعمار پرستی کی ترنگ میں سب سے شرمناک کام یہ کیا کہ مسلمانوں کی بے حدت میں ناقابل
 عبور خلیج پیدا کی۔ اُس وقت جن علماء حق سے مسلمانوں کی دینی غیرت کا چرچا تھا۔ میرزا صاحب نے لکھار لکھار
 کے انہیں بے نقط گالیاں دیں۔ اُن کے نادک سے کوئی دینی وجود محفوظ نہ رہا۔ ایک صاحب منشی الہی بخش نے
 میرزا صاحب کی تحریروں سے ان گالیوں کو ردیف وار جمع کیا۔ میرزا صاحب کی محبوب گالیاں، تو بہت
 سی تھیں، لیکن بڑی گالی یہ تھی کہ جو انہیں منہیں مانتا وہ زاینہ عورتوں کی اولاد ہے (ایسے کمالات صفحہ ۵۴)
 پھر اس کے ہم معنی الفاظ کا اعادہ کرتے رہے۔ دوسری گالی جس سے میرزا صاحب کا لفظ لذت پاتا، وہ حرلڑاؤ
 کا لفظ تھا۔ میرزا صاحب نے عیسائیوں اور آریوں کو تسلسل سے حرامزادہ کہا اسی طرح مسلمان علماء کو اپنی بعض کتابوں
 اور کئی ایک اشتہاروں میں اسی لفظ سے مخاطب کیا۔ اس کے مترادف تجنے عریاں الفاظ تھے اکثر وہ بیشتر
 کہتے رہے؛ حتیٰ کہ بعض پمفلٹ صرف گالی تھے۔

میرزا صاحب نبی ہوتے تو نبی کی زبان استعمال کرتے۔ چونکہ میتھی تھے اور انگریزی حکومت نے انہیں
 ایک مشن سونپ رکھا تھا، اس لیے حکومت میرزا صاحب کی اس زبان کا حوصلہ بڑھاتی۔ نتیجتاً عیسائیوں
 اور آریوں کو پروپیگنڈہ کرنے کا موقع ملتا کہ اسلام میں پیغمبر کی زبان یہ رہی ہے۔ اور جو شخص خود کو محمد عربی کا
 نقل و بروز کہتا ہے، اُس کی اپنی زبان اتنی غلیظ ہے، تو جس کا بروز نقل ہے اُس کی زبان (خاکم بدھن)
 کیا ہوگی؟ یہ گویا میرزا صاحب کی بدولت سیرت رسولؐ پر حملہ آوری کا ایک حربہ تھا۔ دوسرا کارنامہ یہ تھا کہ

میرزا صاحب نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تنافر کو اٹھا کر بچتہ کیا، جو انگریزی عملداری کے لیے ضروری تھا۔
 میرزا صاحب برطانیہ کی استعماری خواہشوں کا منظر تھے۔ انہوں نے پنجاب کی حد تک انگریزی حکومت
 کی بے نظیر خدمت کی کہ پورا مٹوبہ کئی واسطوں سے وفاداری بشرط استواری کا مرقع ہو گیا اور یہی میرزا صاحب
 کا سب سے بڑا کارنامہ تھا۔



دینی احتساب کے عالمانہ معرکے

میرزا غلام احمد اس حد تک ضرور کامیاب ہو گئے کہ انہوں نے پنجابی مسلمانوں کا رخ جہاد پلٹ دیا۔ انگریز جہاد ہی سے پریشان تھے۔ میرزا صاحب نے پہلے اپنے لیے ایک فضا پیدا کی۔ پھر نبوت کا دعویٰ کیا، آخر میں جہاد منسوخ کیا اور برطانوی حکومت کی طاعت فرض کر دی؛ حتیٰ کہ ان لوگوں کی مخبری کی اور گالیاں بھیجیں جو برطانیہ سے ظاہر و باطن یا علی و خفی ناخوش تھے۔ میرزا صاحب نے جیسا کہ ان کی بعض کتابوں سے ظاہر ہے، انگریزی حکام کو ان تمام مسلمانوں کی ایک فہرست متیا کی، جو اندر خانہ برطانوی حکومت کے خلاف تھے اور میرزا صاحب انہیں اپنے راستہ کی دیوار سمجھتے تھے، اس روک کو دور کرنے کے لیے میرزا صاحب نے برطانوی حکومت سے ان کی مخالفت کا فائدہ تصنیف کیا اور تحریری طور پر انگریز حکام کو مطلع کیا۔ میرزا صاحب کا دعویٰ نبوت بلاشبہ اسلام کے خلاف ایک استعماری حربہ تھا۔ ان کے دعویٰ سے نہ صرف ختم نبوت کا تصور مجروح ہوتا بلکہ طبع اللہ کی اساس حکم میں دراڑ پیدا ہوتی۔ ہر ملت اپنے نبی کی بدولت وجود میں آئی اور امت کملاتی ہے۔ میرزا صاحب نے اسلام کو اپنی ذات سے مشروط کرنا چاہا، تو علماء اس خجہ زنی سے چونک گئے۔ ان کے سامنے برطانوی عملداری کا سوال نہ رہا کہ مسلمان اس کے ہاتھوں کچلے گئے اور ان کا الٰہی وجود اقدار سے محروم ہو چکا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ جس ذات سے ان کا وجود ہے اُس کی طاقت نفیتم کی جا رہی ہے اور استعماری مقاصد کے لیے ایک دوسرا نبی تصنیف

کیا گیا ہے۔ ملک بھر کے علماء نے میرزا صاحب کا تعاقب شروع کیا۔ اس سے میدان جہاد، جو انگریزوں کے لیے سوبانِ روح تھا، سرد پڑ گیا۔ اس کی جگہ میدانِ جہاد نے لی۔ فریقینِ مسلمان تھے۔ انگریزوں کو اطمینان ہو گیا کہ ان کا خطرہ ٹل گیا ہے۔ اب مسلمان آپس میں گتھم گتھا تھے۔ میرزا صاحب کا انتخاب سیالکوٹ کے انگریز ڈپٹی کمشنر نے کیا تھا اور وہ استعماری مقصد کے لیے نامزد ہوئے تھے، لیکن اس کے بعد وہ ہاں شاہ افسروں کے ہاتھ میں نہ رہے۔ ان کے ہایت کار بالواسطہ و بلاواسطہ بھٹانوی اینٹیلی جنس بیورو کے مرکزی افسر ہو گئے جو گورنر جنرل کے سامنے جوابدہ تھے یا پھر ان افسروں کا تعلق صوبائی گورنروں سے تھا۔ اصلاً ان کا رابطہ برطانیہ کے بین الاقوامی ادارہ سرافرنسی سے تھا۔ میرزا صاحب کی نشوونما انہی کی معرفت ہوئی۔

میرزا صاحب صحیح موعود اور مہدی مسمود کی حیثیت سے تولد ہونے لگے، تو علماء نے شد و مد سے دینی اعتبار شروع کیا۔ اس سے پہلے عیسائیت سے مناظروں کی ہم میں بعض علماء ان کی اعانت کرتے رہے تھے۔ اسی طرح آریہ سماج اور سناتن دھرم سے مبارزت نے بھی مسلمانوں کی ذہنی فضا کو اپنی طرف راہِ رجحان کر لیا تھا۔ انگریز برعظیم کے حکمران کی حیثیت سے ان مناظرانہ سرگرمیوں کی بہت افزائی کرتے، کیونکہ ان کا مقاداسی میں تھا کہ بزرعظیم کی مختلف قوموں میں اتحاد نہ رہے اور خود مسلمانوں میں انتشار پیدا ہو۔ میرزا صاحب نے عیسائیت، سناتن دھرم آریہ سماج اور برہمن سماج کی تردید میں براہین احمدیہ کی تصنیف کا اعلان و آغاز ۱۸۷۹ء میں کیا۔ فرمایا کہ وہ صداقتِ اسلام کے سلسلہ میں تین سو ویلیں پیش کریں گے۔ تمام مجتہد علماء اور نامور فضلاء سے مرزا صاحب نے عملی امداد کی درخواست کی۔ اکثر علماء و فضلاء نے اس خواہش کو پورا کیا۔ سرسید کے علمی رفیق مولوی چراغ علی نے بھی براہین احمدیہ کا ایک بڑا حصہ تصنیف کیا، لیکن میرزا صاحب نے کتاب میں اپنے نام سے شامل کیا اور ان کا نام تک نہ لکھا اور نہ کسی طرح انکا ذکر کیا۔ (ملاحظہ ہو بابائے اردو کی تصنیف چند ہم عصر، علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے اپنے ایک مضمون میں اس کا ذکر کیا ہے۔

براہین احمدیہ بڑے سائز کے ۵۶۲ صفحات میں چھپ کر نکلی۔ مرزا صاحب مسلمانوں سے اس کتاب کے لیے مسلمانوں سے اس کتاب کے لیے بے پلے مالی امداد کی اپیل کرتے رہے۔ ایک بڑی رقم جمع ہو گئی اور یہی مرزا صاحب کی خوشحالی کا آغاز تھا۔ لیکن انہوں نے اپنی خیانت کو چھپا کے لیے مسلمانوں سے لگا لگا کر انہوں نے مالی امداد میں ٹھک کیا ہے۔

مرزا صاحب نے کتاب کے چوتھے حصے کے شروع میں انگریزی گورنمنٹ کے زیرِ عنوان برطانوی ملحداری

کی مکمل کر مدح کی جملہ نون پراس کے احسانات گنوائے اور جہاد کی مخالفت پر دلائل قائم کیے۔ کتاب کے چاروں حصے سنہ ۱۸۸۴ء تک شائع کیے۔ پانچواں حصہ آخری تھا، وہ رگ گیا لیکن جلد اول کے ۵۷ سال بعد ۱۹۰۵ء میں شائع کیا۔ میرزا صاحب نے لکھا کہ وہ حسب الاعلان پچاس حصے لکھنا چاہتے تھے، لیکن پانچ پر اکتفا کرتے ہیں۔ فرق صرف ایک نقطہ کا ہے۔ جن تین سو دہائیوں کا وعدہ کیا تھا، ان سے کتاب خالی رہی۔ میرزا صاحب کے بیٹے میرزا بشیر احمد نے سیرۃ المدی میں لکھا ہے کہ پانچوں حصوں میں صرف ایک دلیل بیان ہوئی ہے اور وہ بھی نامکمل ہے۔ جہانگیر کتاب کا تعلق ہے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے الفاظ میں، اس شخص میں کوئی ناورد علی تحقیق نہیں۔ کچھ ہے تو بسیار نویسی اور دراز نفسی کا مجموعہ ہے۔ ایک قاری کے لیے اس کثرت سے الہامات، غمراہی، کشف، احکام خدادندی، پیش گوئیاں اور طویل و طریف دوسو سے ہیں کہ طبیعت بدمزہ و متغیر ہو جاتی ہے۔ ساری کتاب مصنف کی اپنی شخصیت کا اشتہار ہے۔ پہلے چار حصوں میں میرزا صاحب نے اپنے اس عقیدے کا اظہار کیا ہے کہ الہام کا سلسلہ جاری ہے اور جاری رہے گا۔

مولانا محمد بن ثباوی نے اس کتاب پر اپنے رسالہ اشاعت السنہ میں چھ قسطوں میں طویل تبصرہ کیا جس میں براہین احمدیہ کو علمی کارنامہ اور تصنیفی شاہکار قرار دیا ثباوی حضرت شیخ الکل محمد زید حسین محدث دہلوی کے شاگرد تھے۔ آپ کو علماء حدیث میں ایک خصوصی شہرت حاصل ہوئی۔ آپ کے متعلق رئیس قادیان کے مرتب ابوالقاسم رفیق دلاوری نے لکھا ہے کہ آپ میرزا صاحب کے بچپن کے دوست اور ہم سبق تھے۔ میرزا صاحب کے دعادی والہامات اور روپے پیسے میں بدمعاشی سے آپ کا جی کھٹا ہو گیا۔ آپ نے میرزا صاحب کو ٹوکا، لیکن وہ برطانوی استعمار کے گھوڑے پر سوار تھے، کیونکر مانتے؟ نتیجہً جابن میں ٹکراؤ ہو گیا۔ مولانا ثباوی نے میرزا صاحب کو آڑے ہاتھوں لیا۔ میرزا صاحب نے انہیں دہابی ہونے کے برطانوی الزام سے مطمئن کر کے انگریزوں کو بدظن کرنا چاہا اور حکام کو لکھا کہ دہابی سرشت کے مطابق وہ مسلمانوں کو برطانوی حکومت کے خلاف جہاد پر اکساتے ہیں۔ مولانا نے سیخ جہاد کا موقف اختیار کیا۔ اگر یہ ایک اصل حدیث عالمہ یہ نفی پاکر نہ صرف مشرور مصلح ہونے بلکہ شمش العلماء کا خطاب دیا اور انعام میں ارامنی عطا کی؛ حتیٰ کہ گورنر جنرل ہندوستان صوبائی گورنر کی سفارش پر اپنی جماعت کے لیے اہل حدیث کھلانے کی منظوری حاصل کی۔ مولانا ثباوی کی فراست کا نتیجہ تھا کہ ان کی جماعت دار دیگر سے محفوظ ہو گئی۔ میرزا غلام احمد کی مجبزی کا رت لگی اور قادیانی متبہی علماء کے آڑے نکلے پر آگیا، درنہ اس کا شیوہ تھا کہ وہ انگریز حکام سے مجبزی کر کے ان کے خلاف دار دیگر کا لاد و دشمن رکھتا۔

مولانا بناوی نے ۱۵ اپریل ۱۸۹۱ء کو حکیم نور الدین (غلیظہ اول) سے مباحثہ کیا اور اس کو بھگا دیا۔ اس کے بعد میرزا غلام احمد نے مولانا بناوی سے مناظرے کی طرح ڈالی لیکن میرزا ۱۸ مئی ۱۸۹۱ء تک بے سرو پا خط و کتابت کر کے فرار کیا۔ ان دنوں مولانا بناوی چنیاں والی مسجد کے خطیب تھے۔ آپ نے میرزا صاحب کو ان کے دعاوی پر مناظرے کی دعوت دی۔ میرزا صاحب نے سید ہی نہ دی۔ مولانا بناوی نے لدھیانہ پہنچ کر مرزا صاحب کے خسر میرزا ناصر لواب دہلوی کے مکان میں ۲۰ جولائی ۱۸۹۱ء کو تحریری مباحثہ کا آغاز کیا۔ مباحثہ ۱۲ روز تک رہا۔ آخر مرزا صاحب جھوٹ بول کر فرار ہو گئے۔ میرزا صاحب کی جھڑپی تو یکم اگست ۱۸۹۱ء کو مولانا بناوی سے حیات و مہمات میں مباحثہ کا اشتہار دیا اور لاہور میں مناظرہ کرنے کا اعلان کیا، لیکن میرزا صاحب اس سے بھی بھاگ گئے۔ مولانا بناوی نے اداں فردوسی ۱۸۹۱ء میں میرزا صاحب کی لاہور میں آمد پر ایک اور چیلنج کیا۔ لیکن میرزا صاحب الہام کی آڑ لے کر سیالکوٹ چلے گئے۔ مولانا بناوی پیچھے گئے۔ میرزا صاحب نے سیالکوٹ سے کوچ کرنے کی معافی تو کئی ایک معززین نے رد کا کہ مولانا بناوی سے مناظرہ کیجئے۔ میرزا صاحب نے مذکر کیا کہ وہ مجھے کافر کہتا اور گایاں دیتا ہے، اس سے مناظرہ جائز نہیں۔ المنقر مرزا صاحب سیالکوٹ سے اڑ گئے۔ کپور تھلہ پہنچے۔ مولانا بناوی نے وہاں تعاقب کیا۔ مقامی علماء نے میرزا صاحب کو گھیر لیا، تو وہاں سے جالندھر چلے گئے۔ مولانا بناوی نے جالندھر کے علماء کو لکھا، لیکن میرزا صاحب ان کا نام نہ سنتے ہی اڑ پھو ہو گئے۔

میرزا صاحب نے مولانا بناوی کے تعاقب سے تنگ آکر اپنے ایک الہام کا اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ چالیس دن کے اندر محمد حسین بناوی کو ذلیل و خوار کرے گا، کیونکہ اس نے میری اہانت کو شمار بنالیا ہے۔ لیکن مولانا بناوی پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم رہا۔ انہوں نے ۳۰ اپریل ۱۸۹۲ء کو اپنے رسالہ میں لکھا کہ وہ بفضل تعالیٰ زندہ ہیں اور میرزا غلام احمد کے مقابلہ میں مندرست و توانا اور خوش و خرم ہیں۔ میرزا صاحب اپنا سامنہ لے کر رہ گئے۔ میرزا صاحب عجیب الخفقت انسان تھے۔ علماء کے تعاقب سے کاروبار ماند پڑ گیا، تو زراعت کے رکنے پر ۱۵ دسمبر ۱۸۹۲ء کو میاں بذیر حسین محدث دہلوی، مولانا محمد حسین بناوی اور ان تمام علماء کو دعوت مبارکہ دی، جن کے نزدیک وہ اپنے دعاوی کے باعث خارج از اسلام ہو چکے تھے۔ مولانا بناوی نے فی الفور مبارکہ منظور کر لیا اور مرزا صاحب کو لکھا کہ وہ جہاں مبارکہ کرنا چاہیں، انہیں آنے میں کوئی فتنہ نہ ہوگا۔ لیکن مرزا صاحب حسب عادت فرار کر گئے۔ پھر اگلے سال ۳۰ مارچ ۱۸۹۳ء کو مرزا صاحب نے ایک اشتہار شائع کیا جس میں لکھا کہ محمد حسین بناوی میرے مقابلہ میں تغیرِ کسبانِ عربی میں لکھیں۔ مولانا بناوی نے اپنے رسالہ اشاعت السنہ میں مرزا صاحب کا چیلنج منظور کر لیا۔

میرزا صاحب حسب معمول اس سے بھی بھاگ گئے۔ مولانا محمد حسین بنا لوی لاہور سے ریل گاڑی میں سوار ہو کر پورب کی طرف جا رہے تھے کہ ٹرین میں حکیم نور الدین سے ملاقات ہو گئی۔ ان سے میرزا صاحب کے عقائد پر گفتگو ہوئی۔ حکیم صاحب گریز کرتے رہے۔ بالآخر جان بچا کر نکل گئے۔ مولانا بنا لوی نے حکیم صاحب کے کہہ کر میرزا صاحب کے اعلانات و تحریات و رسائل آپ کے قلم سے ہیں اور آپ کے نامی پس منظر میں ہیں۔ حکیم صاحب غنہ نیم ہی کے ساتھ سرائیکی کے عالم میں چلے گئے۔ میرزا صاحب نے ۱۸۹۴ء کو اپنے ایک الہام کا اعلان کیا کہ محمد حسین بنا لوی نے ان سے بیعت کر لی ہے۔ اس پیش گوئی کو میرزا صاحب نے اپنی منظوم کتاب اجماز احمدی مطبوعہ لاہور ۱۹۰۲ء میں دہرایا تو مولانا بنا لوی نے میرزاویت کا تعاقب تیز کر دیا۔ میرزا صاحب زہرچ ہوتے گئے اور ان کی ہر پیش گوئی باطل ثابت ہوئی۔ میرزا صاحب کے پاس گالیاں بکنے کے سوا اور کوئی نسخہ نہ تھا۔ انہوں نے علماء مشائخ کے خلاف اتنی گندی زبان استعمال کی کہ محام ششدر رہ گئے۔ مولانا بنا لوی نے اپنے رسالہ اشاعت السنہ میں شدید محاسبہ کیا۔ میرزا صاحب کی ہوا اکھڑ گئی۔ لوگ سوال کرنے لگے کہ ایک مہم جو اپنے تئیں مہور من اللہ کہتا ہے، کیا اس قسم کی بازاری زبان بولتا اور کہتا ہے؟ لیکن میرزا صاحب کے نزدیک ان کے اعلانات کا یہی طغی تھا۔ میرزا صاحب نے اپنے ایک رویا کے مفرد منہ پر مولانا بنا لوی کی موت کا اعلان کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے میرزا صاحب کے مقبلی ہونے کی مہر لگا دی۔ میرزا صاحب ان سے پہلے ۲۶ مئی ۱۹۰۵ء کو انتقال کر گئے۔ مولانا بنا لوی نے بارہ سال بعد ۲۹ جنوری ۱۹۲۰ء کو وفات پائی۔ علماء اصل حدیث نے میرزا صاحب کے کفر پر فتویٰ دیا۔ اُن کا فتویٰ، فتاویٰ ندیری جلد اول کے صفحہ ۴۴ پر موجود ہے۔ میرزا صاحب اس فتویٰ سے قہقہے اٹھاتے اور میاں صاحب کو منافق و کاذب چیلنج دیا۔ میاں صاحب سو برس سے اوپر ہو چکے اور انتہائی کمزور تھے۔ آپ نے میرزا صاحب کے چیلنج کو اپنے تلامذہ کے سپرد کیا۔ میرزا صاحب اپنی عادت کے مطابق فرار ہو گئے۔ جن الحدیث علماء نے میرزا صاحب اور اُن کے بعد قادیانی امت کو زیر کیا۔ اُن میں مولانا محمد بشیر سوانی، قاضی محمد سلیمان منصور پوری اور مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی سرفہرست تھے، لیکن جن شخصیت کو علماء الحدیث میں فاتح قادیان کا لقب ملا، وہ مولانا شمس اللہ امرتسری تھے۔ انہوں نے میرزا صاحب اور اُن کی جماعت کو لوہے کے چنے چبوا دیے۔ اپنی زندگی ان کے تعاقب میں گزار دی۔ اُن کی بدولت قادیانی جماعت کا پھیلاؤ رک گیا۔ میرزا صاحب نے تنگ آکر انہیں خط لکھا کہ میں نے آپ سے بہت دکھ اٹھایا ہے اور مبرا کرتا رہا ہوں۔ اگر میں کذاب و مفتری ہوں جیسا کہ آپ لکھتے ہیں، تو آپ کی زندگی میں ہلاک ہو جاؤں گا، ورنہ آپ سنت اللہ کے

مطابق کذبین کی سزا سے نہیں بچیں گے۔ خدا آپ کو بازو کرے گا۔ خداوند تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مفسد و مکذب کو صادق کی زندگی میں اٹھائے۔
خط مورخہ ۵ اپریل ۱۹۰۶ء

اس خط کے ایک سال، ایک ماہ اور بارہ دن بعد میرزا صاحب لاہور میں اپنے میزبان کے بیت الخلاء میں دم توڑ گئے۔ مولانا شہداء اللہ نے ۵ مارچ ۱۹۰۸ء کو سرگودھا میں رحلت فرمائی۔ وہ میرزا صاحب کے بعد ۴۰ سال تک زندہ رہے۔ ان کے علاوہ مولانا عبداللہ معمار، مولانا محمد شریف گھڑیا لوی، مولانا عبدالرحیم لکھو والے، مولانا حافظ عبداللہ روپڑی، مولانا حافظ محمد گوندلوی، مولانا محمد اسحاق گوجرانواری، مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا عبدالقادر روپڑی اور حافظ محمد ابراہیم کبیر پوری وغیرہ نے قادیانی اُمت کو ہر دینی محاذ پر خوار کیا۔ اس سلسلہ میں غزنوی خاندان نے عظیم خدمات انجام دیں۔ مولانا داؤد غزنوی جو جماعت اہل حدیث کے امیر اور مجلس احرار اسلام کے سیکرٹری رہے انہوں نے اس محاذ پر بے نظیر کام کیا۔ فی الجملہ تحریک ختم نبوت کے اس آخری دور تک جب میرزائی مسلمانوں سے الگ کیے گئے اور اُمتیسنی اقلیت قرار پائے، علماء اہل حدیث قادیانیت کے تعاقب میں پیش پیش رہے اور اس عنوان سے اتحاد بین المسلمین میں قابل قدر حصہ لیا۔

میرزا صاحب نے اپنے العامات وغیرہ لکھنے کی غرض سے ایک برہمن کاٹیا سنی شام لال بھر ۱۲ سال ملازم رکھا تھا۔ وہ ناگری اور فارسی رسم الخط دونوں سے واقف تھا اور میرزا صاحب کے العامات پر دستخط کرتا (ملاحظہ ہو البشری جلد اول حصہ دوم صفحہ ۱۰)، وہ کئی سال تک ملازم رہا۔ میرزا صاحب کے تم نژاد بھائی میرزا الہام دین نے اپنے اشتہار صداقت کا اظہار ”مطبوعہ ۴ اگست ۱۸۸۵ء“ میں اکتشاف کیا کہ شام لال ایک بے سمجھ لڑکا ہے اور سو تک گنتی بھی نہیں جانتا، لیکن علماء نے میرزا صاحب کے ذلیل گایاں کھائیں۔ خود اپنی زبان کبھی گندی نہ کی، حالانکہ وہ عمومی شہرت کے مطابق میرزا صاحب کے عجیب ذوق کی نشاندہی کر سکتے تھے۔

مولانا غلام دستگیر حسروی ان دنوں پنجاب کے علماء دین میں ایک ممتاز شخصیت تھے۔ میرزا صاحب اپنے گھیراؤ سے گھبرائے، تو علماء کو مناظرہ کا چیلنج کیا۔ مولانا غلام دستگیر حسروی نے مناظرہ پر صواب کیا۔ ۲۵ دسمبر ۱۸۹۲ء کی تاریخ مقرر ہوئی۔ مقام مناظرہ موچی دروازہ کے اندر مسجد چل بیاباں طے پایا۔ مگر میرزا صاحب وعدہ کے باوجود قایم رہے۔ ایک دوسری تاریخ ۱۵ جون ۱۸۹۳ء مقرر ہوئی۔ میرزا صاحب نے مباحثہ کے لیے محیم نور الدین اور مولوی محمد احسن کو مقرر کیا، لیکن وہ بھی حاضر نہ ہوئے اس قسم کا ٹال مٹول اور فرار دگریز میرزا صاحب کی ہمانہ سیرت کا خاصہ تھا۔

میرزا صاحب نے اپنے مجدد ہونے کا راگ چھیڑ کر لدھیانہ کا سفر کیا تو وہاں بعض افراد نے آپ کے استقبال کا فیصلہ کیا۔ اس عزم سے ایک میٹنگ ہوئی جس میں مرزا صاحب کے محاسن بیان کیے گئے۔ اس پر مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کے والد کے چچا مولوی عبداللہ نے کھڑے ہو کر بیان کیا کہ مرزا انتہاء درجہ کا محمد و زندقہ ہے۔ بعض ساتھیوں کو ان الفاظ میں تیزی محسوس ہوئی، حتیٰ کہ مولانا حبیب الرحمن کے دادا جان نے بھی بھائی سے اتفاق نہ کیا، لیکن مولوی عبداللہ نے استخارہ کیا، تو اپنی رائے کو درست پایا۔ آخر براہین احمدیہ کے فائدہ مطالعہ سے میرزا صاحب کے طرد و زندقہ ہونے کا اعلان کر دیا۔

چونکہ میرزا صاحب کا دعویٰ نبوت عوام و خواص کی نظروں سے اوجھل تھا اور وہ انیس آریوں اور عیسائیوں کے مقابلہ میں ایک مناظر کی حیثیت سے جانتے پہچانتے تھے، اس لیے ابتداً مرزا صاحب کی تکفیر سے متعلق بعض جید علماء کو تردد تھا۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا محمد یعقوب نے فتویٰ دینے یا فتویٰ پر صاف کرنے سے گریز کیا، لیکن جب ان کے سامنے مرزا صاحب کی تمام تحریریں رکھی گئیں، تو انہوں نے مرزا صاحب کے خارج از اسلام ہونے سے اتفاق کیا اور فائدہ المسلمین میں میرزا صاحب کے تعاقب کی فضا پیدا کی۔ اس دوران ہی میں حرمین شریفین کے علماء نے میرزا صاحب کے کفر کی تصدیق کی۔ مگر مغلطہ کے منکر، علامہ رئیس القضاۃ شیخ عبداللہ بن حسن نے مرزا صاحب کے کفر کا اعلان کرتے ہوئے ان کے پیروؤں کو بھی اسلام سے خارج قرار دیا۔ اس کے بعد مصر، شام اور فلسطین کے مفتیان عظام نے بھی میرزا کے کفر پر فتویٰ دیا۔ ان فتوؤں کا نتیجہ یہ نکلا کہ تبرِ عظیم کا ہر صوبہ مرزا صاحب کے دعویٰ سے باخبر ہو گیا اور قادیانیت کو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف گستاخانہ بغاوت قرار دیا گیا۔ یہ زمانہ تھا جب وقت کے تمام بڑے بڑے علماء نے میرزا صاحب کی خبر لی اور اپنے اپنے دوائر میں مسلمانوں کو ان کے کفر سے خبردار کیا۔ مولانا لطف اللہ علی گڑھی، مولانا شمس الحق عظیم آبادی، مولوی محمد صدیق دیوبندی، مولوی محمد اعظم لکھنوی، مولانا محمد رحیم بانی مولانا احمد حسن کانپوری، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا عبدالغفار لکھنوی، مولانا عبدالجبار عمر پوری، مولانا احمد حسن دہلوی، مولانا عبدالحق حقانی دہلوی، مولانا محمد حسین بنارس، مولانا محمد عبداللہ فازی پوری، مولانا عبدالحق رحیم آبادی، مولانا محمد ادریس جھنجھانوی، مولانا غلام محمد گوی خلیف شاہی سجد لاہور، مولانا غلام احمد مدرسہ نعمانیہ لاہور، مفتی محمد عبداللہ ٹونکی ادیشل کالج لاہور، مولانا رحیم بخش مصنف سلسلہ تعلیم اسلام لاہور، مولانا احمد علی مدرسہ اسلامیہ شاہ، مولانا محمد اسحق مفتی پٹیالہ، مولانا محمد حسین ضلع جلم، حافظ عبدالنمان وزیر آبادی

مولانا عبدالقادر شمانوی، شیخ السند مولانا محمود الحسن، مولانا محمد علی منیرگیری، مولانا عزیز الرحمن دیوبندی، مولانا خلیل احمد سہانپوری، مولانا احتشام الدین مراد آبادی، مولانا فقیر اللہ شاہ پوری، مولانا محمد ایمان اللہ دہلوی، مولانا محمد اسماعیل علی گڑھی، مولانا محمد ایوب ساکن کول، مولانا وصیت علی غازی پوری، مولانا عبد الجبار غزنوی، مولانا عبد الغفور غزنوی، مولانا عبد الحق غزنوی، سید محمود حسین قادری سجادہ نشین پشاور، مولانا عبدالرحمن لکھوی، سید اکبر شاہ خفی پشاور، مولانا محمد ایوب خفی پشاور، مولوی رحمت اللہ پشاور، مولوی تاج الدین گجراتی، مولوی ہدایت اللہ راولپنڈی، مولوی امام دین کپور تھلوی، مولوی اشرف علی سلطانپوری، مولوی عبدالقادر بیگوال، مولوی عبدالرحمن دیوبندی اور مولوی گل محمد خاں دیوبندی اپنے زمانے میں بزرگ ترین کے نامور علماء تھے۔ تمام ملک میں مسلمانوں کے اجتماعی مزاج کی دینی بصیرت پر ان کا عظیم اثر تھا۔ ان سب نے مرزا صاحب کے استدلال و کمزوری اس طرح چھٹاڑ کی کہ مرزا صاحب نامک کا آنسو ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے آریوں اور عیسائیوں سے مناظروں کا ڈھونگ بچا کر بوداوار حاصل کیا تھا، وہ خاک میں مل گیا۔ ان کی بدولت انگریزوں کی منشا کامیاب ہو گئی، لیکن وہ خود مسلمانوں میں ہر طرح معضوب و مہزوک ہو گئے۔ علماء ان کا پیچھا کرتے اور وہ ان سے بھاگتے۔ اُس زمانے میں مرزا صاحب کا شرعی تعاقب ہی کیا جاسکتا تھا۔ اولاً مسلمان مرزا صاحب کے استعماری ظہور سے ناواقف تھے۔ ثانیاً برطانوی استبداد اس درجہ بے رحم تھا کہ مرزا صاحب کا سیاسی احتساب سخت مشکل تھا۔ مولانا محمد حسین ثلوی نے انگریزوں کے استبداد کو ملحوظ رکھتے ہوئے پہلے تیغ جہاد کی اساس قائم کی۔ پھر مرزا صاحب کا مقابلہ کیا۔ میرزا صاحب کا سب سے بڑا ہتھیار یہ تھا کہ وہ برطانوی سلطنت کے گن گاتے اور اپنے مخالفوں پر باغی ہونے کا الزام دھرتے تھے۔ لیکن مرزا صاحب پنجابی مسلمانوں کے خدام عقائد میں اپنے لیے جگہ پیدا کر لیتے اور اس طرح ایک طاقتور قادیانی اُمت وجود میں آئی، لیکن علم کی زبردست مزاحمت اور طاقتور احتساب کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرزا صاحب محدود سے محدود ہو کر رہ گئے۔ ان کی زندگی میں پیرو کار ڈیڑھ دو ہزار سے زائد نہ ہو سکے میرزا بشیر الدین محمود کے زمانہ خلافت میں تعداد اس لیے بڑھی کہ پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں نے قادیانی اُمت سے خلافتِ فتیانہ کے خلاف کما حقہ فائدہ اُٹھایا۔ اس کے صلے میں قادیانیوں کو نہ صرف یہ کہ مختلف مادی فوائد حاصل ہوئے بلکہ ان کے لیے سرکاری ملازمتوں کا دروازہ کھل گیا۔ جو لوگ دین کے معاملہ میں کمزور تھے، وہ ان فوائد سے مستفیع ہونے کے لیے قادیانی ہو گئے۔ اس طرح قادیانی چند ہزار سے چند لاکھ ہو گئے۔ ایک عام انداز سے کے مطابق دو تین لاکھ کے درمیان تھے۔ دوسرا سبب افزائش نسل کا تھا۔ ہر خاندان میں اولاد کی پیدائش سے نصف صدی کے اندر اندر تعداد بڑھتی چلی گئی لیکن مغرب نہ

مسلمانوں کی رواداری اور بے خبری کے باوجود قادیانیت کے لیے مسلمانوں میں کوئی جگہ نہ رہی۔ بعض فیاض مسلمانوں کے سوا ہر کلمہ گو کے دل پر نقش ہو گیا کہ مرزا غلام احمد کی متابعت اسلام کے منافی ہے۔ اور کوئی مسلمان قادیانی ہونے کے بعد مسلمان نہیں رہتا۔ غرض تبرعظیم کے ہر صوبے میں میرزا صاحب کے خلاف دینی دلولہ پیدا ہو گیا۔ جن ٹھکانوں میں سے رُوح جہاد سلب کرنے کے لیے مرزا صاحب کو تخلیق کیا گیا ان کے علاقوں میں قادیانیت سنگساری کا برم قرار پائی۔ سرحد کے دو چار باشندوں ہی نے قادیانیت قبول کی۔ ان کے علاوہ دوسرے قادیانی پنجابی اصل تھے اور انہیں انگریزوں نے اپنے مقاصد کی آبیاری و کاریگری کے لیے سرحد و بلوچستان میں بسایا تھا۔ پنجاب کے ان اضلاع میں جو انگریزوں کے لیے سپاہی پیدا کرتے تھے۔ قادیانیت کی آبیاری کی گئی اور عسکری اضلاع میں ایک آدھ گاؤں ان کیلئے مخصوص کیا گیا۔ لیکن پنجاب کا سہیسی میں فرد ہونے کے باوجود، میرزائیت کے لیے تنگ ہوتا گیا، تمام مساجد میں میرزائیت کے خلاف جمعہ کو وعظ ہوتے۔ کسی میرزائی کے لیے مسلمانوں میں ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔ پہلی جنگ عظیم تک ممبر و محراب کے یہی میل و نہار رہے کہ علماء دینی تعادیر و خطبات میں میرزائیت کا محاسبہ کرتے اور عوام اُس سے بچتے۔ کوئی جگہ بھی تو مغربیت میں ڈھلے ہوئے سیاسی مسلمانوں کا ایک گروہ تھا جو کسکان و حدیث سے نااہل ہونے کے باعث میرزائیت کو مسلمانوں کا ایک فرقہ خیال کرتا اور اس سے اختلاف کو ممبر و محراب کی عادت مستمرہ گردانتا یا پھر ان کے مفادات کا ایک حصّہ میرزائیت کے حلقہ میں تھا۔ اس زمانہ کے تمام دینی رسائل و جرائد میں میرزائیت کی چھڑاؤ کی جاتی۔ ادھر علماء کے تمام حلقے اختلاف فکر و نظر کے باوجود، میرزائیت کے مقابلہ میں متفق الڑاتے تھے۔ اس زمانہ میں میرزائیت سے متعلق علماء کی جانب سے جو کتابیں رسائل کتابچے اور اشتہارات شائع ہوئے ان کی تعداد احرار کی سروے رپورٹ کے مطابق ڈیڑھ ہزار کے لگ بھگ تھی۔

میرزا صاحب کا انتقال برائڈ ٹھہر ڈولا ہور میں ایک معتقد کے ہاں ہوا، لیکن ان کا جنازہ قادیان لے جانا مشکل ہو گیا۔ مسلمانوں نے زبردست مظاہرہ کیا۔ بعض نچلوں نے بھنگر ڈاڈالا کہ ختم نبوت کا ایک ساری بیت اللہ میں نقد جان ہا گیا۔ لوگوں نے ریلوے اسٹیشن تک میت پر کوڑا کرکٹ پھینکا۔ یہ تمام مظاہرہ اس امر کی دلیل تھا کہ میرزا صاحب کے لیے مسلمانوں کے ذہن میں کوئی جگہ نہیں۔ وہ انہیں کافر و مرتد یا بگڑے اور ان کے دعوئی نبوت کو حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم المرسلین کے خلاف جارحانہ اقدام سمجھتے ہیں۔ ان مظاہرے ثابت ہوتا ہے کہ میرزا صاحب اپنی زندگی ہی میں تائب علیہ کے راندہ ہو چکے تھے اور ان کے لیے ہندوستانی قوا میں مددگار کوئی جگہ نہ تھی۔ ادھر مسلمانوں کو یقین ہو چکا تھا کہ وہ ائمہ تلبیس میں سے ہیں۔

انگریزوں نے پہلی جنگ عظیم کے بعد قادیانی و عادی کی ضرورت سے اتھ اٹھایا۔ اور میرزا ایوب کو ایک سیاسی ضرورت کا بیڑہ قادیانی امت کو مہرے کی حیثیت سے اپنی شطرنج پر دیکھنا چاہتے تھے؛ چونکہ میرزا صاحب اپنی تخلص تھے۔ اس لیے اس سلسلہ میں کوئی وقت نہ تھی۔ سوال صرف استعمال کا تھا۔ میرزا بشیر الدین سیاسی ضرورت کا صحیح مہرہ تھے، انہیں معلوم تھا کہ اُن کی جماعت کا مذہبی پھیلاؤ ختم ہو چکا ہے۔ اب "احمدی" ہونے والے لوگ اغراض کے تابع ہیں۔ کوئی "ٹاواں ٹاواں" مسلمان احمدی ہوتا، تو اس کے پس منظر میں کئی چیزیں ہوتیں۔ مثلاً وہی افلاس، کسی قادیانی زمیندار کا رُخ، بعض ملازمانہ مجبوریاں اور اس سلسلہ میں ملشی جنسی ترغیب و تحریریں کسی ایسے شخص کے احمدی ہونے کا سوال نہ رہتے تھے، جو دین کی تلاش میں ہوں اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی چاہے۔ شکار ہونے والے ناخاندہ ہوتے یا ضرورت مند اور وہ بھی لاکھوں میں دو چار۔ میرزا بشیر الدین نے مذہبی روپ میں ایک سیاسی شاطر کی تربیت حاصل کی اور اپنے طریقے کو بعض مصیبتوں کے تابع اس طرح منظم کیا کہ پنجابی مسلمان ان کی معرفت استعماری ہتھکنڈوں کا شکار ہوتے چلے گئے۔ اور بظہیر کی فرقہ دار سیاست میں برطانوی خواہشیں راہ پاتی گئیں۔ پنجاب ان خواہشوں کا محور تھا۔ اب سوال یہ نہ تھا کہ احمدی مسلمانوں کی آواز ہیں یا انہیں ہندوستانی مسلمانوں میں کوئی رسوخ حاصل ہے۔ سوال یہ تھا کہ احمدی برطانیہ کی سیاسی مزدوروں کا ایک عضو تھے اور اس عضو کی حیثیت سے وہ کسی نہ کسی خانے میں کام آتے تھے۔ میرزا بشیر الدین نے اپنے تئیں سیاست پران پر اٹھایا اور بہت جلد اس دائرے میں مستحکم ہونا شروع کیا۔ وہ خلیفہ شافعی تھے۔ انہوں نے چاہا کہ اُن کے پیروکار ایک فعال اقلیت ہو جائیں اور ایک منظم جماعت کی حیثیت سے انگریزوں کو اپنی اہمیت کا احساس دلانیں۔ انہیں کوئی سی خدمت بجالانے میں عار نہ تھا۔ سب سے پہلے انہوں نے اپنے متبعین میں اس عقیدہ کو راسخ کیا کہ وہ تمام مسلمان کافر ہیں جو میرزا غلام احمد پر ایمان نہیں لائے۔ ان کے بچوں تک کا جنازہ پڑھنا حرام ہے اور ان سے کوئی دینی یا معاشرتی رشتہ قائم نہیں ہو سکتا۔ اس عقیدہ نے مسلمان ریاستوں میں قادیانی امت کو برطانیہ کا صحیح جاسوس بنا دیا۔ اور وہ برطانوی اقتدار کی خدمات بجالانے میں مستعد مخلص ہو گئی۔ اکثر قادیانی ہندوستان سے مسلمان ملکوں میں جاسوسی کے لیے جاتے۔ افغانستان نے دو ایک کو نگہار کیا۔ اور برطانوی خوشنودی کے لیے اس اعلان کا حوصلہ صرف قادیانی ہی کر سکتے تھے کہ کہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی چھاتیوں کا دودھ خشک ہو چکا ہے اور اب قادیان ارضِ محرم ہے۔

اس الہامی فضائے قادیانی امت کو انگریزوں کا بہترین جاسوس بنا دیا۔ اسی باعث قادیانی اسلامی ملکوں میں اپنا جال بچھانے میں کوئی سی دشواری محسوس نہ کرتے، چنانچہ پہلی جنگ عظیم پھڑنے سے قبل اسلامی

مکوں میں میرزائی جاسوس مقرر کیے گئے۔ وہ برطانوی اشارے پر کام کرتے اور معلومات کے حصول میں انگریزی حکومت کے مددگار ہوتے ان سے سکاٹ لینڈ یا رڈ کے عہدیدار کئی ایک کام لیتے؛ چنانچہ عربوں کو ترکوں سے بدظن کئے کے لیے جو لٹیر پھرتے ہوئے تھے۔ اس کے مرتب و منتظم قادیانی تھے۔ انہوں نے عرب ریاستوں میں عوام کو بھڑکا کر ترکوں کو ذبح کرایا اور خلافت عثمانیہ کے خلاف اس طرز کا ایندھن جمع کیا کہ جزیرۃ العرب میں آگ کا طوفان پھیل گیا۔

میرزا بشیر الدین نے خلافت عثمانیہ کے سقوط اور جزیرۃ العرب میں انگریزوں کے داخلہ کی خوشی میں اپنے پیروؤں کو چڑاواں کرنے کا حکم دیا۔ قادیان کو لقمۂ نور بنایا گیا۔ بس کا مقصد ایک تو فی الواقعہ مسرت و وفاداری کا اظہار تھا۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ میرزا بشیر الدین محمود اس طرح انگریزوں کو بتانا چاہتے تھے کہ ان کی اُمت بھلائی سلطنت سے کہاں تک مخلص ہے اور وہ کسی حالت میں بھی مسلمانوں کے ساتھ نہیں۔ جنگ عظیم ختم ہو گئی، تو بعض عرب مکوں مثلاً حجاز، عراق، شام، فلسطین وغیرہ میں میرزائیوں نے برطانوی سرکار کی خینہ سے خینہ خدمات انجام دیں۔ ان کا روپ مذہبی تھا، لیکن ان کے مشن سیاسی تھے۔ وہ ان ممالک میں برطانوی مقاصد کے بہترین آلہ کار تھے۔ ترک میں انگریزوں کی فتحیابی کو مصطفیٰ کمال نے صدمہ پہنچایا، تو وہ ان کے جان لیوا ہو گئے۔ اس غرض سے انہوں نے ہندوستان سے ایک نوجوان مصطفیٰ صغیر حاصل کیا کہ وہ ترکی میں رہ کر مصطفیٰ کمال کو ہلاک کرے گا۔ مصطفیٰ صغیر اپنے کام سے پہلے ہی پکڑا گیا اور سزائے موت پا گیا، لیکن مصطفیٰ صغیر اندر خانہ قادیانی عقیدہ تھا اور اس کو میرزا بشیر الدین محمود نے منتخب کر کے برطانوی سرکار کے حوالے کیا تھا۔ میرزا بشیر الدین کے اعمال و حرکات کے باعث میرزائی اُمت کے سیاسی خدو خال عمیقی مسلمانوں کی نگاہ میں آچکے تھے۔ مولانا ظفر علی خان نے زمسیدار میں اس رُخ سے عاسبہ شروع کر دیا تھا، لیکن ۱۹۳۸ء تک قادیانی اُمت کا عوامی اعتبار سے مسلمانوں میں دینی مقاطعہ ضرور تھا، مگر اس کے سیاسی کردار کی اجتماعی معزوتوں سے مسلمان غافل تھے۔ اس کا شاذ ہی نوٹس لیا جاتا۔ قادیانی اُمت نے تحریک خلافت کے بعد فرقہ دارانہ مسئلہ میں تلخیاں پیدا کیں۔ چوہدری سرفراز اللہ خاں مسلم لیگ کی صدارت تک پہنچے، پھر مسلمانوں کے نمائندہ ہو کر دائرے کی ایگزیکٹو کونسل میں چلے گئے اور اپنی جماعت کی تبلیغ و تقویت کا باعث ہوئے۔ ان پندرہ برس میں میرزائی اُمت نے کس کس رُخ سے برطانوی اقتدار کی خدمات کا فرض ادا کیا۔ اس کا اندازہ تاریخ احمدیت کی آٹھ جلدوں کے مطالعہ سے کیا جاسکتا ہے اور ظفر اللہ خاں کی سوانح عمری "تحدیثِ نعمت" سے بھی بہت سی کڑیاں تلاش کی جاسکتی ہیں۔ آئندہ ابواب کے عوامی سیاسی جائزے میں اس کی تفصیلات آئیں گی۔ مختصر یہ کہ میرزائی دوسرے تمام مسلمانوں کو حقیقتاً اسلام سے خارج

بکھتے اور ان کے ساتھ معاشرتی رابطہ قائم کرنے سے پرہیز کرتے تھے، لیکن مسلمانوں کے سیاسی حقوق سے کلاماً مستمع ہوتے اور اپنی عدوی اقلیت کا فلبہ چاہتے تھے۔ خود مسلمانوں سے اسلاما انگ رہتے لیکن مسلمان شرعی محاسبہ کرتے تو اس سے گزرتے، کیونکہ اس طرح ان کا سیاسی وجود بے اعتبار ہو جاتا۔ وہ عوامی اعتبار سے کوئی سی طاقت نہ رہے تھے۔ مولانا ظفر علی خان کی عوامی تحریک، احرار کی تحریک اور علامہ اقبال کے علی محاسبہ نے میرزائیت کے چہرے سے نقاب اُٹھادی، اور وہ شکار ہو گئی کہ ان کا وجود ہی استعماری ضرورتوں کی پیداوار ہے، لیکن آزادی کے پہلے سولہ سترہ برس میں بھی مسلمانوں کا شعاری رہا کہ میرزائی امت کے سیاسی عزائم کا شرعی ہتھیاروں سے مقابلہ کرنے اور ختم نبوت کے مسئلہ سے انہیں بچ کرتے تھے۔

ادھر آزادی سے پہلے بڑے عظیم میں مسلمانوں کے وجود کا مسئلہ قومی اعتبار سے اس پنج پر تھا کہ پاکستان کی تحریک نے میرزائی امت کے سیاسی احتساب کو ٹال رکھا تھا۔ تب مسلمانوں کے سامنے انگریزوں اور ہندوؤں سے آزادی حاصل کرنے کا سوال تھا۔ پاکستان کی جدوجہد کا دھارا اس طرح بہہ رہا تھا کہ مسلمان اس مسئلہ کو تحریک بنانے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ ایک بڑی چیز یہ تھی کہ میرزائیت کا محاسبہ احرار سے مخصوص و منسوب ہو چکا تھا۔ احرار پاکستان کی تحریک میں شامل نہ تھے مسلمان ان سے ناراض تھے۔ اس ناراضی سے قائد قادیانی امت نے اٹھایا، لیکن یہ کوئی دیر پا چیز نہ تھی۔ قادیانی ایک خاص دور تک اپنے تئیں چھپا سکتے تھے۔ ہمیشہ کے لیے نہیں۔ ایک سیاسی اشتعال اور ایک سیاسی ضرورت نے انہیں سہارا دیا، لیکن وہ سہارا اقتدار کی عصا تھا۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ وہ قادیانی امت کو اپنے سے خارج سمجھتے تھے اور یہ فضا علماء کے دینی احتساب سے پیدا ہو کر مسلمانوں کے اذہان کا جزو لاینفک ہو چکی تھی اور اس فضا کا ٹوٹنا یا توڑنا کسی شخصیت یا ضرورت کے بس میں نہ تھا۔

سیدنا مہر علیشاہ کی ضربِ یدِ الہی

پنجاب اُن دنوں علماء سے کہیں زیادہ مشائخ کا صوبہ تھا۔ مغربی اضلاع کے مسلمان زیادہ تر مشائخ ہی کے گردیدہ تھے۔ اور صوبہ کا بڑا حصہ تعلیمات کے مقابلہ میں کرامات کا شیدائی تھا۔ میرزا غلام احمد صوبہ کے بے پڑھے لکھے مسلمانوں کو بآسانی شکار کر سکتے تھے۔ کیونکہ انہوں نے اہمات کا کھڑا کر دیا اور کئی اضلاع میں ان کا چرچا تھا۔ اکثر مشائخ اور ان کے ہانشینوں نے اُن کی طفس رنگاہ ہی کی اور میرزا صاحب کی حرکات کا نوٹس لیا۔

حضرت پیر مہر علیشاہ بیسویں صدی کے آغاز میں مشائخ پنجاب کے سلسلہ کی سب سے بڑی روحانی شخصیت تھے۔ آپ ۱۸۹۰ء میں حج کے لیے تشریف لے گئے، تو آپ نے دیارِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی میں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن حاجی امدا اللہ مہاجر کی علیہ الرحمۃ نے اپنے کشف کی بنا پر آپ سے کہا کہ :

”آپ کے ہاں ایک بہت بڑا فتنہ ظاہر ہونے والا ہے۔ اس کا سد باب آپ کی ذات سے متعلق ہے۔ آپ وہاں خاموش بھی بیٹھے رہے تو بھی ملک کے علماء اس فتنہ کی زد سے محفوظ رہیں گے اور عامۃ المسلمین اس کی دستبرد سے بچ جائیں گے“ (مفوضاتِ طیبہ برتبہ فقیر محمد مولوی عبدالحق)

حضرت قبلہ واپس آگئے تو مکاشفات و مشاہدات کے ذریعہ آپ کو معلوم ہوا کہ فتنہ مذکور میرزا غلام احمد اور ان کے دعاوی ہیں۔ سیدنا مہر علیشاہ صاحب کے مفوضات میں درج ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے

عالم رویا میں فرمایا :

”غلام احمد میری احادیث کو تاویل کی قنچی سے کتر رہا ہے۔ تم خاموش بیٹھے ہو، اس کا تعاقب و تدارک کرو۔“
 میرزا غلام احمد نے ۱۸۹۱ء میں اپنے صریح موعود ہونے کا اعلان کیا تو علماء اُن کے پیچھے پنجے جھاڑ کے پڑ گئے۔ مشائخ کی
 نگاہ میں میرزا غلام احمد ایک مناظر تھا، جو نظریہ ظاہریوں اور عیسائیوں سے مناظرے کرتا۔ میرزا صاحب کے دعویٰ
 نبوت سے پہلے کئی علماء اُس کے جوش مناظرہ کی حمایت کرتے اور ان کی تحریروں پر تحسین کرتے تھے۔ مولانا محمد حسین بناوی
 نے اپنے رسالہ ”اشاعت السنہ“ میں براہین احمدیہ کو اس صدی کا شاہکار قرار دیکر مرزا صاحب کو بے نظیر عالم دین
 اور صاحب کشف و کرامت لکھا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ سرسید نے بھی میرزا صاحب کے مناظرانہ جذبہ کو سراہا
 لیکن جوئی میرزا صاحب نے صریح موعود ہونے کا اعلان کیا، تو اس کا چہرہ سامنے آگیا۔ پچھلے باب میں عرض کیا ہے مولانا
 محمد حسین بناوی سینہ سپر ہو گئے اور مرزا صاحب کی جتنا شہ دے کی۔ تیسرا مسعود نے اپنے والد کے جو خطوط جمع کیے
 ان میں ۲۵۶ صفحوں پر ایک خط ہے جس میں سرسید لکھتے ہیں کہ میرزا صاحب کی تصانیف اس قسم کی ہیں۔ جیسا ان کا ہلام
 یعنی نبیوں کے کام کی دنیا کے کام کی بزرگانہ طرہ لیت ابھی اس فتنہ سے آگاہ نہ تھے۔ مثلاً ریاست بہاول پور میں چاروں
 کے مشہور بزرگ اور صوفی شاعر خواجہ غلام فریدی نے میرزا صاحب کے متعلق حسن ظن قائم رکھا۔ آپ نے فرمایا کہ ”یہ
 شخص حمایت دین میں کمر بستہ ہے۔ علماء تمام مذاہب باطلہ کو چھوڑ کر اس نیک آدمی کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں
 حالانکہ وہ اہل سنت والجماعت ہے اور صراطِ مستقیم پر ہے۔“ (ملاحظہ ہوا اشارات فریدی) لیکن خواجہ صاحب
 کے پاس جوئی میرزا صاحب کی نئی کتابیں بھیجنی جن میں ان کے مہمانہ عقائد اور فطی و بدروزی نبوت کی راکمانی
 کے علاوہ صریح موعود ہونے کے دعویٰ کا اندراج تھا تو خواجہ صاحب نے میرزا صاحب سے بیزاری کا اظہار
 کیا اور علماء کی تائید کی مرزا صاحب نے اپنی کتاب ”انجام آتھم مطبوعہ ۱۸۹۰ء“ میں حضرت خواجہ صاحب کو اپنے
 مکتبہ میں و محضین کی فہرست میں شامل کیا، تاہم قادیانی مبلغین عوام کی بے خبری سے فائدہ اٹھاتے اور ان کے
 سامنے خواجہ صاحب کی پہلی عبارت کا حوالہ دیکر زور دیتے کہ ملک کے اتنے بڑے پیر بھی
 مرزا صاحب کی تحریری بیعت میں شامل ہیں۔ اس کا سادہ دل سامعین پر اثر ہوتا۔ عوام میں مگر اہی کے
 پھیلاؤ کا اندیشہ بڑھا، تو مولانا غلام محمد شیخ الجامعہ بہاول پور جویدنا مہر علی شاہ کے مریدین میں سے تھے کہ
 تحریک پر ملک کے علماء و مشائخ کا بہت بڑا اجتماع خواجہ صاحب کے مزار پر منعقد ہوا۔ اس اجتماع میں نہ
 صرف قادیانیت پر ضرب لگائی گئی، بلکہ میرزا صاحب کا پوسٹ مارٹم کیا گیا۔ میرزا صاحب اور ان کے

حواریوں کو یقین ہو گیا کہ علماء انہیں چاروں شانے چٹ کر رہے ہیں، تو انہوں نے بعض مشہور شائع کے نام سے اپنی تائید میں بیانات وضع کیے جن میں مولانا عبداللہ غزنوی رئیس اہلحدیث بھی شامل تھے۔ اسی طرح سیدنا مہر علیشاہ سے بھی ایک خانہ ساز جہد منسوب کیا کہ اپنے میرزا صاحب کے ایک مُرید سے کہا کہ انہیں قادیان کی طفسر سے عشق الہی کی مٹھنڈی ہوا آرہی ہے، سیدنا مہر علیشاہ نے اپنے حجرے میں آنکھیں بند کیے بحالت بیداری دیکھا کہ اُس حضرت صلی اللہ علیہ وسلم قعدہ کی حالت میں جلوس فرما رہے حضور سے چار بانٹ کے فاصلے پر پیر صاحب باادب بیٹھے ہیں لیکن میرزا غلام احمد اس جگہ سے دُور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طفسر پیٹھ کیے بیٹھا ہے۔ حضرت پیر صاحب قبہ نے سیفِ چشتیائی میں دجال کی صورت سے متعلق اپنے پھمن کا ایک خواب لکھا ہے کہ وہ مرزا صاحب سے بوہوشا بہت رکھتا تھا۔ میرزا صاحب نے اپنے مسیح موعود ہونے سے متعلق علماء و مشائخ کو خطوط بھیجے، تو حضرت پیر صاحب قبہ نے اردو میں شمس الہدایت فی اثبات حیاتِ مسیح لکھ کر مرزا صاحب کا طلسم پاش پاش کیا۔ اس میں کتاب و سنت سے واضح فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ موجود ہیں، وہ قیامت کے قریب زمین پر تشریف لائینگے۔ میرزا صاحب کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ وہ دفات پانگے اور مسیح موعود ہیں ہوں۔ اس کتاب سے قادیان میں تہلکہ مچ گیا اور تمام ملک کے حلقہ علماء میں اُن کے دعویٰ سچت کی وجہیاں بھر گئیں۔ حضرت قبہ عالم کی اس کتاب پر مولانا عبدالجبار غزنوی نے بے حد تحسین کی۔ مرزا صاحب کی حواسِ باطلگی کا یہ عالم تھا کہ حضرت پیر صاحب کے نام حکیم نور الدین سے ۲۰ فردری ۱۲۹۰ء کو خط لکھا، جس میں بارہ سوالات اٹھائے۔ باب یہ تھا کہ شمس الہدایت میں آپ مولویوں اور منطقوں کے رنگ میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔ اس میں صوفیوں کے مشرب کی ذرہ بھر جھلک نہیں۔ ان بارہ سوالوں کے جواب میں قبلہ پیر صاحب نے مہر کر آراء خط لکھا، جو مولانا حافظ محمد غازی نے بصورتِ اشتہار شائع کر دیا۔ ملک بھر کے علماء و فضلاء اس خط کی عبارت پر عرشِ عرش کراٹھے۔ مرزا صاحب کے متعقدین نے اس کا جواب دینے پر زور دیا، تو مرزا صاحب نے ترنگ میں اگر ۲۲ جولائی ۱۲۹۰ء کو ایک اشتہار کے ذریعے حضرت قبہ کو عربی میں تفسیر نوہیسی کے مقابلے کا چیلنج کیا۔ اس اشتہار کا مضمون نہایت گستاخانہ تھا۔ جن بیس لوگوں نے اس پر بطور گواہ دستخط کیے تھے۔ اُن میں حکیم نور الدین مولوی محمد علی، نواب محمد علی باہر کوٹہ، غلام علی ڈوٹی پسر منڈٹ پولیس جہلم اور بعض دوسرے لوگ بھی شامل تھے۔ اس اشتہار کے ساتھ ایک منیہ بھی شائع کیا گیا، جو منیہ الاسلام پریس قادیان میں چھپا اور ۲۰۲۶ء کے چودہ صفحات پر تھا۔ حضرت قبہ عالم کو اشتہار ۲۶ جولائی کی ڈاک سے ملا۔ آپ نے اسی روز جواب لکھوا کر اگلے روز روپنڈی سے

پھسویا اور مرزا صاحب کو بذریعہ جسٹریٹس بھیج دیا۔ اس جواب پر بین علماء نے بطور گواہ دستخط کیے۔ حضرت قبلہؒ نے اپنے اشتہار میں مرزا صاحب کے لاہور میں مباحثے کے لیے ۲۵ اگست کی تاریخ مقرر کی۔ حضرت قبلہؒ کی تائید میں پنجاب، سرحد اور دوسرے صوبوں کے بعض علماء و مشائخ نے بھی اپنے دستخطوں سے اشتہار جاری کیے کہ وہ ۲۵ اگست کو پیر صاحب قبلہؒ کے ہمراہ مباحثہ لاہور میں حاضر ہوں گے۔ مرزا صاحب تقریری مقابلہ سے فرار کر گئے اور تقریری مباحثہ کی تجویز کی۔ حضرت قبلہؒ عالم نے تحریری مباحثہ قبول کر لیا۔ ملک کے طول و عرض سے ہزار ہا مسلمان لاہور پہنچ گئے۔ حضرت قبلہؒ کے سوانح حیات "مختصر" میں لکھا ہے کہ مسلمانان لاہور نے اپنی روایتی مہمان نوازی کا حق ادا کیا۔ استقبالیہ کمیٹی بن گئیں۔ سراپیں، مسجدیں، مدرسے اور لوگوں کے گھر مہمانوں سے بھر گئے۔ لاہور کے بازاروں میں عوام کے ٹھٹھ سے میلے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ تمام اسلامی فرقوں کے راہ نما ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے۔ بقی، اصل حدیث اور اصل تفسیر ان کے علاوہ لاہور اور سیالکوٹ کے شیعہ مجتہدین نے بھی اس عہد حضرت قبلہؒ عالم کو اپنا قائد تسلیم کرتے ہوئے ان کے نمائندہ ہونے کا اعلان کیا۔ حضرت قبلہؒ عالم ۲۴ اگست کو گولڑہ سے لاہور پہنچے۔ آپ کے ہمراہ پچاس نامور علماء تھے۔ ان کے علاوہ پنجاب کے دوسرے تمام اضلاع سے مشائخ و علماء چلے آ رہے تھے۔ غرض پلیٹ فارم پر ہزار ہا انسانوں کا اجتماع تھا۔ وہ جلوس نکالنا چاہتے تھے، مگر آپ نے پسند نہ فرمایا۔ لیکن بحکم سے معافہ کرنے ہی میں کھڑے کھڑے دو گھنٹے صرف ہو گئے۔ آپ نے برکت علی محمد بن ہال اور اس سے ملحقہ عمارات میں قیام فرمایا۔ جہاں رات گئے ہمک عقیقت مندوں کا تانا باندھا رہا۔ مباحثہ کے لیے شاہی مسجد کا انتخاب کیا گیا۔ مرزا صاحب کی مخالفت کے لیے پولیس نے زبردست انتظامات کر رکھے تھے، لیکن میرزا صاحب کو نہ آنا تھا، نہ آئے، بلکہ عین وقت پر اعلان کر دیا کہ میں کسی قیمت پر لاہور آنے کو تیار نہیں۔ مولوی لوگ مجھے دعویٰ نبوت میں کاذب ثابت کرنے کے بدلے قتل کرنا چاہتے ہیں۔ مرزا صاحب کے اس اعلان سے خود قادیانی جماعت کو سخت مایوسی ہوئی۔ جو دہ مرزا صاحب کو لینے گیا تھا، اس کے بعض ارکان مرزا صاحب کی بیعت سے توبہ کر گئے۔ بعض مایوس ہو کر خانہ نشین ہو گئے، لیکن اس شکست فاش کے باوجود مرزا صاحب کے دو مریدوں مہراجن اور عبدالکریم نے لاہور میں حضرت کی موجودگی کے باوجود اشتہار شائع کیے جن میں مرزا صاحب کی کامیابی کا مفروضہ وضع کیا اور سرخی جہانی کہ پیر صاحب گولڑہ شریف نے امام آخر الزماں کے مقابلہ میں فرار کیا ہے۔ قادیانی امت کی اس دھمکانی سے لوگ سخت بیزار ہوتے اور انہیں یقین ہو گیا کہ میرزا صاحب جھوٹ بول کر زندہ رہنا

پاہتے ہیں۔ انہی آیام میں قادیانی جماعت کے ایک وفد نے حضرت قبلہ عالم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ آپ میرزا صاحب کے مباہلہ کر لیں۔ ایک اندھے اور ایک لنگڑے کے حق میں مرزا صاحب دعا کرتے ہیں۔ دوسرے اندھے اور اپنا سچ کے حق میں آپ دعا کریں جس کی دُعا سے اندھا اور لنگڑا ٹھیک ہو جائیں۔ وہ سچا ہے، اس طرح حق و باطل کا فیصلہ ہو جائے گا۔ حضرت قبلہ عالم نے جواب دیا کہ اگر مُردے بھی زندہ کرنے ہوں تو آ جاؤ۔ یہ جواب پا کر وفد چلا گیا۔ پھر کچھ پتہ نہ چلا کہ مرزا صاحب اور ان کے حواری کہاں ہیں؟ جب میرزا صاحب کی تعلیمات بہت بڑھ گئیں، تو حضرت قبلہ عالم نے اُن کی ”لہما“ شیعوں کا تجزیہ کرتے ہوئے دروہانی جیلغ کیے۔ ایک یہ کہ کاغذ پر قلم چھوڑ دو، سچا قلم خود بخود چلے گا۔ اور تفسیر قرآن لکھ دے گا۔ دوسرا یہ کہ حسبِ وعدہ شاہی مسجد میں آؤ، ہم دونوں اُس کے مینار پر چڑھ کر چھلانگ لگاتے ہیں، جو سچا ہو گا وہ نیچ جائے گا، جو کاذب ہو گا، مرجائے گا۔ مرزا صاحب نے جواب میں اس طرح چُپ سا دھی، گویا دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں۔

میرزا کے اس فراہ کی اس روداد کو ۵۹ علماء اور ۲۱ رؤساء نے اپنے دستخطوں سے شائع کیا۔ ان وقت تک کندیلا میں کرنل راجہ محمد عطاء اللہ خاں سابق سفیر کابل، چوہدری محمد سلطان خاں باریٹ لا، مرزا محمد نضر اللہ خان مجسٹریٹ درجہ اول لاہور، خلیفہ عماد الدین انسپکٹر مدارس، مرزا محمد ابراہیم قزلباش اور میاں الطاف حسین رئیس لاہور تھے۔ حضرت پیر قبلہ صاحب کو بڑے شرف واپس چلے گئے، تو مرزا صاحب نے اپنی افتاد طبع کے مطابق ۲۸ اگست ۱۹۰۸ء کو ایک اور اشتہار شائع کیا۔ اس میں تحریری مقابلہ کا اعادہ کرتے ہوئے آئیں بائیں شائیں کی۔ ایک دوسرے اعلان میں کہا کہ وہ تفسیر فاتحہ لکھ رہے ہیں۔ پیر صاحب بھی تفسیر فاتحہ لکھیں۔ اس کے بعد اگر اہل علم قسم کھا کر اعلان کریں کہ پیر صاحب کی تفسیر میری تفسیر سے بہتر ہے، تو میں اپنی طرف سے پانچ سو روپیہ بطور انعام پیش کروں گا۔ مرزا صاحب غلقتہ اس تمار بازی کے دعاوی تھے، اس اعلان کے بعد مرزا صاحب نے ”اعجاز المسیح“ کے نام سے سورۃ فاتحہ پر اپنی تفسیر شائع کی۔ تمام علماء و فضلاء اور عربی زبان کے اساتذہ اس پورچ نگاری پر حیران رہ گئے۔ مرزا صاحب کی تفسیر نہ صرف محاورہ عربی سے محروم، لغوی اور نحوی اغلاط سے مملو اور مسرودہ عبارت سے پُر ممتی، بلکہ خود غلط، املا غلط، انشاء غلط کا پلندہ تھا۔

مرزا صاحب نے اس تفسیر میں لکھا کہ ”یوم الدین“ سے مراد سچ موعود کا زمانہ ہے اور الحمد فی الاولی والاخرہ سے واضح ہوتا ہے کہ اس سے دُعا محمد مراد ہیں۔ احمد اول حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور احمد دوم مرزا غلام احمد قادیانی ہیں۔ مرزا صاحب کے مُردہ محمد احسن امر وہو می نے شمس الہدایت کے جواب میں ”شمس بازو لکھی۔“

حضرت قبلہ عالم نے اعجاز المسیح اور شمس بازغہ کے رد میں سیف چشتیائی لکھی، جو ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کا پورا حظ تو حضرات علماء و فضلا ہی اٹھا سکتے ہیں، لیکن اُردو و ان حضرات بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ کتاب کا حجم ۴۰۰ صفحات ہے۔ مولانا فضل حق پرنسپل مدرسہ عالیہ رامپور نے اس کتاب کے متعلق کہا تھا کہ یوں تو حضرت کے بہت سے کلمات بیان ہوتے ہیں، لیکن میں تو اس دماغ کا شہید بنائی ہوں جس سے سیف چشتیائی نمودار میں آئی ہے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنی تفسیر بیان العسکران میں سیف چشتیائی سے متعلق لکھا ہے کہ حیاء موت عیسوی کی بحث میں سیف چشتیائی قابل مطالعہ ہے۔ علامہ انور کا شیری علیہ الرحمۃ نے اپنی کتاب عقیدۃ الاسلام فی حیوۃ عیسیٰ علیہ السلام کے ویباچہ میں سیف چشتیائی کو مسئلہ حیات مسیح پر ایک بہترین تحریر قرار دیا ہے لیکن میرزا صاحب نے لکھا کہ پیر صاحب گورڈہ شریف نجیٹ ہیں اور ان کے منہ سے جو کچھ نکلتا ہے، نجیٹ ہے۔ (معاذ اللہ)

میرزا صاحب گالیوں کے پیغمبر تھے۔ ان کے دو ہی شعار تھے۔ اپنے علمی حریفوں کو گالی دینا اور انگریزی حکام سے ان کی مجزی کرنا کہ وہ سلطنت برطانیہ کے بدخواہ ہیں۔ حضرت قبلہ پیر صاحب کی بدولت مرزا صاحب جمہور المسلمین میں رُسا ہو گئے اور مسلمانوں کے دلوں پر ان کی تکلیف نقش ہو گئی۔ یہ مرزا صاحب کے لیے ایک حادثہ عظیم تھا۔ وہ اب تک علماء کی مزاحمت کے باوجود مسلمانوں میں اپنے عقائد سے نعت لگا رہے تھے لیکن پیر صاحب قبلہ کی بدولت مسلمانوں میں ان کے لیے کوئی جگہ نہ رہی۔ اِلا ان گھرانوں کے جو ان کے فریب کا شکار ہو چکے تھے یا حکومت کی ضرورتوں نے ان کے گرد انہیں جمع کر دیا تھا اور وہ اس طرح سرکاری فوائد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مرزا صاحب نے علماء و مشائخ کے خلاف بکنا شروع کیا۔ پیر صاحب کے خلاف ایک ہجو نیز نظم لکھی۔ اس کے دو شعروں کا ترجمہ مولانا سید ابوالحسن ندوی نے اپنی کتاب ”قادیث“ کے صفحہ ۴۷ پر اعجاز احمدی صفحہ ۵۷ سے نقل کیا ہے۔ مرزا صاحب نے لکھا ہے:

”پس میں نے کہا کہ اے گورڈہ کی زمین تجھ پر لعنت، تو ملعونوں کے سبب ملعون ہو گئی۔ پس تو قیامت کو ہلاکت میں پڑے گی۔ اس فرومایہ نے کینہ لوگوں کی طرح گالی سے بات کی ہے اور ہر ایک آدمی خصوصیت کے وقت آزمایا جاتا ہے“

میرزا صاحب کو گالی کہنے پر ٹوٹا گیا تو ازالہ ادبام میں لکھا کہ قرآن مجید میں گالیاں بھری ہوئی ہیں۔

اس طرح مرزا صاحب کا حقیقی چہرہ لوگوں کے سامنے آ گیا۔ ازالہ ادہام ہی کے صفحہ ۱۲۸ پر لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ اللہ علیہ وسلم نے سورہ الزلزال کے معنی غلط سمجھے لیکر ہم کی موت سے متعلق ایک اشتہار میں لکھا کہ قرآن خدا کی کتاب اور میرے منہ کی باتیں ہیں۔ ازالہ ہی میں لکھا کہ انبیاء علیہم السلام جھوٹے ہوتے ہیں۔ (صفحہ ۲۲۸، ۲۲۹) اسی کے صفحہ ۶۸۸ اور ۶۸۹ پر لکھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی بھی غلط نکلی۔ مزید فرمایا کہ ان کی اپنی تصنیف برہن احمدیہ خدا کا کلام ہے (صفحہ ۵۳۲) قسطنطنیہ شریف میں جو معجزے ہیں، وہ سب مزیم ہیں۔ (صفحہ ۴۸، ۵۱ تا ۵۱۵) مکہ مدینہ اور قادیان کا نام قسطنطنیہ شریف میں اعزاز کے ساتھ لکھا ہوا ہے (صفحہ ۶۶، ۷۷) قادیان کا بیت الفکر مثل حرم کعبہ ہے (صفحہ ۵۵۸) رسول اکرم خاتم النبیین والمرسلین نہیں ہیں (صفحہ ۴۲۲، ۴۲۱) قیامت نہیں ہوگی، تعذیر کوئی چیز نہیں (ازالہ ادہام سرورق صفحہ دوم) غلاب قبر نہیں ہے (صفحہ ۴۱۵)

قبلہ پیر صاحب نے مرزا صاحب کے ان ملفوظات کو اشتہارات کے ذریعہ علماء و مشائخ تک پہنچا دیا۔ تمام لوگ جو مرزا صاحب کے حق میں رکھتے تھے، ان غزوات کو پڑھ کر ششدر رہ گئے اور انہیں یقین ہو گیا کہ مرزا صاحب آئمہ تبیس کے سلسلہ کا ایک فرد ہے اور اس کے دعویٰ اسلام کو سبوتاژ کرنے کی ایک خوفناک حرکت ہے۔

میرزا صاحب کو یقین ہو گیا کہ مسلمانوں میں اب ان کا چراغ نہیں جل سکتا، تو اپنے لہانہ حربے کی پناہ لی اور لکھا کہ پیر گوردہ شریف ان کی زندگی ہی میں موت کا شکار ہو جائیں گے لیکن میرزا صاحب اپنے پیروؤں کے خاص حلقے میں اس قسم کی تعلیمات بانٹنا ہی کرتے تھے۔ ہوا یہ کہ میرزا صاحب ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو لاہور میں اپنے ایک معتقد کے بیت الخلاء میں دم توڑ گئے اور پیر صاحب قبلہ مرزا صاحب کی لہانہ لیکن ایسا نہ پیش گوئی کے باوجود مزید ۱۵ دن کم ۲۹ سال زندہ رہے۔ آپ کا وصال ۱۱ مئی ۱۹۰۸ء کو ہوا۔ اس دوران میں قادیانی اپنے کھونٹے سے بندھ چکے اور ان کے چہرے کی تمام نقائیں اتر چکی تھیں۔ حضرت مہاجر کی علیہ الرحمۃ نے پیر صاحب قبلہ سے کہا تھا کہ آپ کے دہاں ہونے سے فتنہ سر نہیں اٹھا سکے گا۔ میرزا غلام احمد کو حضرت پیر صاحب نے اُڑنے پر لا کر ایسی چٹنی دی کہ مرزا صاحب اس کے بعد چیت ہو کے رہ گئے، حتیٰ کہ پانچ چھ برس ہی میں اس سال کا شکار ہو کر

۱۔ مہر نیر حضرت سید مہر علی شاہ کے سوانح حیات ہیں۔ بولت ہیں مولانا فیض احمد صاحب فیض جامعہ غوثیہ گوردہ شریف کتاب کے صفحات

مرض الموت کی نذر ہو گئے۔ میرزا نیت کی تبلیغ کا ہر دروازہ بند ہو گیا۔ قادیانی امت سے تین کروڑ پنجابی مسلمانوں میں دو ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ نہ ہو سکی اور وہ بھی چالیس پتالیس برس میں اس تعداد کو پہنچی۔ واضح رہے کہ مرزائیوں نے مسلمانوں کے اس مطالبہ پر کبھی صاف نہیں کیا کہ اپنی مردم شماری کرائیں، کیونکہ اس طرح ان کا پرہ چاک ہوتا تھا۔ دوسرے صاحب قبلہ کے روحانی تصرفات تھے کہ میرزا صاحب کی موت کے بعد مرزائیت کا مذہبی سانچہ کسر ٹوٹ گیا۔ جن گمنے چٹنے لوگوں نے قادیانیت قبول کی وہ اسلام سے ناجلد، معاشی ضرورتوں کے تابع اور عقل کی طاعون کا شکار تھے۔ میرزا صاحب کے فرزند میرزا بشیر الدین محمود نے یہی چین اختیار کیا کہ اپنی جماعت کی مذہبی چھاپ کو برقرار رکھا اور ایک ایسا سیاسی گروہ پیدا کیا جو برطانوی ضرورتوں کی چاکری میں منفرہ ہو۔ میرزا محمود نے اس غرض سے ان تمام مسلمانوں کو جو ان کے والد کو نبی نہیں مانتے تھے اپنے والد کی طرح کافر قرار دیا۔ اور ان سے بطور مسلمان ہر سہ روی غم کر دی پہلی جنگ عظیم میں مسلمانوں کی شکست پر چرغاں کیا۔ قادیانی امت نے دنیائے اسلام میں برطانوی عملداری کی خاطر جاسوسی کے فرائض سنبھال لیے۔ ہندوستان کی اسلامی سیاسیات میں انگریزوں کی منشاء کے مطابق کام کیا۔ کئی ایک قادیانی جن کا میرزا بشیر الدین محمود کی مصلحتوں کے نزدیک ہندوستان میں رہنا ضروری تھا۔ وہ سی۔ آئی۔ ڈی سے منسلک ہو گئے۔ میرزا بشیر الدین نے خلیفہ ثانی کی حیثیت سے اپنا سفر مارچ ۱۹۱۴ء میں شروع کیا اور یہ جنگ عظیم اول کا زمانہ تھا۔ انگریزوں کو خلافت عثمانیہ کو تنہا کرنے کے لیے جن مہموں کی ضرورت تھی، میرزا بشیر الدین محمود نے ایک مسلمان کے روپ میں، اس ضرورت کو پورا کیا۔ عربوں کو ترکوں کے خلاف بھڑکانے میں ان کے دو سالوں، زین العابدین دلی اللہ اور محمد حبیب نے سکاٹ لینڈ ریلوے کے حسب ہدایت نہایت جانفشانی سے کام کیا۔

مولانا ظفر علی خاں حیدر آباد سے علیحدہ ہو کر اپنے گاہل کرم آباد چکے تھے۔ انہوں نے اپنے والد کی رحلت کے بعد یکم جنوری ۱۹۱۰ء سے زمیندار کی اداوت سنبھالی، تو جنگ کے آغاز تک گاہے گاہے قادیانیت سے پھیر چھاؤ کرتے رہے۔ زمیندار جون ۱۹۱۵ء تک نکلتا رہا۔ پھر سرائیکل اڈا اترنے بند کر دیا۔ مولانا نے ۱۹۱۶ء میں علی دادی بنیادوں پر ہفتہ وار ستارہ صبح شائع کیا جو پہلے کرم آباد سے نکلتا تھا، پھر لاہور سے روزنامہ ہو گیا۔ مولانا نے قادیانیت کا محاسبہ اس سختی سے کیا کہ میرزا بشیر الدین محمود اور ان کے زلخوار بدحواس ہو گئے۔ میرزا بشیر الدین محمود سرائیکل اڈا اتر کر خفیہ خط لکھا۔ وہ حیدر آباد دکن ہی سے مولانا کا مخالفت تھا۔ اس کے عداوتے آتا کہ مولانا کو پنجاب چھوڑ کر دوبارہ حیدر آباد جانا پڑا۔ ستارہ صبح بند ہو

ہو گیا۔ جنگ اول ختم ہوئی، نومبر ۱۹۲۰ء میں زمیندار کو دوبارہ ڈیکریشن ملا اور قادیانی، زمیندار کا متعلق موضوع ہو گئے۔ مولانا قید و بند سے باہر ہوتے تو قادیانیت کے شرعی اقلے تعلقوں پر تابڑ توڑ حملے کرتے اور مرزائی امت کے اعمال و افکار کی اس بُری طرح خبر لیتے کہ انہیں مسلمانوں کے گرد و پیش سانس لینا مشکل ہو جاتا۔ مولانا نے چند برسوں ہی میں قادیانی مسئلہ کو عوامی تحریک بنا دیا۔ ادھر احرار رہنا اپنی دینی افتاد کے باعث شروع ہی سے قادیانیت کے محاسب تھے۔ ادھر تحریک کثیر ختم ہوئی، تو مجلس احرار نے قادیانی مسئلہ ہاتھ میں لے کر قادیانی امت کو ایسا بے نقاب کیا کہ اس کا خواب و محو و حرام ہو گیا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری قادیانیت کے پلے گزرا ہر دشمن تھے۔ علامہ اقبال نے مئی ۱۹۲۵ء میں قادیانیت کے قلعہ پر آخری ضرب لگائی۔ کہ ملی دنیا میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔ اور وہ افریخ زدہ مسلمان جو مسئلہ ختم نبوت سے بے خبری کے باعث قادیانیوں سے مرتد برتتے تھے، ان سے ذہنی طور پر بیزار ہو گئے۔ علامہ اقبال نے پنڈت جواہر لال نہرو کے جواب میں قادیانیت پر جو کچھ لکھا وہ اس قدر جامع و مانع تھا کہ مولانا عبد الحمید سائیکس کے الفاظ میں محالاً کہ وہ قادیانیوں کے بارے میں روادار تھے کسی سے ان ملی نکات کا جواب نہیں ہو سکا۔ (ذکر اقبال ص ۲۱۱) اور نہ ان نکات کا جواب میرزا نیت کے بس میں تھا۔

اور یہ سب کچھ پیر صاحب قبلہ کی زندگی میں ہوا۔ واضح رہے کہ حکومت نے مولانا ظفر طیناں کے خلاف جب بغاوت کے الزام میں حضور ضلع کھیل پور میں ایک تقریر کی بنا پر مقدمہ چلانے کا ارادہ کیا تو سید لال شاہ پنڈت پولیس نے استغاثہ کے گواہوں میں پیر صاحب قبلہ کا نام لکھوایا، لیکن پیر صاحب نے سرکار کی خواہش و احرار کے باوجود گواہی دینے سے انکار کر دیا اور محل شاہ سے کہا، آپ نے میرا نام دینے کی جرأت کیونکر کی؟ ظفر طیناں حضور ختم المرسلین کا شہیدانی ہے اور قادیانیت کے حصار کو توڑ رہا ہے، آپ اسے قید کرنا چاہتے ہیں۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے پہلی بیعت پیر صاحب قبلہ ہی کے دست مبارک پر کی۔ اور اپنے بیٹے سحر بیانی کی خواہش و استدعا کی۔ پیر صاحب قبلہ نے آپ کو ایک درو بتایا، جو آپ ہر تقریر سے پہلے زیر لب پڑھتے۔ پھر تقریر شروع کرتے اور مجمع ان کی مٹھی میں ہوتا۔

علامہ اقبال نے قادیانی مسئلہ پر علامہ انور شاہ نور اللہ مرقدہ کے علاوہ حضرت پیر صاحب قدس سرہ کو بعض مسائل سے آشنائی کے لیے خطوط لکھے۔ قادیانی میرزا صاحب کی نبوت کے لیے جن مسلمان امت کے مخطوبات کا سہارا لیتے۔ ان میں محی الدین ابن عربی سر فہرست تھے۔ ابن عربی نے فتوحات مکیہ میں لکھا ہے کہ ایک مسلمان ولی کے لیے بھی روحانی ارتقاء کے دوران میں ایسے تجربات ممکن ہیں جنہیں صرف شعور نبوت سے

مختص مانا جاتا ہے۔ ”لیکن فتوحات کبیر“ میں کئی مقامات پر شیخ محمد الدین ابن عربی نے تصریح فرماتی ہے کہ اس حضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شخص پر نبی یا رسول کا اطلاق ممکن ہی نہیں۔ ملاحظہ ہو سیف چشتیانی صفحہ ۳۲۶۔ لیکن
مرزا صاحب تحریف کے حامی تھے جس کی تحریف قرآن و حدیث بذبح سکے۔ اس کے سامنے فتوحات کبیر کیا چیز تھی۔
پیر صاحب ابی عربی کے فلسفہ پر کامل نگاہ رکھتے اور اس سلسلہ میں اپنی نظیر آپ ہی تھے۔ علامہ اقبال نے قادیانیوں کی
متذکرہ پانچ کے بارے میں آپ سے استفادہ کے بعد اپنے بیان میں اس کی کاٹ کی۔ غرض پیر صاحب نے سوال
فرمایا تو اس وقت ہم کس لکھنؤ نے قادیانیوں کو عملاً الگ کر دیا تھا اور مختلف محاذوں پر تحریک ختم نبوت کے
سرخیل مولانا ظفر علی خان، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور علامہ اقبال تھے۔ ہر سہ کو حضرت پیر علی شاہ صاحب کے بالواسطہ
بلواسطہ فیض پہنچا تھا۔ حضرت پیر صاحب نے میرزا غلام احمد کو کچھ پاڑا۔ ان ہر سہ کا برلے اس کے بیٹے میرزا
بشر الدین کو اس طرح چٹخا کہ قادیانی امت نہ صاحبان بلب ہو گئی۔

سیدنا مہر علی شاہ قدس سرہ العزیز کے بعد آپ کے فرزند تید غلام محمد الدین شاہ جانشین ہوئے۔
آپ نے تعلیم و تربیت کے علاوہ اپنے یگانہ عصر والد قدس سرہ کی نگاہ سے فیض حاصل کیا اور ایقان و عرفان
کی منقوشانہ منزلیں طے کی تھیں۔ آپ کو اعلیٰ حضرت نے بابو جی کہہ کر مخاطب کیا تو خانوادہ طریقت میں اسی لقب
سے معروف ہو گئے۔ راقم کو آپ سے سولہ برس نیاز رہا۔ آپ نے ۱۳۵۹ھ میں حرمین شریفین سے واپسی پر
راقم کے فریب خانہ کو اپنے قدمِ مینت لزوم سے سرفراز کیا۔ اس دن سے آپ کے معال جون ۱۳۵۹ھ تک احقر
کو آپ سے قربت کا شرف حاصل رہا۔ ہر چیز قربت کے شٹل کھودیتی ہے۔ لیکن آپ کا وجود فی الواقعہ معرفت
حق کا خزینہ تھا۔ آپ سے قرب ارادت پیدا کرتا اور محسوس ہوتا کہ اللہ کی زمین پر معجزۃ الہی ہیں۔ آپ بلاشبہ ایک
ولی اللہ اور جو دوسرا کے انسان تھے۔ آپ کے وجود میں وہ تمام اوصاف تعجب نظر آتے جو قرونِ اولیٰ میں
معصیت یافتگان رسالت کی خصوصیت تھے۔ آپ ملائق دنیا سے اس حد تک بے نیاز تھے کہ آپ کو معلوم
ہی نہ تھا، دنیا کیا ہے اور اس کے شب و روز کیا ہیں؟ فیلڈ مارشل ایوب خان نے اقتدار سنبھالا اور
دارالحکومت راولپنڈی لے گئے، تو آپ سے رابطہ پیدا کرنا چاہا۔ اپنا سیکرٹری بھیج کر آپ کو یاد کیا۔ راقم
بھی وہیں تھا۔ صدر ایوب کی طرف سے سیکرٹری نے اخلاص کا اظہار کیا اور پیغام دیا کہ صدر آپ سے ملنے کے متمنی ہیں
اور مجھے اسی غرض سے۔ آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔ قبر مدارت کو شرف بخشئے۔ آپ نے بتھانے
نعم الامیر علی باب الفقیر و بس الفقیر علی باب الامیر یعنی بہتر امیر وہ ہے جو فقیر کے در پر بجائے اور برافقیر

وہ ہے جو امیر کے در پہ حاضر ہو۔ فرمایا میرا معاملہ اپنے رب سے ہے۔ مجھے ملاقات سے معذور رکھیں تو بہتر ہے۔

اربابِ اقتدار سے میل ملاپ اور اس طرز کی راہ و رسم نہ میرے مشائخ کا مشرب رہا ہے اور نہ میرا مسلک ہے۔ صدر کے سیکرٹری چلے گئے۔ پھر ان سے لاہور لے، اگلی ملاقات کراچی میں کی، لیکن بابو جی کا فقر و استغناء اس رفعت پر تھا کہ اپنے فیصلہ پر قائم رہے۔ فرمایا کہ اقتدار اور فقراء اکٹھے نہیں ہو سکتے، غالباً اس انکاری کا نتیجہ تھا کہ ایوب خاں نے اپنے لیے ایک پیر پیدا کیا، جو طرقت کے سجادہ پر ان کی سیاست کا ترجمان تھا۔ اس چیز نے راقم کو اس قدر متاثر کیا کہ تاریخ اسلام کی وہ صدائیں یاد آگئیں جنہیں پڑھ کر حیرت ہوئی کہ فی الواقعہ جلال و استبداد سے فقر و استغناء نے اس طرح خطاب کیا تھا؟ اور اب راقم دیکھ رہا تھا کہ بابو جی ان صدائوں کی ترست پھرت تصویر ہیں۔ بابو جی سیاسی انسان بالکل ہی نہ تھے۔ ان کا وجود ایک دینی تحریک تھا۔ وہ نگاہ کرتے اور انسان اپنے اندر ایک انقلاب محسوس کرتا۔ وہ باتِ حیات کے انسان نہ تھے۔ ان کا ختم نبوت کے مسئلہ سے موردی تعلق تھا۔ اس غرض سے شخص کسی تحریک، تنظیم یا مقرر میں شامل نہ ہوتے، لیکن سفر و حضر میں دعا گو رہتے۔ ۱۹۵۳ء کی تحریک میں علماء و علماء کی کجی کے لیے لاہور میں مجلس مشاورت کا اجلاس ہوا، تو آپ پہل دفعہ مدعوین کی زبردست خواہش پر تشریف لاتے۔ آپ کا فیصلہ انشائیہ تھا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری آپ سے کچھ دیر بعد تشریف لائے اور اگلی صفت کی ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ کسی نے کہا شاہ جی! وہ اُدھر بھیجے حضرت صاحبزادہ محی الدین شاہ گولڑہ شریف فرکش ہیں، شاہ صاحب نے پٹ کر بھیج دیا۔ فوراً آگے بڑھے۔ آپ کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔ مجھ تک گئے، کہنے لگے حضرت آپ آگئے، بحمد اللہ! ہماری نصرت قریب ہو گئی ہے۔ میرے سامنے اعلیٰ حضرت ہیں۔

ہم تو انہی کا من لے کر چل رہے ہیں۔ شاہ جی نے دعا کرائی، بابو جی نے دعا کی۔ بابو جی ہی کا فیضان تھا کہ مسلمانوں کے مختلف مکاتیب فکر، جو بعض فروغی جمیوں کے باعث کبھی اکٹھا نہ ہوتے تھے۔ اس تحریک میں اکٹھے ہو کر قادیانیت سے ٹکرا گئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس تحریک میں دیوبندی، بریلوی، حنفی، اہلحدیث اور شیعہ ایک ہو کر قادیانیت کے خلاف متحد العمل ہوئے۔ حضرت بابو جی اس وقت کے مقتصدین، ملک غلام محمد گولڑہ جرنل، خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم اور میاں مشتاق احمد گورمانی وزیر داخلہ سے بھی ملے۔ انہیں مسلمانوں کے جذبات اور مسئلہ ختم نبوت کی اہمیت سے آگاہ کیا اور اسیرانِ تحریک کی مشکلات کے ازالہ پر توجہ دلائی۔ راقم کو شرفِ معنی ۱۹۶۸ء میں فیلڈ مارشل ایوب خاں کی ہدایت پر جرنل موسیٰ گورز مغربی پاکستان نے ڈیفنس آف پاکستان روز کے تحت بلا میعاد نظر بند کیا۔ ہفتہ مارچان کا ڈیکلریشن منسوخ کر ڈالا اور چٹان پریس ضبط کر لیا۔ اس

کی تفصیلات چنان کے تذکرہ میں بیان ہوگی۔ مختصر یہ کہ گورنر موسیٰ راقم کو مروا دینے پر ٹل گیا۔ اس نے منصوبہ تیار کیا کہ شورش کو ڈیرہ ہٹیل خاں سے کراچی منتقل کرتے وقت بنوں کے راستے میں مروا دیا جائے۔ اس غرض سے ایک قادیانی انپیکٹر پولیس کو قادیانی سپاہیوں کے ساتھ مقدمہ کیا گیا۔ اس کا انکشاف ایک بہت بڑے پولیس افسر نے جولائی ۱۹۴۳ء میں راقم سے مری میں کیا۔ اس پولیس افسر سے ملاقات کا باعث حضرت بابو جی قدس سرہ تھے اور وہ غالباً آپسے بیعت تھے۔

ان دنوں بابو جی قدس سرہ نے راقم کے بچوں کو اپنی شفقتوں میں شریک کیا: "حقیر کی اہلیہ نے آپ سے عرض کیا۔ حضور رحمت اللعالمین کے صدقہ میں اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم شریک حال ہے، کوئی تردد نہیں۔ نہ کسی چیز کی احتیاج ہے۔ صرف اپنی دعاؤں میں شریک کر لیں۔ ہماری واحد ضرورت یہی ہے۔" فرمایا: "مجھے تو اٹھنرت کا حکم ہے میں اُن کے ارشاد کی تعمیل کر رہا ہوں۔ بفضل تعالیٰ شورش ہر بلا سے محفوظ رہے گا۔ اعلیٰ حضرت کی اُس پر نگاہ ہے۔"

بابو جی نے ۱۹۶۸ء سے لے کر اپنے وصال ۱۹۷۴ء تک ہمارے مؤدبانہ اعراض و انکار کے باوجود اپنا تلف جاری رکھا۔ فرماتے، "شورش ختم نبوت کا سپاہی ہے اور ہم اس کے دعا گو ہیں۔"

راقم نے حکومت کی دھاندلی سے تنگ آکر کراچی کے ایامِ نظر بندی میں ۴۵ روز جھوک ہڑتال کی۔ اس دوران میں حالتِ شہ سے سختہ ہوتی گئی۔ نوبت براہینِ رسید کہ صبح و شام کا معاملہ ہو گیا۔ کسی وقت بھی سادنی آ جانے کا احتمال تھا۔ ایوب خاں اور موسیٰ خاں راقم کو موت کی نیند سُلا دینا چاہتے تھے۔ پنتا لیسویں روز حالت تشویشناک ہو گئی۔ مولانا تاج محمود مدیر لولاک نے اکابر کو اطلاع دی۔ ملک کے طول و عرض سے راقم کے نام نہاؤں کا آنا بندھ گیا۔ جھوک ہڑتال چھوڑ دو۔ اُس روز دس بجے شب کے لگ بھگ حافظ عزیز الرحمن تشریف لاتے اور فرمایا کہ "میں لاہور سے مختلف راہِ نمائش کا پیغام آیا اور دین پور شریف سے حضرت مولانا عبدالہادی نے سنا دیا ہے۔ ایک اور تار حضرت عبداللہ درخواستی کا ہے کہ جھوک ہڑتال چھوڑ دو۔ تمہاری زندگی ضروری ہے۔" راقم نے حافظ جی کو نال دیا کہ صبح سوپیں گے۔ وہ چلے گئے۔ راقم تین بجے سو گیا۔ اذان کے وقت خواب دیکھا کہ جنت الفردوس کی ایک رکش پر بیتنا مہر علیشاہ قدس سرہ العزیز، علامہ انور شاہ نور اللہ مقدس اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری

کھڑے ہیں۔ راقم کے شانہ کو ان کے مقدس ہاتھ نے تپسکی دیتے ہوئے کہا:
 ”شورش گھبرانہیں، آخری سچ تمہاری ہے“

جب دن چڑھے راقم کو جگایا گیا تو پانچ منٹ کی طٹ پر فیسر ڈاکٹر افتخار احمد، کمشنر کراچی اور سپرنٹنڈنٹ جیل کھڑے تھے۔ جیمز آپس میں کانامچھوسی کر کے چلے گئے۔ راقم ایک جاں بلب مرلیض کی طرح تھا۔ ایسا ایسی دوبارہ آنکھ لگ گئی۔
 پروفیسر ڈاکٹر افتخار احمد گورنمنٹی سے ملکر لوٹے۔ جیمز کے جگایا۔ کہنے لگے... ”مبارک ہو، آپ کو حکومت نے رہا کر دیا۔ پولیس چلی گئی۔ اب آپ آزاد ہیں“ اس کے بعد انہوں نے انجکشن لگانا شروع کئے اور رات کے آغاز تک انجکشن دیتے رہے۔ اس کے بعد راقم نے ۱۹۶۸ء سے ساتھ رہوہ تک تنہا قادیانی امت کا سیاسی محاسبہ جاری رکھا۔ بابو جی قدس سرہ نے راقم کو صبح شام کی دُعاؤں میں شریک کر لیا۔ آپ کے روحانی تصرفات کا فیضان تھا کہ راقم کا قلب مضبوط ہوتا گیا۔ پھر جب جون ۱۹۶۴ء سے تحریک کا فیصلہ کن دور شروع ہوا، تو حضرت بابو جی نور اللہ مرتدہ مرض الموت کے زمرہ میں تھے، لیکن آپ کے معمول میں کوئی فرق نہ تھا۔ آپ کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ اللہ واسلے ہی ہوتے ہیں۔ راقم نے وصال سے چند دن پہلے نیاز حاصل کیا، تو فرمایا:

”جَدِّ جَمَدِ کیے جاؤ، تیمجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے“ پھر خاموش ہو گئے۔ چہرہ مبارک دمک رہا تھا۔ فرمایا:۔ ”اب مسئلہ طے ہو کے رہے گا، نصرت آپ کی ہے۔ میں اعلیٰ حضرت آپ کی ہے۔ پاس جا رہا ہوں۔ اُن سے عرض کروں گا۔ آپ نے جس پودے کی آبیاری کی تھی، وہ پھیل لے آیا ہے۔“

مولانا ظفر علی خاں نے سیاسی احتساب کا آغاز کیا

مولانا ظفر علی خاں نے قادیانیت کے سیاسی اور عوامی محاسبہ کی نیواٹھائی۔ آپ نظام دکن کی ملازمت سے علیحدہ ہو کر پنجاب آئے، تو یہاں آپ کے والد ماجد مولوی سراج الدین احمد سخت علیل تھے۔ ان کا ۶ دسمبر ۱۹۰۹ء کو انتقال ہو گیا۔ آپ نے یکم جنوری ۱۹۱۰ء سے ”زمیندار“ کی ادارت سنبھالی۔ ان دنوں میرزا غلام احمد کے فتنہ کا شہرہ صرف پنجاب میں تھا۔ یا پھر ایک طرف دہلی اور دوسری طرف پشاور کے دینی حلقوں میں ذکر اذکار تھا۔ میرزا غلام احمد ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو رحلت کر گئے۔ حکیم نور الدین خلیفہ اول قرار پائے۔ وہ ۳ مارچ ۱۹۱۳ء کو وفات پا گئے۔ میرزا بشیر الدین محمود خلیفہ ثانی بنے وہ میرزا غلام احمد کے فرزند مزبور تھے لیکن کسی دینی بصیرت کے مالک نہ تھے۔ انہوں نے اپنے گرد ایک ایسا مذہبی گرو جمع کیا جو عیار و ہوشیار تھا اور ان کے حسب مشافادہ قادیانیت کے مہمانہ سانچے تیار کرتا۔ میرزا محمود خلیفہ سیاسی ذہن کے انسان تھے۔ انہوں نے اپنی جماعت کے بعض سیاسی شاطروں سے تربیت حاصل کی۔ پھر اسپٹوین کی حیثیت سے نشوونما پا کر کرنل لارنس کا بروز ہو گئے۔ انہیں خلافت پر فائز ہوتے ہی ایک ایسا زمانہ ملا کہ پہلی جنگ عظیم کا سر آغاز تھا۔ انگریزوں کو خلافت عثمانیہ کے خلاف اس قسم کے مسلمان درکار تھے، جو ترکوں اور عربوں میں ان کے حسب منشاء کام کریں اور وہ کسی مذہب کا شکار نہ ہوں۔ انہیں یہ خیال نہ ہو کہ وہ کسی مسلمان ملک یا کسی مقدس خطے میں ایک نصرانی طاقت کے آلہ کار ہیں۔ میرزا بشیر الدین اس غرض سے موزوں آدمی تھے۔ ایک

تو وہ عقیدہ تمام مسلمانوں کو کافر سمجھتے تھے۔ دوسرے انہوں نے اعلان کر دیا تھا کہ برطانوی حکومت ان کے نزدیک انعام الہی ہے اور جو اس کا بدخواہ ہے، وہ حلال زادہ نہیں۔ میرزا محمود نے اپنے معتمدوں کی ایک ٹیم انگریزوں کے حوالے کی جو ترکی کے علاوہ جزیرۃ العرب کے مختلف ملکوں میں برطانوی سلطنت کی آواز کا رہو گئی۔ اس طرح میرزا بشیر الدین محمود کو اپنی خلافت کے لیے ایک اچھا موقع مل گیا۔ انہیں ایک چھوٹا سا اختلاف پیش آیا کہ مولوی محمد علی ان سے علیحدہ ہو کر لاہوری جماعت قائم کی اور میرزا غلام احمد کے متعلق اعلان کیا کہ ان کا دعویٰ نبی ہونے کا نہیں تھا۔ وہ مجدد تھے۔ مولوی محمد علی کی ناراضی کا اصل سبب یہ کہ وہ حکیم نور الدین کے بعد خلیفہ ہونے کے متمنی تھے۔ میرزا بشیر الدین محمود کا خلیفہ ہونا ان کے لیے المیہ تھا۔ وہ دل براشتہ ہو کر الگ ہو گئے اور لاہور آ کر انجمن احمدیہ کی بنا ڈال، لیکن ان کا باہمی تنازعہ انگریزوں کے لیے کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔ دونوں ان کے معینی سمجھے جاتے تھے میرزا محمود نے پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء کے دوران میں یہ فائدہ اٹھایا کہ ان سے متعلق منبر و محراب کا اعتبار ٹھیکہ داروں نے عامۃ المسلمین کا دایہ نیت کے سیاسی مضمرات سے نا آشنا تھے۔ جنگ ختم ہوئی تو ملک سیاسی حالات عدم تعاون اور ترک توالات کی طرف چلے گئے۔ قادیانیت کا محاسبہ کیوں کر ہوتا؟ اس بارے میں کسی نے غور ہی نہ کیا۔ تحریک عدم تعاون کا شعلہ کھلا گیا، تو انگریزوں کی مہر بازی نے ہندو مسلم فسادات پیدا کیے جن عناصر نے ان کی نیواٹھانے میں باطنی حصہ لیا، ان میں میرزا بشیر الدین محمود پیش پیش تھا۔

فسادات بدعہ پڑ گئے، تو لاہور کانگریس ۱۹۲۹ء تک فرقہ دار حقوق کا سند بھڑکتا رہا اور یہ قادیانی امت کے لیے عافیت کا حصار تھا۔ اس سے متعلق نہ کوئی عوامی تحریک تھی اور نہ عامۃ المسلمین، اس کی مختلف معضلوں سے آگاہ تھے۔ کانگریس نے ۱۹۳۱ء میں نمکین سینہ گرہ شروع کیا، تو قادیانی مسلمانوں کے اجتماعی اعتبار سے محفوظ تھے۔ میرزا بشیر الدین محمود مسلمانوں کو اسلام سے خارج قرار دے کر اپنے والد کے پیروؤں کو مسلمان گردانتے تھے، لیکن جب انگریزی حکومت کا اشارہ ہوتا، تو ہندوستانی مسلمانوں کی آواز ہو کر بولتے اور انہیں مختلف سیاسی خطروں سے ڈراتے۔ گو مسلمانوں میں قادیانیت کے خلاف ایک اعتسابی ذہن ابھر چکا تھا۔ لیکن مسلمانوں کی تعلیم یافتہ جماعت کے مغربی ذہن میں قادیانیوں سے متعلق اس قسم کے جذبات تھے کہ وہ مسلمانوں ہی کا ایک فرقہ ہیں اور ان کے منفعی علماء کا اعتبار مسلمانوں کی باہر گر آویزشوں کا حصہ ہے۔ ایک بڑا اگر وہ رواداری کا ناچھوٹا تھا اور اور قادیانی بزدلوں سے بہتہ جوہر مرعوب تھا، تحریک کشمیر ۱۹۳۲ء تک عام مسلمان اسی بیج پر رہے۔ علامہ اقبالؒ نے سترہ میں کشمیر کمیٹی سے استعفیٰ دیا۔ آپ کی تحریک پر انجمن حمایت اسلام نے اپنی عاملہ عامہ

سے قادیانیوں کو خارج کیا۔ پھر ۱۹۳۵ء میں آپ نے میرزا ایت کے قلعہ پر ضرب لگا کر قادیانیوں کو جداگانہ اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا، تو قادیانیت کا مسئلہ ہرگز وہ میں ایک تحریک کی شکل اختیار کر گیا۔ مغرب زدہ مسلمان جو اس مسئلہ کے مطالعہ سے محروم تھے اور نہیں جانتے تھے کہ ایک اُمت کیونکر تیار ہوتی ہے؟ اور کن رخنوں سے اس کی وحدت ٹوٹتی ہے۔ انہیں بھی معلوم ہو گیا کہ قادیانی اُمت کیلئے ہے؟ اس کی تشکیل کیونکر ہوتی ہے اور اُس کی سوانح عمری کیا ہے؟ اور وہ ہندو مسلمانوں میں رہ کر کیا کرتی اور کیا پاتی ہے؟ اگر پہلی جگہ غفیم نہ ہوتی اور اس کے بعد انگریزی استعمار کی مختلف ضرورتیں ہندوستان میں فرقہ واریتوں کی آلائشوں کو ہوا نہ دیتیں، تو ممکن تھا مرزا بشیر الدین محمود کے زمانہ خلافت ہی میں قادیانی بیل منڈ سے نہ چڑھتی اور اس کا تہذیبی یا تعلیمی خاتمہ ہو جاتا، لیکن برطانوی استعمار نے قادیانی اُمت کو اپنی سیاسی ضرورتوں کے تابع سہارا دیا اور وہ عوامی اعتبار سے لائقِ اعتناء ہو نیکی باوجود قادیانی اعتبار سے مسلمانوں کے لیے ایک پالام ہو گئی۔ میرزا غلام احمد سے لیکر حکیم نور الدین کے زمانہ تک جماعت کے تبلیغی دروازے کھلے تھے اور ادھر ادھر سے کئی ضعیف الاعتقاد لوگ دامِ تزدیر میں پھنس جاتے تھے۔ یا پھر میرزا بشیر الدین نے پہلی جنگِ عظیم سے فائدہ اٹھا کر بعض غاندھل اور ان کے متعلقین کو تھکا کر کیا۔ غرض ۱۹۱۷ء میں کل ۵۵ ہزار نفوس سرکاری مہم شماری کے مطابق قادیانی تھے۔ ممکن تھا تعداد سامنے نہ آتی، لیکن انگریزوں نے خلیفہ کو زور دیکر مردم شماری کرائی تاکہ انہیں معلوم ہو کہ ان کے خود کا شتہ پورے کی عددی حیثیت کیا ہے؟ اور وہ کس حد تک اسی سے فائدہ اٹھا سکتے اور اس کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ اس مردم شماری کے بعد قادیانیوں کو اپنی عدوی طاقت ظاہر کرنے کا پھر کبھی حوصلہ نہ ہوا۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ دینی احتساب کی ہمہ گیری کے باعث کسی مسلمان کا مرزائی ہونا ممکن نہیں رہا۔ صرف ترغیب و تحریک سے کوئی ناواں ناواں مسلمان مرزائی ہوتا۔ میرزا محمود نے تعداد بردھانے کے لیے فائز ٹن اولاد کی تحریک چلائی انہیں اپنے پیروؤں پر زور دیا کہ زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کریں یا پھر احمدی غواتین کو سیاسی معاشی اعتبار سے بعض بڑے آدمیوں سے بیاہ کر کے اور سرکاری افسروں سے شادیاں رچانے کی شدہ دی۔ لیکن کسی مرحلہ میں مردم شماری پر دامن نہ ہوئے مسلمانوں نے بہتیز اور دریا۔ انگریزوں سے کہا: حق کہ پاکستان بن جانے کے بعد کئی ایک جماعتوں نے اصرار کیا، مگر میرزا نے سربراہ اس غرض سے کبھی تیار نہ ہوئے۔ انہوں نے ہر حکومت میں ایک ایسا رعب پید کر لیا کہ سرکار کے افسانے رئیس نے اس سوال پر فوراً ہی رد کیا۔ ان کے نزدیک قادیانی مسلمان تھے اور کوئی دوسرا پہلو اس مسئلہ میں لائقِ اعتناء نہ تھا۔ فساد یہ تھا کہ قادیانی ملتِ علیہ کو عقیدۂ کافر سمجھتے لیکن سیاست ان کے حقوق سے فائدہ اٹھاتے۔ مولانا غفر علی خان نے زمیندار کی ادارت سنبھالی تو مرزا صاحب کی وفات کو

صرف ایک سال اور سات ماہ ہوتے تھے، ان کا دینی اقتساب منبر و محراب کی محدود و مخصوص فضا میں تھا یا پھر دو چار تبلیغی رسائل پر مسلمان وحدیث کے تحت فقہی خانہ فرسائی کرتے، لیکن ان کے مباحث عوام کی ذہنی رسائی سے خارج تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ علماء کی پرزور مزاحمت نے میرزا غلام احمد اور ان کے جانشینوں کو شرعی اعتبار سے چیت کر دیا تھا اور عام مسلمان ان کے شکار نہیں ہو رہے تھے لیکن علماء وفات سید، ظہور مہدی، آثار قیامت اور خروج و جبال وغیرہ کے مسائل پر گفتگو کرتے یا پھر ختم نبوت کے معانی پر مسلمان وحدیث کی رُوسے دغظ کرتے۔ ان کے سامنے یہ سوال ہی نہ تھا کہ میرزا غلام احمد استغفاری ضرورت کی پیداواریں اور برطانوی شمشادہیت کے کن سیاسی مقاصد کے تحت انہیں جنم دیا ہے۔ اُس وقت یہ سوال مسلمانوں کے ذہن میں تھا ہی نہیں کیونکہ سیاسی جرأت کا زمانہ نہیں تھا اور برطانوی استبداد اپنی کسی کھیسپے متعلق سیاسی چہرہ کشائی کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ ایک مُہرب دور تھا۔

میرزا غلام احمد کے پیروؤں کو مسلمانوں میں صرف اس لیے جگہ ملی اور وہ منبر و محراب کے اقتساب کی عوامی کپڑے محفوظ رہے کہ اس زمانہ میں علماء نے تکفیر کے بہت سے میزید پرچائے تھے۔ ایک فرقہ دوسرے فرقہ پر کافر ہونے کا طعن توڑ رہا تھا۔ سر تیا احمد خاں بھی اس تلوار کے زخم سہہ چکے تھے، اسی باعث جدید تعلیم یافتہ لوگ توجہ نہ دیتے اور اس سے لاتعلقی رہتے۔ ہوا یہ کہ اصل کفر کو بھی پناہ و فقاہت ملی اور اس نے ڈھونگ رچا لیا۔ لیکن اس کا پروان چرنا برطانوی حکومت کا مہولہ تھا۔

مولانا ظفر علی خاں نے پہلی جنگ عظیم کے آغاز تک زمیندار میں میرزا بابت سے چٹکیاں لیں۔ گو موضوع و مضمون علماء ہی کے انداز میں تھے لیکن لب و لہجہ ادبی و ذکا ہی تھا۔ مولانا کبھی کسی نظم میں طنز کر جاتے اور کبھی نثر میں اکثر علمی بحث کے چہرے پر ایک آدھ پہلو دار فقرے سے رونق پیدا کرتے۔ مولانا کے نزدیک میرزا غلام احمد کا سلطانِ اقلیم کہلانا انھوں کو خطاب تھا۔ اُن کے مجموعہ کلام و روشنی کے متعلق اس دور کے زمیندار میں لکھا کہ شاعری نہیں قلم کی متلی ہے۔

زمیندار طرابلس اور بلقان کی جنگ کے زمانہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کا سب سے بڑا روزنامہ ہو گیا اس کی اشاعت دنوں ہی میں بیس ہزار ہو گئی، زبان دنوں ایک عظیم اشاعت تھی۔ گو خواندگی کا تناسب حیرت تھا لیکن مسلمانوں کے شوق کا یہ حال تھا کہ وہ دو پیسے میں زمیندار خریدتے اور ایک آنہ اس کی پڑھائی پر خرچ کرتے۔ سرائیکل اڈوانہ پنجاب کا گورنر تھا۔ وہ اس سے پہلے حیدرآباد میں ریڈیڈنٹ رہا اور وہاں سے مولانا کے نظروں

کا باعث ہوا تھا۔ اُس کے دل میں مولانا کے خلاف میل تھی۔ مولانا انگلستان میں پریس ایکٹ کے خلاف آواز اٹھا کر ۲۰ ستمبر ۱۹۱۴ء کو واپس آئے، تو پندرہ دن بعد ۷ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو انہیں کرم آباد میں نظر بند کر دیا گیا۔ اُدھر زمیندار ۱۳۱۴ء ہی میں ضمانت طلبیوں اور ضمانت مضامینوں کا ہدف ہو چکا تھا۔ کسی نہ کسی طرح دسمبر ۱۹۱۵ء تک چلتا رہا، لیکن بالآخر سرٹائیکل اڈوائزر نے اس کو سیندر کھلا دیا۔ اس کے بعد مارچ ۱۹۱۶ء میں روزنامہ 'لمحات' جاری کیا، وہ بھی کچھ دنوں بعد بند ہو گیا۔ اسی سال دسمبر میں مولانا کو اپنے گاؤں کرم آباد سے اس شرط پر ہفتہ وار 'تارہ صبح' نکالنے کی اجازت ملی کہ علمی و ادبی ہوگا۔ پہلا پرچہ جنوری ۱۹۱۶ء میں نکلا۔ کوئی چھ سات ماہ بعد 'تارہ صبح' لاہور منتقل ہو کر ۲۷ اگست ۱۹۱۶ء کو روزنامہ ہو گیا۔ جنگ کا زمانہ تھا۔ مولانا نے 'تارہ صبح' میں قادیانیت کا محاسبہ شروع کیا، لیکن اہل طریقت سے بھی اٹھ گئے۔ پیروں نے مشترکہ دستخطوں سے سرٹائیکل اڈوائزر کو ان کے خلاف عرضداشت روانہ کی، حتیٰ کہ لاہور میں اجتماع جلسہ منعقد کیا۔ سرٹائیکل مولانا کے پہلے ہی خلاف تھا۔ ان حالات میں مولانا لاہور چھوڑ کر حیدر آباد دکن چلے گئے۔ لیکن عربوں نے پیچھا نہ چھوڑا۔ آخر وہاں سے بھی ریاست بدر ہو کر لوٹ آئے۔ جنگ عظیم ختم ہوتے ہی۔ زمیندار کاڈیکلریشن بحال ہو گیا اور ۲۰ مارچ ۱۹۲۰ء سے از سر نو نکلنے لگا۔ لیکن ابتلا و آزارش کی صعوبتیں زمیندار اور مولانا کے ہمرکاب رہیں۔ مولانا حضور ضلع کیمیل پور کی ایک تقریر کے خلاف قانون ہونے کی پاداش میں گرفتار کئے گئے اور زیر دفعہ ۲۴۳ الٹ پانچ برس اور زیر دفعہ ۱۵۳ الٹ دو برس قید کی سزا دی گئی۔ آپ نے قید کا پورا نامہ سنٹرل جیل منٹگری میں گزارا جو اُن دنوں پنجاب کی جیلوں میں کالپائی کہلاتا تھا۔ جہاں تک زمیندار کا تعلق تھا وہ سرکاری عتاب کا نشانہ بنا رہا۔ مولانا ظفر علی خاں کی اس خوبی کا جواب نہ تھا کہ وہ کسی تحریک کو لے کر اُٹھتے تو برسوں کی منزلیں مہینوں میں طے کر لیتے۔ اُنہوں نے قادیانی امت کے خدوخال "تارہ صبح" میں اس طرح واضح کئے کہ مسلمانوں میں نظری اعتبار سے ایک تحریک پیدا ہو گئی۔ اس تحریک ہی نے بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں علی اعتبار کی مختلف شکلیں پیدا کیں جن سے بزرگ عظیم کے مسلمان میں قادیانی امت کے سیاسی و عمرانی مظاہر کا آغاز ہو گیا۔

قادیانی امت کو پہلی جنگ عظیم کے دوران اور اس سے کئی سال بعد تک چھیڑنا آسان نہ تھا، کیونکہ برطانوی حکومت کی استعماری مصیبتیں گوارا ہی نہ کرتی تھیں۔ لیکن مولانا ظفر علی خاں نے 'تارہ صبح' میں معرعہ طرح اُٹھایا اور قادیانی امت کے استعماری وجود کو دولہ دین سے پسپا کرنا شروع کیا۔ مولانا کے اُتھ میں دو ہتھیار تھے۔ ایک نثر

کا ہتھیار تھا، دوسرا فلام کا۔ مولانا نے اپنی شگفتہ نثر میں قادیانی عقائد کا تجزیہ کیا۔ موضوع و بحث علمی ہوتے لیکن گرفت اس پیرایہ میں کرتے کہ غوام و عام متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے۔ جو کچھ، دل میں کھب جاتا۔ غوام قائل معقول ہوتے غوام میں احتجاج و منفکر رُوح پیدا ہوتی۔ مثلاً اس زمانہ میں مولانا نے ایک مقالہ لکھا — ”احمد کون ہے؟ حضور سرور کون دمکان یا میرزائے قادیان؟“ میرزا فلام احمد اس عنوان سے چونک گئے اور قادیانیت کا گھونگھٹ اُتر گیا۔ ایک دوسرا مضمون ”بعثت مجددین“ کے عنوان تھا۔ مولانا چراغ حسن حسرت نے ارغمان قادیان کے دیباچہ میں لکھا کہ نہایت بلند پایا اور دقیق مضمون ہے، جو نہایت کاوش سے لکھا گیا ہے۔ یہ دونوں نہایت طویل مقالے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض مضامین ایسے ہیں جن میں طنز کا انداز نمایاں ہے۔ مثلاً متبنی قادیان کی ناک، قادیان اور سید امیر علی مرحوم، ملنگ بہ اشتیاق گولے کے۔ الولد سترلابیہ۔ متبنی قادیان اور اس کا لاہوری طنزورہ۔ تارہ صبح میں کئی ایک نکاحی مضامین چھپتے رہے۔ میرزا بشیر الدین محمود نے ان سے بدحواس ہو کر سر بائیکل اڈوائر کو بصیغہ راز امداد کی درخواست کی اور اُسے مولانا کے خلاف بھڑکایا۔ اصرار اصل ظرفیت بھی زمیندار کی نکتہ چینی سے برہم تھے۔ انہوں نے زمیندار کے خلاف درخواست گزاری اور مولانا کے خلاف اڈوائر کو مشعل کیا۔ یہ چیز میرزا بشیر الدین کی بالواسطہ مددگار ہو گئی۔ اڈوائر ابھی پر تول رہا تھا کہ مولانا حیدر آباد لوٹ گئے اور تارہ صبح دسمبر ۱۹۵۱ء کے آخری دنوں میں بند ہو گیا لیکن ظفر یلیخان کے قلم کی بدولت مسلمانوں میں یہ ذہن پیدا ہو چکا تھا کہ میرزائی نہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم المرسلین کے فاصی ہیں بلکہ امت اسلامیہ کی شہ رگ پر استعمار کی پھڑی ہیں۔ القلم مولانا قادیانیت کے خلاف اعتبار کی پہلی آواز تھے جس نے ایک تحریک کی شکل اختیار کی اور مسلمانوں کو اس خطرہ سے چوکتا کیا اور انہیں قادیانیت سے متعلق یقین ہو گیا کہ مسلمانوں کی شرابی وحدت کو دو لخت کرنے کے لیے برطانوی استعمار کے بطن سے پیدا ہوتی ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری ۱۹۵۲ء کی تحریک ختم نبوت شروع ہونے سے چند دن پہلے لاہور کے ایک جلسہ عام میں تقریر کر رہے تھے کہ مولانا ظفر یلیخان اپنے فرزند اختر علی خاں کے ساتھ اچانک جلسہ گاہ میں گئے مولانا انتہائی ضعیف ہو چکے — اور بیمار تھے۔ آپ کا لفظ کمزور پڑ چکا تھا۔ نہایت دم کم ہوتے، لیکن الفاظ ٹوٹتے تھے۔ شاہ جی نے مولانا کی آمد پر ان کے دونوں گالوں کو تھپتھپایا اور بے لظفر یلیخان تیرے تارہ صبح نے میرے بگڑ میں آگ لگا دی تھی؟

شاہ جی فرماتے تارہ صبح نے مجھے قادیانیت کے زہر آب سے آگاہ کیا۔ حضرت سید مرطیہؓ نے

وصیت کی کہ اس فتنہ کی سرکوبی کرنا علامہ انور شاہ نے مجھے اس محاذ پر کھڑا کیا۔ الممتصر اہل قلم کی جدید کھپ میں
 قادیانیت کے محاسبہ کی انگ مولانا نے ستارہ صبح کی معرفت پیدا کی اور اس محاذ سے مسلمانوں کے سیاسی محاذ پر ظفر میٹھا
 پہلے حدی خواں تھے۔

سرمائیکل اڈوار مولانا کے پیچھے ہاتھ دھوکے پڑا رہا۔ اُس نے ۱۹۱۲ء میں زمیندار سے ضمانت طلب کی اور
 ۱۸ ستمبر ۱۹۱۳ء کو ضبط کر لی۔ مزید دس ہزار طلب کیے اور وہ بھی چار ماہ بعد ۱۳ جنوری ۱۹۱۴ء کو ضبط کر لیے۔
 اس کے ساتھ ہی پریس بھی ضبط کر لیا۔ دوسرا مطبع مسلم پرنٹنگ پریس قائم کیا گیا۔ اُس سے ابتداً دو ہزار کی ضمانت
 طلب کی، لیکن جلد ہی ضبط کر لی گئی۔ ۲۴ فروری ۱۹۱۴ء کو زمیندار حکماً بند کر دیا گیا۔ ایک نیا پرچہ لمعات جاری
 کیا، وہ اڈوار کی بند ہو گیا اور مولانا کو لاہور بدر کر کے کرم آباد میں نظر بند کر دیا گیا۔ مولانا تقریباً پانچ سال نظر بند
 رہے۔ ۱۹۱۹ء میں رہا ہوئے اور اپریل ۱۹۲۰ء میں زمیندار از سر نو شروع کیا، اڈوار نے جید آباد کوکن سے
 مولانا کا سات سو روپے ماہوار کا وظیفہ بند کر دیا۔ اس کے علاوہ زمیندار کے بہت سے ایڈیٹر گرفتار کیے گئے۔
 خود مولانا ۲۵ ستمبر ۱۹۲۰ء کو گرفتار ہو گئے اور حضور کی تقریر کے جرم میں پانچ سال قید کیے گئے۔ اس کے بعد
 زمیندار کی آزمائشوں کا لاتنا ہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ مولانا کے فرزند اختر علی خان بھی دو سال قید کیے گئے۔ مولانا
 عبد الحمید سالک زمیندار کے ایڈیٹر تھے، وہ بھی گرفتار کیے گئے اور انہیں بھی دو سال قید کی سزا ہوئی۔ ظاہر ہے کہ
 مولانا ظفر میٹھاں اور زمیندار برطانوی اقتدار کے خلاف نبرد آزما تھے، لیکن اُن کے قلم سے وہ غنا صریحاً رک
 اُٹھاتے تھے، جو برطانوی اقتدار کے کاہل پس اور اسلام سے مجرمانہ بغاوت کے منکب تھے۔ مولانا قید سے رہائی
 کے بعد قادیانیت کا محاسبہ اپنے قلم و زبان کا نصب العین بنایا اور اس شدت سے اغساب کیا کہ اس کے لیے
 جینا و بھر ہو گیا۔ مولانا نے ۱۹۲۰ء سے پاکستان بن جانے تک اور زمیندار نے پاکستان میں ۱۹۵۶ء کی تحریک
 تک، قادیانیت کو اپنے قلم و زبان کی زد میں رکھا۔ مولانا قید و بند سے باہر ہوتے تو قادیانیت کا محاسبہ جاری رکھتے۔
 کسی قومی تحریک کے پھیلاؤ میں یہ تو ہوتا کہ محاسبہ کی رفتار ذرا دم ہم ہو جاتی، لیکن یہ کبھی نہ ہوتا کہ قادیانیت سے
 کسی مدت کے لیے چشم پوشی کرتے۔ کانگریس میں رہ کر بھی قادیانیت کے شب و روز پر نگاہ رکھتے اور اپنی تقریر و
 تحریر کو اس سے غافل نہ ہونے دیتے۔ ۱۹۳۱ء میں کانگریس نے مکین سنٹیہ گروہ کی تو دہلی، پنجاب اور سرحد

کے بڑے بڑے لیڈر گجرات پیشیل جیل میں مقید تھے۔ وہاں مشاعرے ہوتے۔ مولانا مصرع طرح پر نظم کہتے، تو اس میں قادیانیت سے متعلق بھی طبع آزمائی کرتے۔ مولانا کی بعض اشارتی نغیں قادیانیت سے متعلق ہیں۔ اس کے بعد تحریک کشمیر اور مسجد شہید گنج کے زمانہ میں، مولانا نے اپنی بیشتر نظموں میں قادیانیت کو اڑے ہاتھوں لیا۔ تحریک خلافت ۱۹۱۹ء سے مولانا محض ایڈیٹر ہی نہ تھے بلکہ مسلمانوں کے ایک نامور لیڈر بھی تھے اور قلم کے علاوہ ان کی زبان کا بھی شہرہ تھا۔ وہ صحافت کے دھنی اور خطابت کے غنی تھے۔ ان کی تعاریر کے لوگ شیدائی تھے۔ مولانا نے زمیندار کے صفوں اور صوبہ کے میدانوں میں قادیانیت کو لٹکانا اور پچھانا شروع کیا اور ایک مختصر سی مدت میں مسلمانوں کے تمام رواج اُس پر بند کر دیئے۔ مولانا نے ۱۹۲۳ء میں قادیانیت کے عوامی احتساب کے لیے ایک جماعت بنائی۔ اُس جماعت نے تقریباً ہر روز پبلک جلسے منعقد کرنا شروع کر دیئے حکومت نے قادیانی اُمت کی پشت پناہی کے لیے اندیشہ نقص امن کی آڑ لے کر ۴ مارچ ۱۹۲۳ء کو مولانا ظفر علی خان اور ان کے رفقاء مولانا احمد علی، مولانا جمیب الرحمن، مولانا عبدالغمان، مولانا لال حسین اختر، مولانا محمد بخش مسلم اور خان احمد یار رزمی کو گرفتار کر لیا۔ یہ پہلا مقدمہ تھا جو سیاسی پس منظر کے تحت میرزاانیت کی حمایت میں حکومت نے پہلے دفعہ مسلمان زعماء کے خلاف تیار کیا۔ محاکمہ کبیر سنگھ میٹریٹ درجہ اول نے حفظ امن کے لیے ضمانت طلب کی۔ مولانا احمد علی، مولانا جمیب الرحمن اور مولانا محمد بخش مسلم کے عقیدتمندوں نے ضمانتیں داخل کر دیں لیکن مولانا ظفر علی خان، مولانا عبدالغمان، مولانا لال حسین اختر اور احمد یار خاں نے انکار کر دیا۔ عدالت نے وہ نوٹس پڑھ کر سنایا، جو اس مقدمہ کی بنیاد تھا کہ :

”تمہارے اور احمدی جماعت کے درمیان اختلاف ہے۔ تم نے اس کے عقائد اور اس

کے مذہبی پیشوا پر حملے کیے ہیں جس سے نقص امن کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔ وجہ بیان کر دو کہ تم سے کیوں نہ نیک چلنی کی ضمانت طلب کی جائے“

مولانا نے عدالت کو جواب دیتے ہوئے کہا :

”میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلمانوں کے ہاتھوں میرزا نیوں کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچے گا، لیکن جہاں تک میرزا غلام احمد کا تعلق ہے، ہم اُس کو ایک بار نہیں، ہزار بار دجال کہیں گے۔ اُس نے حضور کی ختم المرسلین میں اپنی نبوت کا ناپاک پونہ جوڑ کر ناموس رسالت پر کھلم کھلا حملہ کیا ہے۔ اپنے اس عقیدے سے میں ایک منٹ کے کروڑوں جھٹے کے لیے بھی دست کش ہونے کو تیار نہیں اور مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ میرزا غلام احمد دجال تھا، دجال تھا، دجال تھا۔ میں اسی سلسلہ میں قانون انگریزی کا پابند نہیں۔ میں قانون محمدی کا پابند ہوں۔“

(۱) میرزائیت کا مسئلہ ایک عوامی تحریک کی شکل اختیار کر گیا۔

(۲) مولانا سے پہلے میرزائیت کے تبلیغی دروازے سیدنا مہر علی شاہ نور اللہ مرقدہ اور بعض دوسرے اکابر کی بدولت بند ہو چکے تھے، لیکن مولانا نے میرزائیت کے چور دروازوں پر قفل چڑھا دیا اور تبلیغی اعتبار سے ناکارہ کر دیا۔

(۳) مولانا نے میرزائیت کے سیاسی وجود کے استعماری آب و گل کا تجزیہ کیا اور یہ پہلا مرحلہ تھا کہ لوگوں کو میرزائیت کی حقیقت کا پتہ چلا کہ وہ کوئی مذہب نہیں بلکہ برطانوی عملداری کی ہندوستان میں شیعہ جہلو سے متعلق استعماری ضرورت کا ٹانگہ ہے اور دنیائے اسلام میں انگریزوں کی خاطر اُسے جا سوسی کے پراسرار کا زبائے اخبام دیے ہیں۔

(۴) مولانا نے مسلمان عوام میں میرزائیت کے شرمناک وجود کو ننگا کر دیا اور حقیقت کھل کر سامنے آ گئی کہ میرزائیت ملک کی آزادی کے راستہ میں ایک زبردست روک ہے۔

(۵) اس سے پہلے مغربی تعلیم یافتہ مسلمان رواداری برتتے اور انہیں مسلمانوں کی تقریبوں میں مدعو کر لیتے تھے۔ مولانا نے ایسی نفاذ پیدا کی کہ مسلمانوں میں ان کے لیے کوئی جگہ نہ رہی اور وہ لوگ چاہی سیاسی حیثیت سے فائدہ اٹھا کر انہیں ساتھ رکھتے تھے، وہ بھی چاروں پاروں کو شکست ہو گئے اور کسی میں ان سے میل ملاپ کا حوصلہ نہ رہا۔

(۶) وہ مسلمان جو جدید تعلیم سے بہرہ مند تھے اور ختم نبوت کے مسئلہ میں مذہب کی بنیادی رمل سے ناواقف تھے، بعض سیاسی افراد کو چھوڑ کر میرزائیت سے بیزار ہو گئے۔

(۷) قادیانیت سے متعلق اصل قلم کی ایک ڈار پیدا ہو گئی اور مقررہوں کی ایک ایسی جماعت سامنے آئی، جس نے مذہب کے علاوہ سیاست کی بنیادوں پر میرزائیت کا محاسبہ شروع کیا، حتمی کو لیگ اور کانگریس کے حلقوں میں بھی یہ بات راسخ ہو گئی کہ میرزائی ان کی جدوجہد کے خلاف استعماری خواہشوں کے آئینہ کار اور برطانوی عملداری کے ایجنٹ ہیں۔

(۸) مسلمانوں میں یہ مطالبہ قومی ہو گیا کہ میرزائی امت کو دائرۃ اسلام سے خارج کر کے ایک جدا گانہ اقلیت قرار دیا جائے۔ ملاقاتیوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کے جواب میں قادیانیت سے متعلق جو معرکہ دار تاریخی مضمون لکھا، اس نے میرزائی امت کو الگ اقلیت قرار دینے کے مطالبہ کو پروان چڑھایا۔ سیاسی غرض مندوں اور سرکاری دانشوروں کو چھوڑ کر تمام مسلمان اس سے متفق تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے یورپ کے واپسی پر اپنے ہندو قلم سے بیان کیا کہ میرزائی برطانوی گماشتہ ہیں۔ اس روایت کو خود میرزا بشیر الدین محمود نے ڈاکٹر سید محمد کے حوالے سے

نقل کیا ہے۔ غرض مولانا خضر ملیحان جس تحریک کے سب سے پہلے راہ نہا تھے، وہ رنگ لائی اور میرزا ابیت بالا خرمسلمانوں سے الگ ایک شاخ قرار پا گئی۔ مولانا نے قادیانیت سے متعلق مختلف نظموں کی صورت میں تقریباً تین ہزار اشعار لکھے اور نثر میں بے شمار مقالات سپرد قلم کئے۔ ان سب کا شمار شکل ہے، لیکن مولانا کے تمام رسومات، ہستی مقبے کے لیے منبع قیامت کا محاسبہ تھے۔



احرار کا پانچ مصطفویٰ۔ قادیان کا شرابوہبی

احرار نہ شہر شروع ہی سے قادیانیت کے محاسب تھے، لیکن جماعتی طور پر تحریک کمیونسٹ کے فوراً بعد ۱۹۳۳ء میں قادیانیت کا تعاقب شروع کیا اور سال ڈیڑھ سال کے اندر قادیانی قلعہ میں زبردست شگافت پیدا کر دیے۔ مولانا ظفر علی خان تحریک پیدا کر دی تھی، احرار نے تنظیم پیدا کی۔ اس تحریک تنظیم نے قادیانی اُمت کو مسلمانوں کی ذہنی فضا سے بیدخل کر دیا۔ اس صورت حال سے قادیانی پریشان اور انگریز شدد تھے۔ انہوں نے اس مسئلہ کو احرار احمدی "نزاع سے تعبیر کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح مسلمانوں کی احتجاجی گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی اور وہ سیاسی شکایتیں جو مسلمانوں کو احرار سے ہیں ان کی معادلت ہوں گی۔ میرزا یوں نے اس عنوان سے احرار کشی کے لیے دو درم صوبہ کی۔ پہلے مسجد شہید گنج کی تحریک سے فائدہ اُٹھایا۔ پھر پاکستان کی تحریک میں احرار مسلمانوں کی ناراضی کو استعمال کیا۔ قادیانی مسلمانوں کی ہر تحریک سے من حیث الجماعت ہمیشہ الگ رہے۔ ان کے نزدیک برطانوی وفاداری کے سوا کسی دوسری وفاداری کا سوال ہی نہ تھا۔ پاکستان بنا، تو سر فخر اللہ خان کا وزیر خارجہ ہونا ان کے لیے ریڑھ کی ہڈی ہو گیا۔ میرزا بشیر الدین محمود مطلق تھا کہ علماء بالعموم اور احرار بالخصوص تحریک پاکستان میں عدم شمول کے باعث مسلمانوں کا اعتماد کھو بیٹھے ہیں۔ اب ان کے لیے پاکستان میں کوئی جگہ نہیں۔ اس نے پاکستان کی سیاست کو نرے میں لینے کی سازشیں شروع کیں، حتیٰ کہ بلوچستان کو قادیانی صوبہ بنانے کا اعلان کیا۔ احرار سیاست سے

دستبردار ہو گئے تھے۔ لیکن اس چیز نے انہیں چونکا کر دیا اور وہ قادیانی امت کا محاسبہ کرنے دوبارہ میدان میں آ گئے۔ انہوں نے دو سال میں دہی تحریک اور دہی تنظیم پیدا کر لی جس نے آزادی سے پہلے قادیانی امت کو مسلمانوں کے ذہن سے خارج کر دیا تھا۔ اب مسئلہ پاکستان کی اسلامی ریاست کا تھا۔ عوام کا احتساب اب بے پناہ ہو گیا۔ لیکن سرکاری حکام اسی طرح برطانوی استعمار کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ انہوں نے سکندراعراہ احمدی نزع کا نام دے کر معدوم کرنا چاہا اور تحریک راست اقدام کو مارشل لا کے بل پر کھل ڈالا۔ اس کے ساتھ ہی اعرار کے خلاف پروپیگنڈا تیز ہو گیا جسٹس منیر نے تحقیقاتی رپورٹ میں مسئلہ کا مذاق اڑایا۔ اعرار کو شد و مد سے پاکستان دشمن قرار دیتے ہوئے لکھا کہ انہوں نے پاکستان کو سبوتاژ کرنے کے لیے ہنگامہ برپا کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مارشل لا کے استعمال نے راست اقدام کی تحریک ۱۹۵۲ء کو ختم کر دیا، لیکن قادیانی مسئلہ تمام دنیائے اسلام کی نظر میں آ گیا اور جو لوگ اب تک بے خبر تھے کہ مسئلہ کیا ہے؟ وہ باخبر ہو گئے۔ جسٹس منیر نے اس مسئلہ میں نہایت بھونڈا طریق استعمال کیا۔ انہوں نے علماء کی عزت پر ہاتھ ڈال کر اسلام کا مذاق اڑایا، لیکن قادیانیت کے بالارادہ یا بلا ارادہ دفاع کے باوجود اس کو اسلام کا سرٹیفکیٹ دینے کا حوصلہ نہ کر سکے۔ مارشل لا کساں گیا؟ اور مارشل لا لگانے والے کدھر گئے؟ اس بحث کو چھوڑیے ہندوستان کی تحریک آزادی کا پہلا سنگ میل جلیانوالہ باغ کا حادثہ اور پنجاب کا مارشل لا تھا، لیکن اس کے، ۲ برس بعد انگریز برعظیم سے رخصت ہو گیا۔ وہ مارشل لا جو ۱۹۵۳ء میں ختم ہوتے کے فائیتوں پر لگا، اس کے ۲۱ برس بعد از روئے آتین میزانی دائرہ اسلام سے خارج ہو کر جدا گانہ اقلیت قرار پا گئے اور جس قضیہ کو انگریزی عہد کے باقیات نے ”اعرار احمدی“ نزع کا نام دیا تھا، وہ اسلام کا بنیادی مسئلہ ہو کر حل ہو گیا۔ اعرار بلاشبہ اس محاذ کی جانشین فوج تھے، لیکن مسئلہ ان کا نہ تھا۔ مسئلہ محمد عربی کی امت اور غلام احمد قادیانی کی جماعت کا تھا۔ میرزا غلام احمد نے استعمار کی اندھیری رات میں مسلمانوں کی وحدت پر شیخون، ارکان اپنے پیرو پیدا کیے تھے، قادیانی ملک کی جدوجہد آزادی میں سیاسی بدکاری کے قریب نہ ہوتے یا ان کا استعماری چہرہ سامنے نہ آتا، تو بھی ان کا اعرار کی پکڑ سے بچنا ناممکن تھا۔ ان کا یہ جرم ہی ناقابل معافی تھا کہ میرزا غلام احمد نے نبوت کا سرزد کیا۔ قرآن وحدیث کے مطالب میں تلبیس لگائیں۔ خود کو تمام انبیاء کا بروز کما۔ جہاں فسح میا۔ برطانیہ کی طاعت لازم کی؛ حتیٰ کہ ان تمام مسلمانوں کو اسلام سے خارج کر ڈالا۔ جو ان کے فائز نہ تھے لیکن جب یہ حقیقت کھل کے سامنے آ گئی کہ میرزا غلام احمد برطانوی استعمار کی پیداوار ہیں۔ ان کے پیروکار مسلمانوں کے روپ میں برطانوی جاسوس ہیں اور ان کے دو کام ہیں۔ ایک مسلمان ریاستوں کی جاسوسی، دوسرے ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی چاکری۔ اعرار نے مختلف مرحلوں

تجربوں میں مطالعہ کیا اور جب ان کا مطالعہ ہر لحاظ سے مکمل ہو گیا، تو قادیانیت کا تعاقب شروع کیا اور چند دنوں ہی میں فضا بدل ڈالی۔

چوہدری افضل حق علیہ الرحمۃ احرار کے شہ و داغ تھے۔ انہوں نے اپنے مختلف خطبوں میں قادیانیت کا سیاسی تجزیہ کیا۔ تاریخ احرار (طبع ثانی) کے صفحہ ۷۶ تا ۸۷ پر فقہ قادیان کے زیر عنوان نہایت شرح و بسط سے روشنی ڈالی اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

(۱) ملت اسلامیہ کی تشکیل محمد عربی نے کی ہے۔ ان کے بعد کسی نبی کے مبعوث ہونے کا سوال ہی نہیں ان کے بعد کسی بھی شخص کے دعویٰ نبوت سے ملت اسلامیہ نفی ہو جاتی اور اس کی وحدت قائم نہیں رہتی۔ دین خدا کا نزا ہے لیکن ملت پیغمبر اٹھاتے ہیں۔ میرزا غلام احمد خود کوئی ملت پیدا کرنے سے قاصر تھے۔ ان کا وجود استغاری خواہش کا نتیجہ تھا۔ انہوں نے ملت اسلامیہ میں نقب لگائی اور وحدت اسلامی کو دو ٹوٹ کر ناپا جا۔ اس طرح اپنے پیروؤں کی ایک ایسی جماعت پیدا کی جو ہندوستان اور ہندوستان سے باہر اسلامی ملکوں میں برطانوی عملداری کی ہر نوعی خدمات انجام دے رہی ہے اور اپنی اس مسلسل غلامی پر قادیانی اُمت نے ہمیشہ فخر و ناز کیا ہے۔ میرزا بشیر الدین عماد اس سلسلہ میں کرنل لارنس ثابت ہو رہے اور اپنے اس کردار کو اپنے والد کے لہانہ ارشادات کی متابعت قرار دیتے ہیں۔

(۲) قادیانی نبوت نے انگریزی حکومت کی الہامی تائید کر کے برطانوی اقتدار کا اعتراف حاصل کیا۔ نتیجہ وہ کئی ایک سرکاری محکموں میں بہت زیادہ اثر و رسوخ کے مالک ہیں۔ بعض جگہ سارے کا سارا ضلع ان کے اثر و رسوخ میں ہے۔ کئی ایک ملازمت کے خواہاں اور روزگار کے متمنی لوگ قادیانی اُمت کی سفارشات حاصل کرتے اور ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ ہر ضلع کے قادیانیوں کا شعار ہے کہ انتظامیہ کو مختلف طرح کیوں کے احوال و وقائع سے مطلع رکھتے، لہذا اس طرح حکام ضلع کا اعتماد حاصل کرتے ہیں۔

(۳) ایک معمولی اقلیت ہونے کے باوجود قادیانی اثرات کا یہ حال ہے کہ اہل کسلی کے امیر و اراکین کے غلیفہ سے رجوع کر کے قادیانی ووٹ حاصل کرتے اور اس طرح قادیانی اعتبار کی تحریک سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے بالائی طبقے کو احساس و اندازہ ہی نہیں کہ میرزائی کس مقصد کی تخلیق اور کس فن کے اہل کار ہیں اور ان کی بدولت اسلام اور مسلمانوں پر کیا بیت رہی ہے۔ فی الجملہ قادیانی برطانوی سرکار کی خوشنودی کے حصول کا ایک ذریعہ ہیں۔

(۴) مسلمانوں کی ملازمتوں پر قبضہ کرنے اور ان کی سیاست کو ہاتھ میں رکھنے کے لیے قادیانی عاصمۃ المسلمین کی سیاسی وحدت میں رہتے ہیں۔ ورنہ ان کے نزدیک تمام مسلمان کافر ہیں۔

چوہدری صاحب علیہ الرحمۃ نے اعلان کیا کہ:

(۱) قادیانی برٹش امپیرلزم کے کھلے ایجنٹ ہیں۔

(۲) وہ استعماری ذہن رکھتے ہیں۔ ارد گرد کی غریب آبادی کا بائیکاٹ کرنا اور دوسرے دُشمنانہ ذرائع سے انہیں مرعوب کرنا ان کا دُھندا ہے۔

(۳) وہ مسلمانوں میں ایک نئی گروہ بندی کے طلبگار ہیں، جو مسلمانوں کی جمعیت کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں بانٹ دے گی۔

(۴) وہ مسلمانوں میں بطور نفقہ کالم کام کرتے ہیں۔

میرزا بیگم نے علماء کی احتسابی تحریکوں کے باوجود قادیان کو اپنی ریاست بنا رکھا تھا۔ میرزا بشیر الدین محمود نے مؤبر کے مختلف اضلاع سے اپنی اُمت کے افراد، بُوکر قادیان میں بسا لیے تھے۔ علماء فتاویٰ جاری کرتے یا دُعا فرماتے، لیکن خم ٹھونک کر مقابلہ میں نہیں آتے تھے۔ حاجی عبدالرحمن اور حاجی عبدالغنی نے بنالہ میں شبان المسلمین کے نام سے ایک تنظیم قائم کی تھی۔ دونوں بھائی مقامی رئیس اور رسالت کے فدائی تھے۔ ان سے میرزائی اُمت اس طرح پسپا ہو چکی تھی کہ میرزا بشیر الدین کی سازش سے حاجی عبدالغنی شہید کیے گئے۔ شبان المسلمین کے ارکان مختلف علماء کو بُوکر سالانہ اجلاس منعقد کرتے اور قادیانیت کی خبر لیتے اور یہی ان کا دائرہ کار تھا۔

ایک سال اجماع ختم ہونے پر بعض علماء قادیان دیکھنے گئے، تو قادیانی شہ زوری کا حال یہ تھا کہ میرزا بشیر الدین کے ایما پر میرزائی نوجوانوں نے ان علماء پر تہ بول دیا۔ انہیں اس بری طرح پٹایا کہ پناہ بخدا! چونکہ مقابلی پولیس اور دوسرے حکام میرزا بشیر الدین کی مٹھی میں تھے۔ اس لیے کسی نے رپٹ تک نہ لکھی اور نہ کوئی دادرسی کی۔ اس کے بعد بھی ایک سال تک مسیح العقیدہ مسلمان قادیان جاتے ہوئے ڈرتے۔ احرار نے اس بدہشت کو توڑنے کے لیے اپنے چند رضا کار قادیان بھیجے کہ وہاں جا کر مسلمانوں کی مساجد میں اذان دیں، کیونکہ میرزائی اپنے سوا کسی کو اذان بھی دینے نہ دیتے تھے۔ رضا کار وہاں پہنچے، اذان دی، لیکن قادیانی دُندے لے کر پل پڑے اور ان مؤذن رضا کاروں کو اتنا مارا کہ زخموں سے چور چور ہو گئے۔ وہ مدت تک ہسپتال میں زیر علاج رہے۔ اس بہیمانہ تشدد کے خلاف احرار نے بنالہ میں کانفرنس کی اور حکومت کو پہلی دفعہ لٹکا کر کہ وہ اپنی حیثیتی اُمت

کے منہ میں لگام دے۔ ورنہ نتائج خطرناک ہوں گے، لیکن حکومت کے کانوں پر جوں تک نہ نیچگی اور نہ قادیانی ٹس سے مس ہوتے۔ وہ گویا قادیان کی ریاست کے راجاڑے تھے اور وہاں قانون ان کے اشارہ ابرو پر حرکت کرتا تھا جب پانی سرے گزر گیا اور قادیانی سرکش ہوتے گئے، تو احرار نے جولائی ۱۹۳۵ء میں ورکنگ کمیٹی کے اجلاس منعقدہ امرت سر میں فیصلہ کیا کہ قادیان میں احرار کا مستقل دفتر کھولا جائے، جو قادیانی امت کے اعمال و افکار کی نگرانی کئے۔ اس غرض سے مولانا عنایت اللہ کو دفتر کا پانچارچ مقرر کیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسٹر جی۔ ڈی کھوسلہ سیشن جج گوردوارہ کے الفاظ میں قادیانیوں کا ترو اور شور و پستی اپنی معراج کو پہنچی ہوئی تھی۔ جو لوگ قادیانی جماعت میں شامل ہونے سے انکار کرتے انہیں نہ صرف قادیان سے نکال دیا جاتا، بلکہ بعض اوقات کمرہ تر مصائب کی دھمکیاں دے کر دہشت انگیزی کی فضا پیدا کی جاتی۔ مرزا محمّد نے عدالتی اختیار اپنے ہاتھ میں لے رکھے تھے۔ قادیان میں دیوانی اور فوجداری مقدمات کی سماعت کی جاتی۔ جو لوگ مخالف تھے، ان کے مکانات کو بجلا دیا گیا، کئی ایک افراد قتل کیے گئے۔ مسٹر کھوسلہ نے اپنے فیصلہ میں اس کی مثالیں بھی دی ہیں۔ ان کے روبرو میرزا بشیر الدین محمّد نے تسلیم کیا کہ قادیان میں عدالتی اختیارات استعمال ہوتے ہیں اور ان کی عدالت سب سے آخری اسپل کی عدالت ہے۔ اس غرض سے قادیانیوں نے اپنے اٹھام بھی چھاپ رکھے تھے۔ مولوی عبدالکریم ایڈیٹر 'مباہلہ' شروع میں قادیانی تھے۔ جب انہیں قادیانیت کی صداقت کے متعلق شکوک پیدا ہوئے، تو اس سے تائب ہو گئے۔ ان پر ظلم و ستم شروع ہوا۔ میرزا محمّد نے مولوی عبدالکریم ایڈیٹر مباہلہ کی موت کی سپین گوئی کی جو انفضل میں چھپی۔ تیجہ عبدالکریم پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ وہ بال بال بچ گئے لیکن ان کا منہ منہ زمین قتل کر دیا گیا۔ اُس کے قاتل کو پھانسی کی سزا ہوئی۔ وہ پھانسی پا گیا تو اُس کی نعش قادیان لائی گئی اور نہایت اعزاز کے ساتھ اُسے ہشتی مقبرے میں دفن کیا گیا۔ اُس کی تعریف میں "الفضل" کے صفحات سیاہ کیے گئے۔ میرزا بشیر الدین محمّد نے اعلان کیا کہ اُس کی رُوح پھانسی پانے سے پہلے ہی خدا سے عادل کے حکم سے پرواز کر گئی تھی۔ مولوی عبدالکریم مباہلہ قادیان سے اُٹھ کر امرت سر گئے۔ ان کا مکان نذر آتش کر دیا گیا۔ ایک دوسرا قتل میرزا مین کا تھا جس کو کلہاڑی سے قتل کیا گیا۔ ہلاک اس لیے کیا گیا کہ میرزا بشیر الدین محمّد اُس سے ناراض ہو گیا تھا۔ پولیس نے اس سلسلہ میں کوئی کارروائی نہ کی۔ اُس کے قاتل فتح محمد نے عدالت میں اقرار کیا کہ اُس نے محمد امین کو کلہاڑی سے ہلاک کیا تھا۔ تب قادیان میں میرزا ایوں کی طاقت کا یہ حال تھا کہ ان کے خلاف کوئی شہادت دینے کی جرأت ہی نہ کر سکتا تھا۔ مسٹر کھوسلہ کے الفاظ میں سرکاری حکام قادیانیت کے مقابلے میں غیر معمولی حد تک مفلوج ہو چکے تھے۔ اس ہونا کہ فضا میں احرار کو خیال تھا کہ مولانا عنایت اللہ

قادیاں میں زندہ نہیں رہ سکتے۔ انہیں معلوم تھا کہ مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ سرد مہر ہے اور بعض دنیاوی اغراض کی خاطر میرزا بیت کی خوشنودی کو مقدم رکھتا ہے۔ احرار نے مولانا عنایت اللہ کے جانشینوں کی ایک فہرست تیار کر لی اور ہرچہ بادا باد کے تحت کمر بستہ ہو گئے۔ میرزا البشیر الدین محمود نے قادیانی ہائی کمان کی میٹنگ بلا کر احرار پر ہاتھ اٹھانے سے اجتناب کا فیصلہ کیا۔ وہ جانتا تھا کہ میرزا زانی اُمت کے لیے یہ سودا منگوا ہو گا۔ میرزا زانی اُمت کے بڑے بڑے افسر انگریز حکام کے پاس پہنچے اور فرمایا کہ اُنہیں احرار سے بچایا جائے۔ احرار قادیان میں پہلی تبلیغی کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کر چکے اور صوبہ بھر کے مسلمان اس میں شمول کی دھڑا دھڑ تیار کر رہے تھے۔ والسر نے صوبائی گورنر کو لکھا۔ گورنر نے بعض اعلیٰ افسروں کی معرفت احرار سے کہا کہ وہ قادیان میں کانفرنس نہ کریں۔ وہاں میرزائیوں کی اکثریت ہے اور اقلیت کو حق نہیں کہ ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچاتے۔ احرار نے جواب دیا قادیان کے سوا میرزائیوں کی اکثریت کہاں ہے؟ اُن کی تبلیغ دوسرے تمام مقامات پر بند کر دی جائے، تو حکومت کی خواہش پر غور کیا جاسکتا ہے۔ میرزا البشیر الدین کی حواس باخشی کا یہ عالم تھا کہ اُس نے کانفرنس کے عرصہ بعد جب چوہدری نضر اللہ خاں والسر نے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر بنے، تو انہیں آمادہ کیا کہ وہ اپنی والدہ کو لے کر والسر سے ملیں اور احرار کے چنگل سے نجات دلاویں۔

پہلی احرار کانفرنس ۲۳-۲۲-۲۱ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو بعد از امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری قادیان میں منعقد ہوئی۔ میرزا البشیر الدین محمود کی خوشنودی کے لیے حکومت نے قادیان کے میونسپل حدود میں دفعہ ۴۴ نافذ کر دی۔ احرار نے میونسپل حدود سے باہر کانفرنس کا ایک عظیم الشان پنڈال بنایا۔ پشاور سے دہلی تک ہزار ہا لوگوں نے شمول کا اعلان کیا۔ اس غرض سے اسپیشل ٹرینیں چلائی گئیں۔ جب سید عطاء اللہ شاہ بخاری قادیان کے ریلوے اسٹیشن پر اسپیشل ٹرین سے پہنچے، تو ہزار ہا صافکاروں نے اُن کا استقبال کیا۔ تقریباً دو لاکھ افراد شریعت جلس ہوتے۔ شاہ جی نے دس بجے رات تقریر کا آغاز کیا اور صبح کی اذان تک تقریر جاری رکھی۔ اس تقریر سے قادیانی اُمت کے ایوانوں میں کھلبلی مچ گئی۔ میرزا البشیر الدین نے حکومت کا دروازہ کھٹکھٹایا، چوہدری نضر اللہ خاں نے والسر سے اور گورنر سے فریاد کی، تو شاہ جی کے خلاف دفعہ ۱۵۳ الف کے تحت وارنٹ جاری کر دیے گئے اور انہیں شروع دسمبر ۱۹۳۲ء کو مسوری سے گرفتار کر لیا گیا۔ دیوان سکھانند مہٹا گورداسپور کی عدالت میں دو ماہ مقدمہ چناتا۔ میرزا البشیر الدین محمود نے بھی چار دن تک شہادت دی۔ آخر مہٹا نے ۲۰ اپریل ۱۹۳۵ء کو ۶ ماہ قید با شققت کا حکم سنایا۔ اس فیصلے کے خلاف سیشن جج گورداسپور کی عدالت میں اپیل کی گئی۔ انہوں نے

ابتداءً شاہجی کو ضمانت پر رہا کر دیا۔ پھر ۶ جون ۱۹۳۵ء کو ایک تاریخی فیصلہ لکھا، جس سے قادیانی امت بے نقاب ہو گئی۔ سٹرکھوسلہ نے شاہجی کے جرم کو محض اصطلاحی قرار دیکر متاثر جلسہ عدالت قید محض کی سزا دی۔ اس فیصلے نے عوام کے احتساب کو ثبات دیکر خاص کو بیدار کیا۔

سٹرکھوسلہ کا تاریخی فیصلہ عوام میں لوک گیت کی طرح پھیل گیا۔ میرزائی اس کے مندرجات کی صداقت سے کپکپا اٹھے۔ اب وہ اس جستجو میں تھے کہ احرار کی کپڑے کیوں کر نکل سکیں، لیکن انہیں کوئی راستہ نہ نکلتا تھا۔ اب وہ ایک دو سال میں صوبائی خود مختاری کا آغاز ہو رہا تھا۔ جن صوبوں میں مسلمان اکثریت میں تھے وہاں سرکاری مسلمان جتہ بند ہو کر انتخاب جیتنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ پنجاب کا صوبہ مسلمانوں کے اکثریتی صوبوں میں سب سے اہم تھا۔ ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں انتخابات ہندوؤں اور مسلمانوں کے دائرے میں منقسم تھے، لیکن پنجاب واحد صوبہ تھا، جہاں ہندو اور مسلمانوں کے علاوہ ایک تیسری طاقت سکھ تھے، جو آپس میں کسی حد تک منقسم تھے۔ لیکن اکالی رہنما تمام سکھ نشستوں پر قبضہ کرنے کے متمنی تھے۔ اس انتخابی کشمکش کے استعماری پس منظر میں شہیدؒ کی مسجد گرائی گئی، جس سے صوبہ کی سیاست یکسر ہلٹ گئی۔ اس سے جو تحریک پیدا ہوئی، اس میں احرار نے اس خیال سے حصہ نہ لیا کہ اس کے مضمرات میں استعماری اغراض کا فرواں اور باہسی تصادم یا قانون شکنی سے شہیدؒ کی بازیابی ناممکن ہے۔ احرار عموماً کہتے تھے کہ انگریز کے آئے کار مسلمانوں نے شہیدؒ کی انہدام کا کھڑاگ اس لیے رچایا ہے کہ ان کے لیے انتخاب کی راہیں بند کر دیں۔ احرار جتہ بیٹے تو قید ہو جاتے اور انتخاب سرکاری مسلمانوں کے ہاتھ میں رہتا۔ احرار نے حصہ نہ لیا، تو مسلمانوں کے قہر و غضب کا شکار ہو گئے اور انتخاب کے نتائج ان کی نفی کر گئے۔ اس تحریک کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں کئی ایک مخلص رہنماؤں نے حصہ لیا۔ ان کی طاقت احرار کے خلاف استعمال ہوتی اور اس کا فائدہ سرکاری مسلمانوں کے علاوہ میرزائی امت نے اٹھایا۔ میرزا بشیر الدین محمود نے کئی ایک سیاسی مسلمانوں کو فریاد کیا۔ انہوں نے احرار پر تاثر توڑ حملے کیے جس سے کچھ عرصہ کے لیے میرزائیت کے خلاف مسلمانوں کا زور بہرحم بڑ گیا اور قادیانیوں کے اعمال و افکار کی نگرانی میں جوش و خروش نہ رہا۔ احرار کے خلاف مسلمانوں کی اس ناراضگی سے میرزائیت قدرے مصحون ہو گئی، لیکن تاہم کے ۱۹۳۷ء میں انتخابات ختم ہوتے ہی سکندر زبیر قائم ہوئی۔ اُدھر شہیدؒ کی کاظم ٹوٹ گیا۔ امامت المسلمین کو پتہ چل گیا کہ انہدام مسجد کا پس منظر کیا تھا اور انہیں کیونکر فریب دیا گیا۔ احرار نے بعض دوسری سیاسی سرمدوں کے باوجود قادیانی حماد کی توانائی برقرار رکھی۔ اور مسلمانوں کے ذہن سے میرزائی امت کو نکال دیا۔ گو احرار الیکشن میں تھبتہ ہار گئے اور جو لوگ ان کے ٹکٹ پر

منتخب ہوئے تھے، وہ یونیٹس پارٹی سے جاملے۔ صرف مولانا مظہر علی آفندہ اور چودہری عبدالرحمن راہول احمر میں رہ گئے، لیکن احمر کا بڑا کا نام یہ تھا کہ ایک قادیانی بھی منتخب نہ ہو سکا۔ میرزا بشیر الدین محمود اس صورتِ حالات سے سخت پریشان تھا۔ اس نے احمر کے خلاف کئی سازشیں کیں۔ ایک طرف برطانوی سرکار کو بھڑکانا رہا۔ دوسری طرف مسلمانوں میں اُن کے خلاف فضا پیدا کرنے میں لگا رہا۔ اس غرض سے پانی کی طرح روپیہ بہایا۔ اُس نے شاہ جی کے قتل کا منصوبہ تیار کیا کہ ان کا وجود قادیان کے لیے پیغام اجل تھا اور وہ اس سلسلہ میں ایک ادارہ اور ایک تحریک تھے۔ ان کی تقریروں نے ایک ایسی تحریک پیدا کی کہ اس سے پہلے قادیانی امت کو اس طرز کے عوامی مجاہدے سے کبھی واسطہ نہ پڑا تھا، غرض شاہ جی ان تمام علماء کے اعتبار کا مجموعہ تھے جو اب تک قادیانی اعجاز پر لڑتے رہے اور اس سلسلہ میں اپنی عمریں بتا دی تھیں۔

میرزا بشیر الدین محمود نے راجندر سنگھ آتش نام کے ایک سکھ کو دیہ نوجوان راقم کے ساتھ بھی منگلوری سنٹرل جیل میں رہا تھا، دس ہزار روپے کے عوض شاہ جی کے قتل پر تیار کیا۔ اس غرض سے پانچ ہزار روپے پیشگی دیے اور پانچ ہزار قتل کے بعد ادا کرنے کا وعدہ کیا، لیکن راجندر سنگھ نے شاہ جی کو دیکھا، اُن کی تقریر سنی تو اپنے منہ پر کو تیار نہ کر سکا۔ میرزا محمود راجندر سنگھ کے انکار سے پریشان ہوا، اس کو سازش کے منکشف ہونے کا خطرہ تھا۔ اُس نے سی۔ آئی۔ ڈی سے سازش کر کے راجندر سنگھ کو کلکتہ میں گرفتار کر لیا اور اس پر الزام عائد کیا کہ وہ انقلابی پارٹی کا ممبر ہے۔ جب اس کو پنجاب لایا گیا، تو اس نے میرزا محمود کی سازش کے انکشاف کا ارادہ کیا کہ وہ اس حقیقتِ حال سے عدالت کو مطلع کرے اور بتائے گا کہ اس کی گرفتاری میرزا زانی امت کی سازش سے ہوئی ہے۔ میرزا بشیر الدین کو خطرہ تھا کہ وہ شاہ جی کے قتل کی سازش آشکارا کرے گی۔ جب راجندر سنگھ کا ارادہ پولیس کے علم میں آیا، تو صوبائی گورنمنٹ کے حکم پر اس کو فی الفور رہا کر دیا گیا، لیکن شاہ جی کے خلاف میرزا زانی انٹروں کی پخت و پز سے بغاوت وغیرہ کے جرم میں کئی مقدمات تیار کیے گئے۔ ادھر ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگِ عظیم کا آغاز ہو گیا۔ احمر نے برطانیہ کی جنگی افات کے خلاف تحریک کا آغاز کیا، تو ایک دوسرا اعجاز کھل گیا اور تمام احمر رہنما سنگین سے سنگین مقدمات میں گرفتار کر لیے گئے، حتیٰ کہ بعض نمایاں کارکن بھی جیل میں ڈال دیے گئے۔ بعض کو نظر بند کیا گیا۔ بعض کو طویل سزائیں دی گئیں۔ اس طرح جنگ کے دوران تمام نقشہ بدل گیا۔ شاہ جی کے مقدمہ میں سرکاری رپورٹر لدھا رام منحرف ہو گیا۔ اُس نے عدالت کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ شاہ جی کی تقریر اُس نے وزیرِ اعظم سکندریات کی ہدایت اور سربراہ سپرٹنڈنٹ پولیس کے ایما پر وضع کی ہے، تاکہ اُنہیں

بڑی سے بڑی سزا دی جاسکے۔ اس انحراف و انکشاف سے شاہ جی کا مقدمہ لاہور ہائی کورٹ میں چلا گیا جہاں جسٹس سر ڈگلس جیگ اور جسٹس رام لال پرستھی ڈویژن پنج نے سماعت کی اور شاہ جی کو بری کر دیا۔ اس کے بعد حکومت کو کان ہو گئے اور اس نے دورانِ جنگ شاہ جی کے خلاف کوئی مقدمہ قائم نہ کیا۔ دوسرے تیسرے سال کئی ایک احرار رہنما قید گزار کر رہا ہو گئے۔ جنگ کا زمانہ تھا، لیکن احرار نے قادیانی محاذ کو شدت سے قائم رکھا اور میرزائی امت کی اس طرح نگرانی کی کہ وہ اپنے طور سے کوئی ساناک نہ رہا سکی، اور مسلم لیگ نے اوائل ۱۹۴۷ء میں پاکستان کا نصب العین اختیار کیا۔ احرار اس سے متفق نہ تھے، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ احرار مسلمانوں میں سیاست کمزور ہو گئے، تاہم ان مسلمان ان سے برگشتہ ہو گئے۔ دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی تو ہندوستان کے سیاسی مستقبل سے متعلق برطانوی حکومت کے نمائندوں سے گفتگو شروع ہوئی۔ اس کا ایک مرحلہ جنرل انتخابات تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اس کے خلاف تھے کہ احرار انتخابات میں حصہ لیں، لیکن مولانا منظر علی اظہر نے مسلم لیگ سے ٹکر لے کر ایسی نیواضعاتی کہ احرار مسلمانوں کے غفہ و عتاب کا شکار ہو گئے۔ میرزا بشیر الدین محمود نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اُس نے احرار کے خلاف اس غرض سے لاکھوں روپے صرف کیے کہ انہیں مسلمانوں میں جماعتی حیثیت سے ختم کرا دیں۔ گروپنی جماعت کے لیے مسلمانوں میں وہ کوئی جگہ پیدا نہ کر سکے، لیکن سیاسی مسلمانوں میں انہیں قدم رکھنے کا موقع مل گیا اور جو لوگ آزادی کے وارث ہو رہے تھے۔ ان کے نزدیک قادیانی سیاست مسلمان ہی تھے، لیکن عوام احرار سے ناراضی کے باوجود قادیانیت کو مسترد کر چکے تھے۔ اور مذہبی مسلمان مبز و محراب کی معرفت احرار ہی سے متاثر تھے۔ پاکستان قائم ہوا، تو احرار و دھتور میں بٹ گئے۔ مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی ہندوستان کے ہو گئے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری، ماسٹر تاج الدین انصاری، مولانا محمد علی باندھری اور شیخ حسام الدین وغیرہ پاکستان آ گئے۔ احرار نے حالات کو محسوس کرتے ہوئے سیاست سے ہاتھ اٹھالیے شاہ جی عملاً سبکدوش ہو گئے۔ میرزا بشیر الدین محمود نے ہاتھ پاؤں پھیلانے شروع کئے۔ وہ قادیان سے اٹھ کر لاہور آ گیا اور یہاں جو دھال بلندنگ (نزد میوہسپتال) میں قیام کیا۔ اس نے مختلف اخبار نویسوں سے ناٹھ باندھا۔ کئی ایک کو رام کیا اور لاہور کالج لاہور کے مینار ڈھال میں پاکستان کے بعض سیاسی مسائل پر تقریریں شروع کیں۔ بالخصوص مسئلہ کشمیر پر اُس نے مشرح و بسط سے اظہار خیال کیا۔ ظاہر ہے کہ سرکاری مسلمان تو پہلے ہی فراخ دل تھے۔ ان تعاریر سے بعض سیاسی مسلمان بھی متاثر ہوئے۔ اور عوام میں قادیانی امت نے رسوخ حاصل کرنا چاہا۔ احرار اس وقت منتشر تھے۔ اُن کا ترجمان ”آزاد“ راقم کی ادارت میں نکل رہا تھا۔ راقم

نے آڈاؤ میں میرزا بشیر الدین محمود کا نوٹس لیا۔ اس کے علاوہ شروع ۱۹۴۸ء میں امرار کے زیر اہتمام کوئی تبلیغی جلسہ تھا راقم نے اس میں میرزا نایت کے کفر کا اعلان کرتے ہوئے فخر اللہ خاں کے تقرر پر احتجاج کیا اور یہ پاکستان میں اس سلسلہ کی پہلی آوازی تھی۔ مولانا غلام غوث ہزاروی نے راقم کو خط لکھا کہ پاکستان میں اللہ تعالیٰ نے اس عنوان سے اعلانیے کلمۃ الحق کا سہرا تمہارے سر باندھا ہے۔ یہ خط ۱۹۴۹ء کے چٹان میں شائع کیا گیا۔

میرزا بشیر الدین محمود پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے پہلے پاکستان کو اپنے ملک کی موت سمجھتے، لیکن یاسنہ گوگم کی حالت میں تھے حبش منیر کی رپورٹ (اردو ایڈیشن) کے صفحہ ۱۱۷ پر بھی اس کا ذکر موجود ہے کہ وہ (میرزا بشیر الدین محمود) قیام پاکستان کے خلاف تھے۔ میرزا صاحب نے اپنی ایک تقریر میں علی الاطلاق کہا تھا ”موجودہ ملکی تقسیم غلط ہوئی ہے۔ وہ تقسیم ختم کرنے اور دونوں ملکوں کے باہمی افتراق دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اس عارضی تقسیم کو کسی نہ کسی طرح ختم کیا ہی جاتے گا اور ہندوستان اور پاکستان پھر سے اکھنڈ ہندوستان بنایا جائے گا۔ میرزا صاحب کی یہ تقریر ان کی جماعت کے آرگن الغنفل میں چھپی۔ اس کے علاوہ میرزا صاحب نے ”میرزا کوثری یوٹیو کے روبرو تسلیم کیا کہ انہوں نے ۱۱ جون ۱۹۴۷ء کو اپنی ایک تقریر میں پاکستان کے مطالبہ کو غلامی مضبوط کرنے والی زنجیر قرار دیا تھا۔ اسی طرح ۳ جون ۱۹۴۷ء کو میرزا صاحب نے ”بہ عنوان“ سکھ قوم کے نام دردمندناہ اپیل“ ایک پمفلٹ شائع کیا۔ جس میں یہ الفاظ تھے کہ میں دعا کرتا ہوں اے میرے رب میرے اصل ملک کو سمجھ دے۔ اول تو یہ ملک بنے نہیں اور اگر بنے تو اس طرح بنے کہ پھر مل جانے کے راستے کھلے رہیں۔ اللہ ہدائے امین۔

چوہدری سرفراز اللہ خاں کے جیتنے کا سراج ۳ اپریل ۱۹۴۷ء کو تھا۔ میرزا صاحب نے اس تقریب میں بھی اسی طرز کے خیالات کا اظہار کیا اور فرمایا کہ انہیں کوشش کرنی چاہیے کہ یہ حالت جلد دور ہو اور اکھنڈ ہندوستان بنے جہاں ساری قومیں شیر و شکر ہو کر رہیں۔ (ملاحظہ ہو الغنفل ۵ اپریل ۱۹۴۷ء)

اسی طرح ۴ مئی ۱۹۴۷ء کو میرزا صاحب نے اپنی مجلس علم و عرفان میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہندوستان کو اکٹھا رکھنا چاہتی ہے۔ ہندوستان کی تقسیم پر اگر ہم راضی ہوتے تو خوشی سے نہیں، بلکہ مجبوری سے۔ پھر یہ کوشش کریں گے کہ جلد سے جلد ترمیم ہو جائیں۔

یہ تو خیر قبل از تقسیم کی باتیں تھیں لیکن پاکستان میں قادیانی اُمت نے ”تاریخ احمدیت“ کی تردید شروع کی تو اس کی دسویں جلد کے صفحہ ۲۷۶ پر لکھا کہ:

ہم دل سے پہلے ہی اکھنڈ ہندوستان کے قائل تھے، جس میں مسلمان کا پاکستان اور ہندو کا ہندوستان

برضا در غبت شامل ہوں اور اب بھی ہمارا عقیدہ یہی ہے۔“

میرزا صاحب کے خیالات ان کے مبینہ تقدس کی آواز تھے اور تمام قادیانی بدول و جان ان کے مؤید تھے۔ میرزا صاحب کے بھائی اور سٹرا ایم۔ ایم۔ احمد کے والد میرزا بشیر احمد ایم۔ اے نے بھی ان ہی خیالات کا اظہار کیا اور اپنے کئی پمفلٹوں میں اس خیال کا اعادہ کیا کہ وہ تقیم سے راضی نہیں، اکھنڈ ہندوستان کی طفر جانا چاہتے ہیں، لیکن پاکستان بن گیا تو میرزا بشیر الدین محمود نے پیٹر ابلہ اور پاکستان کو اپنے نعرہ میں لینے کا عزم کیا۔ سر ظفر اللہ خاں پہلے دن سے وزیر خارجہ تھا۔ اُس کے پیرو دو کام تھے۔ ایک مختلف مقامات کے میرزائی افسروں کا تحفظ، دوسرا وزارت خارجہ میں میرزائی افسروں کی بھرتی۔ اس طرح مختلف ممالک کے سفارت خانوں میں قادیانی عہدیداروں کی بھرا رہ گئی۔ انہوں نے مختلف اسلامی ملکوں میں نہ صرف اپنے تبلیغی مشن قائم کیے، بلکہ بعض عرب ملکوں میں خبیثہ اہلکار متعین کیے جو عالمی سامراج کی ہدایات پر کام کرتے اور دودھری تنخواہ پاتے تھے۔ چودھری ظفر اللہ خاں کا خفیہ کام کابینہ کے اندر دنی راز اور بعض اہم سرکاری فیصلے میرزا بشیر الدین محمود تک پہنچانا تھا۔ جب تک قائد اعظم زندہ رہے۔ چودھری ظفر اللہ خاں چوکتا رہا۔ خان لیاقت علی خاں کی شہادت تک اُس نے زیادہ پالو نہ پھیلانے، لیکن خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم ہو گئے، تو اُس نے تمام حدود پھاند ڈالے اور بلا جھجک قادیانیت کے پھیلاؤ میں منہمک ہو گیا۔ میرزا بشیر الدین محمود نے اپنے خطبات میں زور دینا شروع کیا کہ ان کے پیرو تمام ملکوں میں بھرتی ہوں اور اس طرح فوج، پولیس، ایڈمنسٹریشن، دیوے، فنانس، اکاؤنٹس، کمشنر اور انجینئرنگ پر چھا جائیں۔ (ملاحظہ ہو الفضل ۱۱ جنوری ۱۹۵۲ء)

اسی سال میرزا بشیر الدین نے خطبہ دیا کہ ۱۹۵۲ء گزرنے نہ پائے کہ دشمنوں پر احمدیت کا رعب غالب آ جائے اور وہ مجبور ہو کر احمدیت کی آغوش میں آ گریں۔“

اس سے پہلے میرزا بشیر الدین نے دسمبر ۱۹۵۱ء کو اپنے سالانہ جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ ”وقت آنے والا ہے، جب یہ لوگ (مخالفین و منکرین) مجرموں کی حیثیت میں مرے سامنے پیش ہوں گے۔“

میرزا صاحب نے ۲۹ جولائی ۱۹۵۲ء کے خطبہ میں فرمایا :

”اپنا بایا بیگانہ، کوئی اعتراض کرے، کوئی پروا نہیں۔ ہونا دہی ہے، جو میں نے کہا ہے اور وہی ایک دن ہم کر کے رہیں گے۔ (الفضل ۲۹ جولائی ۱۹۵۲ء)

میرزا صاحب نے ۲۳ جولائی ۱۹۵۲ء کو فرمایا کہ وہ بلوچستان کو احمدی صوبہ بنانا چاہتے ہیں۔ میرزا انکوائری

رپورٹ میں میرزا صاحب کے اس اعلان پر تبصرہ کرتے ہوئے جموں نے لکھا کہ ان کی تقریر نہ صرف نامناسب بلکہ غیر کمال اندیشہ اور اشتعال انگیز تھی (رپورٹ اردو میں صفحہ ۲۸)

میرزا صاحب نے بلوچستان کو قادیانی صوبہ بنانے کا اعلان اُس کے آخری انگریز ایجنٹ مسٹر جیفز سے ملی صباغت سے کیا اور مسٹر ڈی۔ وائی فل اور مسٹر ہنڈرسن سے پخت و پز کرنے کے بعد اس غرض فہمی کا شکار ہو گئے۔ بلوچستان اُن کی ریاست ہو گا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ اب صوبہ بلوچستان ہمارے ہاتھوں سے نکل نہیں سکتا۔ یہ ہماری شکار گاہ ہو گا۔ دُنیاء کی ساری قومیں مل کر بھی ہم سے یہ علاقہ چھین نہیں سکتیں۔

میرزا صاحب کا یہی اصل روپ تھا۔ جب تک انگریز رہا، وہ مذہب کی کمین گاہ میں بیٹھ کر انگریز کی سیاسی خدشات انجام دیتے رہے۔ انگریز چلا گیا تو سیاسی شاطر کی حیثیت سے سامنے آ گئے اور قادیانیت کو برسرِ اقتدار لانے کی جدوجہد میں سرگرم ہو گئے۔ میرزا صاحب اس خیال سے مطمئن تھے کہ احرار جیسی فعال جماعت مسلم لیگ سے ٹکراؤ کے باعث متروک ہو چکی ہے۔ دوسرے علماء ان سے ٹکر لینے کا حوصلہ نہیں رکھتے اور نہ انہیں مسلم لیگ کی تن آسان لپیٹ سے کسی مزاحمت یا مخالفت کا خطرہ ہے۔ خود علماء میرزا صاحب کی سیاسی قیاریوں سے بے خبر تھے۔ ان کے نزدیک میرزا صرف ایک مذہبی مسئلہ تھا اور وہ زیادہ سے زیادہ ختم نبوت کے مسئلہ پر کلام کرتے تھے۔ میرزا عموان حالات میں بطور ایک سیاسی شاطر کے حصولِ اقتدار کیلئے بے جھجک ہوتے گئے۔ ان کی خود مری کا یہ حال تھا کہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور اس گھمنڈ سے باتیں کرتے گویا ملک کی حکومت ان کے ہاتھ میں ہے۔ چودہویں ظفر اللہ خاں عالمی سمارچ کی شہ پر کام کرتے اور ملک میں جہاں کہیں جن عہدے پر کوئی میرزائی افسر تھا، وہ علی الاعلان اپنے فرقہ کی خدمت کرتا اور اپنے عقیدے کی تبلیغ میں بے باک تھا۔ احرار کا تبلیغی عفراس سے غافل نہ تھا، لیکن قادیانی، سیاسی مسلمانوں کو یہ تاثر دینے میں کامیاب تھے کہ ان کے خلاف جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ مختلف اسلامی فرقوں کے تنازعات کی پرانی آویزش اور منبر و محراب کی باہمی خصومت کا پرانا درد ہے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اگست ۱۹۴۷ء سے لے کر دسمبر ۱۹۴۸ء تک خانہ نشین رہے، لیکن اواخر دسمبر میں پاکستانی فوج کے ایک لیفٹیننٹ کرنل نے اپنے ایک سی۔ آئی۔ پی۔ دوست کے ہمراہ شاہ جی سے ملاقات کی اور بیان کیا کہ ہم پاکستان سے پہلے قادیانیت سے متعلق علماء کے تعاقب کوئی الواقعہ ایک فضول مذہبی جھگڑا سمجھتے تھے۔ آپ لوگ جیسے قادیانیت کے متعلق بے بے وعظ کرتے تو خیال ہوتا کہ یہ بھیسلے ملائیت کی خصوصیت ہیں یا احرار کی افتاد طبعیت کہ وہ ذہنی طور پر مشغول رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن پاکستان بن جانے کے بعد جو حقائق ہمارے مشاہدے میں آئے اور جن

تجربوں سے ہم گزر رہے ہیں، وہ اتنے نکلین ہیں کہ پاکستان کی درجہ اول کی لیڈر شپ کے بعد :

(۱) اپنی موجودہ ہیئت کھوٹیٹھے گا اور اس کا کوئی دوسرا نقشہ ہوگا۔

(۲) یا ہندوستان کی طرف کسی نہ کسی شکل میں پٹ جائے گا۔

(۳) یا اس کی حیثیت ایک میرزائی ریاست کی سی ہوگی۔

ان تینوں میں جو شکل جس طرح قائم ہوگی، اس کے پس منظر میں میرزائی ہوں گے۔ اس غرض سے وہ اندر خانہ اپنے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں۔ شاہ جی نے ان سے کہا کہ آپ یہ سب باتیں ملک کے وزیراعظم خان یاقوت علی خان کے فرانس میں لائیں اور ان سے کہیں کہ اپنی کسی مہتممہ مجلس کی معرفت جملہ معلومات حاصل کریں۔ کرنل نے کہا :

”شاہ جی ہماری اصل مصیبت یہ ہے کہ حکمران جماعت دین سے معاشرتی دل چسپی رکھتی ہے، مذہبی نہیں۔ وہ اولاً اپنی ذات، ثانیاً اپنی جماعت پھر اس کے حدود میں اپنے مقاصد و مصالح دیکھتی ہے۔ اسے اسلام اور اس کی دعوت کے معجزات و مقنیات سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم آپ کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوئے ہیں کہ آپ کو بتائیں کہ میرزائی کیا ہیں؟ آپ نے اس داستان کا نوٹس لیا اور اس طرح کوئی تحریک بن گئی، تو لازماً حکمران جماعت آگاہ ہوگی۔ تیسرے مسلمانوں کے اجتماعی منیر کی بیداری سے قادیانی امت کو بھی احتساب کا اندیشہ ہوگا اور اس طرح وہ خطرہ جو ہم محسوس کرتے ہیں، ٹل جائے گا۔ اس وقت سوال مسلمان علوم اور مسلمان حکام کو اس فتنہ کے عمومی برگ وبار اور اس کی مخفی تہمت دود کے نقش و نگار سے مطلع کرنے کا ہے۔ میرے ساتھ یہ سی ایس پی افسر ہیں اور وزارت خارجہ میں اہم عہدہ پر فائز ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ چودہ دہری طغی اللہ خاں پاکستان کا وزیر خارجہ ہے، لیکن اس کے منصب کا فائدہ میرزائیت کو پہنچ رہا ہے۔ وہ بیرونی دنیا میں پاکستان کی نمائندگی کے بجائے اپنی جماعت کی نمائندگی کا ذریعہ بنا ہوا ہے۔ اس نے بیرونی ملکوں میں قادیانی امت کے لیے سیاسی و معاشی رابطے متیا کیے ہیں۔ اگر میرزائی یہاں کامیاب ہو گئے، تو بین الاقوامی ممالک کی معرفت قادیانیت کو اندرون ملک تھخنہ ملے گا۔“

شاہ جی ان باتوں سے کسی قدر آزدہ ہو گئے۔ کہنے لگے کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ کس سے کہوں؟ اور کن سے لڑوں۔ بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اب ہمت نہیں رہی۔ کرنل صاحب بولے: شاہ جی پاکستان کو اس خطرہ سے آپ نکال سکتے ہیں۔ آپ کی چند تقریریں موجودہ حکمرانوں کے کان کھول دیں گی اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ملک فی الواقعہ کس قدر منسلک میں ہے۔ شاہ جی کچھ دیر گم سم رہے۔ یکایک دو چار ہچکیاں آئیں اور پھرہ اشکبار ہو گیا۔ پھر اس مسئلے میں دو مہینہ ماہ خود کرتے رہے اور اپریل ۱۹۴۹ء کو لاہور میں احرار کا نفرنس منعقد کی۔ اس کے بعد کانفرنس

کلی مجلس عامہ میں میرزا نیت کے مسئلہ پر غور کیا گیا۔ آخر بیٹے پایا کہ مجلس احرار کو سیاست سے سبکدوش کر دیا جائے۔ اس کا مشن صرف تبلیغی اور اصلاحی سرگرمیوں تک محدود رہے اور یہی ایک طریق ہے جس سے میرزا نیت کا بھرپور اعتبار ہو سکتا ہے۔ شاہ جی کا خیال تھا کہ احرار نے اپنا سیاسی وجود باقی رکھا تو میرزا بشیر الدین محمود کو وار کرنے میں کمزوری ہوگی اور مسلم لیگ کی لیڈر شپ کسی حالت میں بھی احرار کے سیاسی وجود کو برداشت نہیں کرے گی۔ احرار کے اس فیصلے سے میرزا بشیر الدین محمود چونکے ہوئے، لیکن اس نے اپنی عیارانہ سرگرمیوں کو جاری رکھا اور اس امر کی مطلقاً پروا نہ کی کہ عامۃ المسلمین اس سے آگاہ ہو چکے ہیں۔ میرزا بشیر الدین محمود، سرفہر اللہ خاں کی معرفت عالمی سامراج سے اس امر کا یقین حاصل کر چکا تھا کہ انہوں نے پاکستان کے لیے پاکستان میں کوئی خطرہ نہیں اور پاکستان ان کے مستقبل کا نام ہے۔

احرار نے سیاسی حیثیت ختم کرنے کے بعد تقابلیت کے اعتبار پر یکم باندھ لی اور جگہ جگہ کانفرنسیں شروع کیں۔ میرا انکوائری رپورٹ میں ان کی تفصیلات موجود ہیں۔ احرار نے میرزا نیتوں کو اقلیت قرار دینے کا اپنے ہر جلسہ اور ہر کانفرنس میں مطالبہ کیا، حتیٰ کہ چوہدری نضر اللہ خاں کو بھی اس کی پس پردہ سرگرمیوں پر آٹے ہاتھوں لیا۔ وزارت خارجہ سے اس کی سبکدوشی کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ میرزا محمود نے احرار کے خلاف اپنے حربے استعمال کرنا شروع کیے۔ وہ اس خیال میں تھا کہ احرار مرجحے ہیں اور تقابلیت کی راہ میں کوئی مزاحم نہ ہوگا، لیکن احرار نے اس شدت سے اعتبار کیا کہ میرزا محمود تھک گیا۔ اس نے کئی واسطوں سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ اکثر سرکاری مسلمانوں پہلے ہی اس کے ساتھ تھے اور سیاسی مسلمان تقابلیت کے متعلق علماء کے اعتبار کو ملا نیت گردان کر غیر جانبدار تھے۔ میرزا محمود نے سیاسی مسلمانوں کو ساتھ ملا کے رکھا۔ بعض کو ہاتھ میں لینا شروع کیا۔ کئی ایک خود فرد شمس مہمانی خرید کیے، جو احرار کے سیاسی مامی پر پاکستان دشمنی کا الزام اٹھا لیتے۔ ان کے خلاف کمائیاں وضع کرتے اور ان کی بعض تقریروں کو اپنے ڈھلے ہوئے فقروں سے داغدار کرتے۔ میرزا محمود کا شمار تھا کہ بعض افسروں کی نفی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتا، اپنے مریدوں کی معرفت ان کے لیے ناؤ نوش اور لودو لعب کی تحفیں رچاتا اور احرار کے متعلق ان کی ذہنی فضا کو مسموم کرتا۔ اس طرح کے افسر پہلے ہی انگریزی استبداد کی ذریت تھے، ان کا ذہن احرار کے متعلق دہی تھا، جو انگریز نے تیار کیا تھا۔ اس سلسلہ میں پنجاب سی۔ آئی۔ ڈی کا توہین حدودہ مذہب رہا، کیونکہ اس کے اعضاء جو ارجح میں ایک آدھ کو چھوڑ کر تقریباً سبھی برطانوی استبداد کے ذلّ غوار اور اب میرزا بشیر الدین کی مختلف الاصل تحریکات و ترغیبات کا شکار تھے۔ میرزا صاحب بدستور

اس خیال میں تھے کہ عالمی سامراج ان کی مدد کرے گا اور وہ پوچھتاں کو اپنی ریاست بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یہوں نے اپنی سیاسی مہر بازی کے لیے ۱۹۴۸ء میں کوئٹہ جاکر بعض پتے لگانا شروع کیے، لیکن انہیں اندازہ و احساس ہی نہ تھا کہ بلوچستان کا مسلمان دین کے بارے میں کس قدر زکی الحس ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ایک میرزائی میجر محمود کو جو کوئٹہ میں قادیانیت کے خلاف ایک جلسہ گاہ کا جائزہ لے رہا تھا، گئی ایک شرکار نے پکڑ کر ہلاک کر دیا۔ اس سے حکومت پاکستان کے اٹلی جنس ہیرو کو بڑی سخت تکلیف ہوئی۔ اس نے احرار کے خلاف پنجاب سی۔ آئی۔ ٹی کو لکھا کہ احرار کی سرگرمیاں پاکستان کے لیے مضرت رساں ہیں۔

مسٹر ایم۔ ایم۔ احمد منگمری (سایہ وال) میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ ان کی بدولت میرزائیوں کو حوصلہ ہوا کہ مختلف گاؤں میں جاکر تبلیغ کریں۔ اس سے مسلمانوں کا براہِ فروتنہ ہونا قدرتی امر تھا، نتیجہً اوکاڑہ میں ایک میرزائی مدرسِ فلام محمد قتل ہو گیا۔ اسی مہینہ راولپنڈی میں بدر دین نام کے ایک قادیانی کو ولایت خاں نام کے ایک مسلمان نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ میرزا بشیر الدین اندرونِ خانہ ہراساں ہوا لیکن ربوہ میں بیٹھ کر کئی طرز کی سیاسی و مذہبی سازشوں میں مشغول رہا اس کو یقین تھا کہ وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگا، کیونکہ ظفر اللہ خاں کی معرفت سامراجی طاقتوں کے سفارت خانے اُس سے رابطے قائم کیے ہوئے تھے۔ ادھر میرزا محمود نے اپنے خطبات میں احرار رہنماؤں کے متعلق جارحانہ کلمات روزمرہ بنا رکھے تھے۔ وہ بعض میرزائی عناصر سے بخت و پز کر کے احرار رہنماؤں کو قتل کروانا چاہتا تھا لیکن اُسے کوئی ایسا معتمد نہیں مل رہا تھا جو یہ کام کر سکے۔ وہ مسلمانوں کے ردِ عمل سے بھی ڈرتا تھا، لیکن اُس نے احرار کے اینٹی لیگ مافی میں پناہ لے رکھی تھی اور اسی برتے پر اشتعال انگیز تقریریں کر رہا تھا۔ اُس نے ۵ ارجوری ۱۹۵۲ء کو (مطبوعہ الفضل) اعلان کیا کہ علما ذیل سے خون کا بدلہ لیا جائے گا:

(۱) سید عطاء اللہ شاہ بخاری (۲) ملا عبدالحمید بدایونی

(۳) ملا احتشام الحق تھانوی (۴) ملا مفتی محمد شفیع

(۵) ملا مودودی

ان علما کا جرم یہ تھا کہ انہوں نے احرار کی دعوت پر میرزائیت کے غرائم کا عینی مطالعہ کیا اور قادیانیت سے متعلق مشترک لائحہ عمل میں ہم آواز ہو گئے۔ میرزا بشیر الدین اور چودھری سرفراز اللہ خاں اس قدر دلیز ہو چکے تھے کہ روز بروز مائتہ السلیین سے بے پروا ہوتے گئے۔ سرفراز اللہ خاں نے، ارمی ۱۹۵۲ء کو جہانگیر پارک

کراچی میں قادیانی اُمت کے ایک جلسہ عام سے خطاب کرنے کا اعلان کیا مسلمانوں نے اسے اپنے لیے چیلنج سمجھا اور مساجد میں اس پر احتجاج کیا۔

خواجہ ناظم الدین وزیراعظم پاکستان نے اٹلی جنس بیورو کی رپورٹ پر چوہدری نضر اللہ خاں کو جلسہ میں شریک ہونے سے منع کیا، لیکن چوہدری صاحب استعمار کے گھوڑے پر سوار تھے۔ اپنے وزیراعظم کی بات نہ مانی۔ اُن سے کہا کہ وہ (خواجہ صاحب) اس بات پر مضمحل ہوں، تو وہ اپنے عہدے سے استعفیٰ دینے کو تیار ہے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب امریکی وزیر خارجہ نے وزیراعظم پاکستان کو یہ تاثر دیا کہ چوہدری نضر اللہ خاں کو راضی نہ رکھا گیا تو امریکہ پاکستان کی مدد کرنے کو تیار نہ ہوگا، حتیٰ کہ گندم مہیا کرنا مشکل ہو جائے گا۔ جس کی پاکستان کو اس وقت سخت ضرورت ہے۔ اس کا انکشاف خواجہ صاحب نے انکو آئری کیمٹی کے روبرو شہادت دیتے ہوئے کیا۔ چوہدری نضر اللہ خاں نے کراچی کے جلسہ عام میں کہا کہ ”احمدیت ایک ایسا پودا ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود لگایا ہے۔ اب وہ جڑ پکڑ گیا ہے۔ اگر یہ پودا اکھاڑ دیا گیا، تو اسلام ایک زندہ مذہب کی حیثیت سے باقی نہ رہے گا، بلکہ ایک سڑکے ہوئے درخت کی مانند ہو جائے گا اور دوسرے مذاہب پر اپنی برتری کا ثبوت مہیا نہ کر سکے گا۔“ (تحقیقاتی رپورٹ اردو متن ص ۷۷) اس سند کے رد عمل میں فساد ہو گیا، نتیجتاً مرزائیوں کی بعض عمارتوں کو نقصان پہنچا۔ اصرار یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ اُنہوں نے محسوس کیا کہ پانی سرسے گزر چکا ہے اور میرزائی مٹنے زوری کے علاوہ سینہ زد ہی پرتل گئے ہیں، تو مولانا لال حسین اختر نے کراچی میں مختلف مکاتیب فکر کے علماء کی ایک میٹنگ بلائی۔ ان کے سامنے تمام واقعات رکھے اور ۳۱ جون ۱۹۵۲ء کو ایک مجلس مشاورت طلب کی۔ اس کے دعوت نامے پر مولانا احتشام الحق نقانوی، مولانا عبدالحمید بدایونی، مولانا یوسف گلکستوی اور مولانا لال حسین اختر کے دستخط تھے۔ اس مجلس مشاورت نے ذیل کے مطالبات مرتب کیے:

(۱) قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔

(۲) چوہدری نضر اللہ خاں کو وزیر خارجہ کے عہدے سے سبکدوش کیا جائے۔

(۳) تمام کلیدی عہدوں سے احمدیوں کو ہٹایا جائے۔

اس غرض سے آل پاکستان مسلم پارٹی کو کنونشن بلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے اجلاس

کی صدارت فرمائی اور کنونشن منعقد کرنے کے لیے ایک بورڈ مقرر کیا گیا، اُس کے ارکان حرب ذیل تھے: علامہ سید سلیمان ندوی، مفتی محمد شفیع، مولانا عبدالحمید بدایونی، علامہ یوسف گلکستوی، علامہ مفتی محمد شفیع

مولانا سلطان احمد، مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا لال حسین اختر، الحاج ہاشم گزدر اور مفتی جعفر حسین مجتہد۔ مولانا
اتشام الحق مقانوی کنوینر مقرر ہوئے۔ الحاج محمد ہاشم گزدر کے مکان پر بورڈ کا اجلاس ۱۳ جولائی ۱۹۵۲ء
کو ہوا۔ مندرجہ ذیل چودہ جماعتوں کو آل پارٹیز کنونشن میں شمول کے لیے دعوت نامے جاری کرنے کا فیصلہ
کیا گیا :

- | | |
|---------------------------|--------------------------------|
| (۱) جمعیت العلماء پاکستان | (۲) جمعیتہ العلماء اسلام |
| (۳) جماعت اسلامی | (۴) تنظیم اہلسنت والجماعت |
| (۵) جمعیتہ اصل سنت | (۶) جمعیت اہل حدیث |
| (۷) مؤتمر اہل حدیث پنجاب | (۸) ادارہ تحفظ حقوق شیعہ پنجاب |
| (۹) مجلس تحفظ ختم نبوت | (۱۰) مجلس احرار اسلام |
| (۱۱) جمعیتہ العربیہ | (۱۲) جمعیتہ الفلاح |

سید عطاء اللہ بخاری میراثی سیاست کے آثار پر چڑھاؤ کا ملحق مطالعہ کر رہے تھے۔ انہوں نے رفقہ کو
ہدایت کی کہ ہر مکتبہ خیال کے علماء سے مل کر انہیں قادیانی اُمت کے عزائم سے آگاہ کریں۔ پھر اس خطرے کا مقابلہ
کرنے کے لیے جو راتے سب کی ہو، اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ اس طرز سے شاہ جی نے ۱۳ جولائی ۱۹۵۲ء
ہی کو لاہور میں آل مسلم پارٹیز کانفرنس منعقد کی جس میں ممبر بھر کے علماء و دانشور نے شرکت کی۔ اس غرض سے جو
دعوت نامہ جاری کیا گیا، اس پر مولانا غلام محمد زکریا، مفتی محمد حسن، مولانا احمد علی، مولانا محمد علی جالندہری، مولانا داؤد
غزنوی، مولانا نور الحسن بخاری اور سید مظفر علی سمسی کے دستخط تھے۔ اس کانفرنس میں میرزا نیوں کو اقلیت قرار دیئے جانے، سید مظفر اللہ
حضرت سید غلام علی الدین شاہ تشریف لائے۔ اس کانفرنس میں میرزا نیوں کو اقلیت قرار دیئے جانے، سید مظفر اللہ
کو وزارت خارجہ سے ہٹائے جانے اور قادیانی افسروں کو کلیدی آسامیوں سے الگ کیے جانے کا مطالبہ کیا
گیا۔ دھوکہ کراچی میں ۱۳ جولائی ہی کو اس امر کا فیصلہ کیا گیا کہ مسئلہ قادیانیت پر آخری غور و خوض کرنے کے لیے
۱۶، ۱۷، ۱۸ جنوری ۱۹۵۳ء کو کراچی میں تمام مکاتیب فکر کی کنونشن منعقد کی جائے۔ اس ابتدائی اجتماع میں
شرکت کے لیے مولانا ابوالحسن قادری، شیخ حسام الدین، ماسٹر تاج الدین انصاری اور مولانا رفیع احمد بخش
لاہور سے کراچی گئے اور کنونشن کی تیاریوں کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ یہ کوئی معمولی چیز نہ تھی، بلکہ میرزا نیوں
کے شدید استغاب کی طرف ایک فیصلہ کن اقدام تھا، چونکہ یہ سب کچھ احرار و نہادوں کی مساعی سے ہو رہا تھا، لہذا

میرزا بشیر الدین محمود احرار کے خلاف محاذ قائم کیے ہوئے تھے اور ان کی ملی جھگت سے احرار کے خلاف مقدمات قائم کیے جا رہے تھے؛ چنانچہ شیخ حسام الدین، ماسٹر تاج الدین انصاری اور سید عنایت شاہ بخاری وغیرہ گرفتار کیے گئے۔ اس افسر شاہی کا عیاذہ ۱۸ جولائی ۱۹۵۲ء کو اہل عمان نے جھگتا کہ متنازعہ کپ کے باہر پولیس نے احتجاجی جلوس پر فائرنگ کی، جس سے تین آدمی شہید اور تیرہ زخمی ہو گئے۔ ان زخمیوں میں سے بھی تین ہسپتال میں دم توڑ گئے۔ لاہور ہائی کورٹ کے ایک جج کو انکوائری پر مامور کیا گیا۔ اُس نے پولیس فائرنگ کی حمایت کی، لیکن ان شہیدوں کا خون رنگ لایا۔ تمام صوبے میں میرزائیوں کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی؛ حتیٰ کہ پنجاب مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے بھی میرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کا ریزولوشن پاس کیا۔ اس سلسلے میں عوام کے جذبات کا یہ حال تھا کہ منیر انکوائری رپورٹ کے مطابق ۶ مارچ ۱۹۵۳ء سے پہلے صوبہ بھر میں ۳۹ جلے منعقد ہوئے تھے جن میں سے ۱۶ کا استقامت مجلس احرار کی مختلف شاخوں نے کیا اور ان میں محمولہ بالا مطالبات کی تائید کی گئی۔ جو علماء کرامی کا نفرنس میں شریک ہوتے وہ یہ تھے:

(۱) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (۲) سید عطاء اللہ شاہ بخاری (۳) مولانا ابوالحسنات قادری

(۴) مولانا مجید ریفت، نوری (۵) مولانا احمد علی لاہوری (۶) مولانا ابراہیم میر سیالکوٹ

(۷) مولانا شمس الحق وزیر معارف و اوقاف (۸) خلیفہ حاجی ترنگ زئی، پشاور۔

(۹) پیر سید شریف ڈھاکہ (۱۰) مولانا راغب حسین ایم اے ڈھاکہ (۱۱) مولانا اظہر علی ڈھاکہ

(۱۲) مولانا سخاوت الانبیاء ڈھاکہ (۱۳) مولانا محمد امین امیر محبت تاجیہ (۱۴) مولانا عزیز الرحمن

ناظم حزب اللہ ڈھاکہ (۱۵) مفتی محمد حسن جامعہ اشرفیہ لاہور (۱۶) مولانا محمد ادریس کامرہلوی

(۱۷) مولانا ظفر احمد عثمانی (۱۸) علامہ سید سلیمان ندوی (۱۹) مفتی محمد شفیع دیوبندی

(۲۰) مولانا سلطان احمد امیر جامعہ اسلامی (۲۱) مولانا مفتی صاحب خان صاحب سندھ ریکارڈ

(۲۲) مولانا عبدالحمید بدایونی (۲۳) مولانا محمد یوسف کلکتہ (۲۴) مولانا محمد اسماعیل گوجرانولہ

(۲۵) مولانا سید محمد داؤد غزنوی (۲۶) مولانا محمد علی جالندھری (۲۷) مولانا احتشام الحق مقلانوی۔

(۱) اس کا نفرنس میں خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم پاکستان کے ردیہ کو منفی قرار دے کر راست اقدام

کا فیصلہ کیا گیا۔

(۲) قادیانی فرستے کے کامل مقابلہ کی تجویز پاس کی گئی۔

(۳) چونکہ خواجہ ناظم الدین، سید مظفر اللہ خاں کو برطرف کرنے پر راضی نہ تھے، اس لیے ان سے استعفیٰ کا مطالبہ کیا گیا۔
 (۴) کئی ایک مقتدر مسلمانوں اور مختلف مذہبی جماعتوں کے نمائندوں کی ایک جنرل کونسل بنائی گئی۔ اس میں سے چند ممبروں کو مجلس عمل کا رکن قرار دیا گیا۔ پہلے آٹھ اور پھر سات ممبر منتخب کیے گئے، جو حسب ذیل تھے:

- | | |
|-------------------------------------|--|
| (۱) سید عطاء اللہ شاہ بخاری | (۲) مولانا ابوالحسنات قادری |
| (۳) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی | (۴) مولانا عبدالحماد بدایونی |
| (۵) حافظ کفایت حسین | (۶) پیر صاحب سرسینہ شریف مشرقی پاکستان |
| (۷) مولانا محمد یوسف کلکتوی | (۸) مولانا احتشام الحق تھانوی |
| (۹) پیر غلام مجدد سرہندی | (۱۰) مولانا نور الحسن |
| (۱۱) ماسٹر تاج الدین انصاری | (۱۲) مولانا اختر علی خاں |
| (۱۳) مولانا محمد اسماعیل گوجرانوالہ | (۱۴) سید مظفر علی شمس |
| (۱۵) حاجی محمد امین سرحدی | |

خواجہ ناظم الدین سے ملاقات کے لیے پیر صاحب سرسینہ شریف، مولانا عبدالحماد بدایونی اور ماسٹر تاج الدین انصاری پر مشتمل ایک وفد مرتب کیا گیا اس کی خواجہ صاحب نے ۲۱ جنوری ۱۹۵۳ء کو ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مطالبات پر ہمدردی کا اظہار کیا، لیکن فرمایا کہ وہ ان مطالبات کو تسلیم کرنے سے قاصر ہیں۔ خواجہ صاحب ۲۹ فروری ۱۹۵۳ء کو لاہور آئے، تو مولانا اختر علی خاں، مولانا ابوالحسنات قادری، سید مظفر علی شمس اور ماسٹر تاج الدین پر مشتمل ایک دوسرے وفد نے ان سے ملاقات کی، لیکن خواجہ صاحب نے وہی عذر کیا کہ بعض مشکلات کے پیش نظر وہ ان مطالبات کو تسلیم کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ اُدھر کراچی میں علماء کا ایک وفد، جس میں علامہ سلیمان ندوی، مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا مفتی محمد سعید، مولانا عبدالحماد بدایونی اور مولانا اختر علی خاں شامل تھے، خواجہ صاحب سے ملا اس وفد کو بھی خواجہ صاحب نے وہی جواب دیا۔ اس سے اگلے روز ماسٹر تاج الدین انصاری، مولانا ابوالحسنات اور سید مظفر علی شمس نے سردار عبدالرشید کی موجودگی میں خواجہ صاحب ملاقات کی اور اتمامِ محبت کیا کہ ایک مہینہ گزر چکا ہے، لیکن خواجہ صاحب اپنے جواب پر قائم رہے۔ فرمایا کہ میزبانیوں کو چھڑانے سے امریکہ میں گندم نہیں بیجے گا اور نہ مسکند کشمیر کے محل میں ہماری مدد کسے گا۔ جب خواجہ صاحب کے دو ٹوک جواب مجلس عمل کے راہ نمایوں سے ہو گئے، تو ۲۶ فروری ۱۹۵۳ء کو اس پر غور و خوض کرنے کے لیے کراچی میں اجلاس بلا دیا گیا۔

اس اجلاس میں سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، ماسٹر تاج الدین انصاری، صاحبزادہ فیض الحسن، سید نور الحسن بخاری، مولانا سلطان احمد امیر جماعت اسلامی سندھ، مولانا عبدالحمید بدایونی، مولانا احتشام الحق مصطفوی، مولانا محمد یوسف کلکتوی، اور سید مظفر علی شمس شریک ہوئے۔ مولانا ابوالحسنات نے صدارت کی اور فیصلہ کیا کہ راست اقدام کی شکل کیا ہو؟

پانچ رضا کار مطالبات کے جھنڈے اٹھا کر وزیر اعظم کی کوٹھی پر جائیں اور پُر امن رہ کر لگانا مظاہرہ کریں۔ اسی قسم کا مظاہرہ گورنر جنرل کی کوٹھی پر جاری رہے۔ مولانا ابوالحسنات کو پہلا ڈکٹیٹر مقرر کیا گیا اور عوام سے اپیل کی گئی کہ وہ رضا کاروں کے ساتھ مطلقاً نہ جائیں۔ حکومت نے ۲۶، ۲۷ فروری کی درمیانی رات کو سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور ان کے رفقاء کو گرفتار کر لیا۔ جن میں ماسٹر تاج الدین انصاری، سید مظفر علی شمس، مولانا لال حسین اختر، مولانا ابوالحسنات قادری اور مولانا عبدالحمید بدایونی وغیرہم بھی تھے۔ اُس سے اگلے روز پنجاب میں اصرار کے تمام متعلقین پکڑ کر جیلوں میں ڈال دیے گئے، جس سے صوبہ بھر میں بے بسی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اسی سلسلہ میں لاہور، گوجرانوالہ، سیالکوٹ اور لائل پور میں پکڑ دھکڑ کا طوفان اُگیا۔ یہی فضا راولپنڈی اور منٹگری میں پیدا ہوئی۔ ہر جگہ حکومت نے ٹکراؤ ہونے لگا۔ مولانا تاج محمود لائل پور میں تحریک کے راہ نمائے۔ انہوں نے انتظامیہ کو معطل کر دیا۔ اس سلسلے کی پوری روداد ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے علیحدہ باب میں بیان کی جائے گی۔

منظریہ پنجاب پولیس کے اوسان خطا ہو گئے۔ کئی شہروں میں ڈپٹی کمشنروں کو ان کے تشدد کے باعث عوام نے گدھوں پر سوار کر دیا اور پھرایا۔ جب صوبائی نظم و نسق بالکل معطل ہو گیا تو مرکزی حکومت کے رنگارنگ وزیر اور اعلیٰ حکام لاہور آ گئے۔ ملک غلام محمد گورنر جنرل کا دماغ بے ٹھکانہ ہو گیا۔ اس زمانے میں اسکندر مرزا ڈیفنس سیکرٹری تھے ان سب کی قیادت سے ۲۶ مارچ ۱۹۵۳ء کو لاہور میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ سارا شرفوج کے انتظام میں آ گیا غرض قادیانیت کے خلاف یہ سب سے بڑی تحریک تھی۔ جو پاکستان میں مل اور حکومت نے اپنے ہیما تشدد کا پورا پورا مظاہرہ کیا۔ اس کی تفصیلات ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے تحت کسی اگلے باب میں آئیں گی۔ شاہ جی اپنے ساتھیوں سمیت پہلے کراچی سنٹرل جیل میں رکھے گئے۔ پھر سکھر جیل میں بھجوا دیا گیا۔ جہاں اُن سے آخری بیماری چمٹ گئی۔ منیر انکوائری کمیٹی نے کام شروع کیا تو شاہ جی ۲۵ جولائی ۱۹۵۳ء کو لاہور سنٹرل جیل میں منتقل کر دیئے گئے

میاں محمود علی قصوری نے لاہور ہائی کورٹ میں شاہ جی نظر بندی کے خلاف رٹ دائر کر دی۔ جسٹس ایس۔ اے رحمن نے قانونی غلطی کا فائدہ دیکر ۱۸ جنوری ۱۹۵۴ء کو شاہ جی اور اُن کے ساتھیوں کو رہا کر دیا۔ شاہ جی نے رہا ہوتے ہی اپنی پہلی تقریر میں جسٹس منیر کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اسی سال اُنہیں مجلس تحفظ ختم نبوت کا صدر منتخب کیا گیا۔ آپ نے ایک جلد آکھ میں

اعلان کیا کہ میں آج بھی اور حشر کے دن بھی اُن تمام شیعہوں کے عُرن کا دُور دار ہوں، جنہیں مثنیٰ نبوت کی پاداش میں اسلامی سلطنت کے ہلاک و خانوں نے قتل کیا ہے۔ یہ کوئی نئی چیز نہیں۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے بھی اپنے زمانے میں سات ہزار حافظ قرآن صحابہ کو عہد نبوت کی خاطر شیعہ کر لیا تھا۔ شاہ جی کو حکومت کے ہیما نہ تشدد پر انتہائی عفتہ تھا اور تحریک کے سبوتاژ کیے جانے پر سخت غمزدہ تھے۔ ہمیشہ حکومت پر کردی تنقید کرتے۔ حکومت نے ۱۹۵۵ء میں انہیں ۶ ماہ کے لیے گھر میں نظر بند کیا گیا۔ پھر ۱۴ اپریل ۱۹۵۵ء کو خانیوال کی تقریر میں پکڑ لیا۔ کوئی پانچ چھ ماہ مقدمہ چلتا رہا۔ اسی دوران میں سکند رام زرنے بطور صدر پاکستان سید مظفر علی شمس کی معرفت شاہ جی سے ملاقات کی خواہش کی، لیکن شاہ جی مال گئے اتنا آنکھ ۱۹۵۶ء کے آخر میں ان کے جہانی عوارض نمود کرتے اور وہ ایک طویل بیماری کا شکار ہو گئے۔ پھر ۱۴ مارچ ۱۹۶۱ء کو ان پر فالج کا شدید حملہ ہوا اور ۲۱ اگست کی شام کو ۶ بجکر ۵۵ منٹ پر تحریک ختم نبوت کا سبب بڑا قائد ۲۴ برس کی لازوال جد و جہد کے بعد اس فانی کائنات سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔

احرار اپنے سیاسی عمل سے دستبردار ہو چکے تھے اور صرف قادیانیت اُن کی جد و جہد کا محور تھا، لیکن ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں قادیانی اور سرکاری دوائر سے اُن کے خلاف بے پناہ گورہ باری کی گئی اور ظلم فروش دانشوروں کا ایک طائفہ اُن کے متعلق خرافات نگاری میں مشغول ہو گیا۔ اس سلسلے میں حکومت نے بے شمار روپیہ صرف کیا اور اُن تمام بے دین تلمکاروں کو سرکاری خزانے سے نوازا جو اس تحریک کی رسوائی کے لیے احرار کو مطعون کرنے کا ملکہ رکھتے تھے۔ المنقر قادیانیت کا محاسب پاکستان دشمنی قرار دیا گیا۔ سب سے زیادہ انفوسناک مینرا انکوائری رپورٹ تھی۔ جسٹس مینر نے تحقیقات کے دوران میں نہ صرف علماء کا استہزاء کیا بلکہ چیف جسٹس ہونے کے زعم میں اسلام کے خلاف ایک ایسی دستاویز مرتب کی جس سے یورپ کے عیسائی حلقوں نے بے لگام ہو کر فائدہ اٹھانا چاہا۔ یہ ایک ایسی رپورٹ تھی کہ اس کے خلاف کئی ایک سلمان دانشوروں نے، جو تحریک ختم نبوت میں شامل نہ تھے اور جنہیں احرار سے عمر بھر سیاسی اختلافات تھے۔ اس کے خلاف اپنے بعض مقالوں، کئی کتابوں اور اکثر تقریروں میں احتجاج کیا۔ جسٹس مینر نے سب سے زیادہ عفتہ احرار کے خلاف نکالا اور اُن کے متعلق اس قسم کی لغو زبان استعمال کی کہ اس طرح کی زبان استعمال کرنے کا اصولہ کبھی بشیر الدین محمود کو بھی نہ ہوا تھا۔

بہر حال ختم نبوت کی تحریک لوہار کی آتشک جہد و جد کا نتیجہ تھی۔ انہوں نے اسلام کے ایک بنیادی مسئلے پر تمام مکاتیب فکر کے علماء کو یکجا اور ایک ایسی تحریک کی یو اٹھائی جس وقت کے لادین دزدان اور عیاش افسروں کے تم کا شکار ہو گئی، لیکن مسلمانوں کے دل و دماغ میں ہمیشہ کے لیے قادیانیت سے متفرج راسخ ہو گیا۔ فی الجملہ احرار کے اس اقتدار کو سلب کرنا ناممکن ہے کہ وہ اس تحریک کے مرخیل تھے۔

علامہ اقبال کا تاریخی بیان؛

علامہ اقبال کے بیانات و ارشادات قادیانی خط و خال پر حرف آخر تھے، آپ کے دو بیانیوں میں نے قادیانی حصار توڑ ڈالا۔ جن مغربی تعلیم یافتہ مسلمانوں کے نزدیک قادیانی، ملت اسلامیہ کا فرقہ تھے، اور ان کے نزدیک قادیانی عقائد کے خلاف احتسابی تحریکیں منبر و محراب کا خاصہ تھیں، انہیں بخوبی معلوم ہو گیا کہ میرزا نیت کا اور چہرہ کیا ہے؟ اس کے مذہبی مضامین اور سیاسی مضمرات کیا ہیں؟ کن عوامل نے اس کو جنم دیا اور اس کا وجود کن مقاصد کے تابع ہے؟ جن خواص کے اذہان قادیانیت کے مسئلہ میں روادار تھے، یا وہ اپنی یورپی ذہانت کے باعث متنبذ تھے، یا ان میں کچھ لوگ اساسات اسلام سے بے خبر ہونے کے باعث قادیانیوں کو مسلمان خیال کرتے تھے، انہیں ملاحظہ معلوم ہو گیا کہ میرزا غلام احمد کی استغاری نبوت، لیکن مصالح کی پیداوار تھی، اس کی امت نئی الراقہ دائرہ اسلام سے خارج ہے اور قادیانی العقیدہ افراد ایک حدیگانہ اقلیت ہیں۔ ان بیانیوں کے بعد مسلمان خواص نے قادیانی امت کو عقیدہ اپنے ذہن سے خارج کر ڈالا اور صرف وہ سرکاری و سیاسی مسلمان اس کیساتھ رہ گئے جو مذہب سے متنفر، لیکن عمرانی طور پر مسلمان تھے یا وہ لوگ جنہیں قادیانی امت سے کسی دائرے میں کوئی فائدہ پہنچتا تھا اس طرز کے سرکاری و سیاسی مسلمان سات کروڑ مسلمانوں میں چند ہزار سے زائد نہ تھے۔

علامہ انبال قادیانیت سے متعلق کبھی خوش رائے نہ تھے، لیکن اس کے مضمرات کا مطالعہ انہوں نے آل انڈیا

کشمیریٹ کے تجرباتی دور ۱۹۳۱-۳۲ء میں کیا۔ میرزا بشیر الدین محمود کیٹی کے صدر تھے۔ علامہ اقبال ان کے شرعی اعلیٰ تلموں اور سیاسی و ادبی سے بیزار ہو گئے۔ میرزا نے ۲۵ جولائی ۱۹۳۱ء کو بعض مسلمان اکابر کو جمع کیا، پھر ان سے مل کر آل انڈیا کشمیریٹ قائم کیا، لیکن علامہ اقبال اور ان کے بارہ احباب مثلاً سید عمن شاہ ایڈوکیٹ اور خان بہادر حاجی رحیم بخش وغیرہم پر جلد آشکار ہو گیا کہ میرزا بشیر الدین محمود اپنی امت کی معرفت کیا کھلا رہا اور کیا ناکم کھیل رہا ہے۔ انہوں نے کیٹی کو لکھ دیا کہ آئندہ کنٹری کمیٹی کا صدر غیر قادیانی ہو۔ اس پر ۱۷ مئی ۱۹۳۲ء کو لاہور سسٹل ہوٹل میں میرزا بشیر الدین محمود مستعفی ہو گیا۔ علامہ اقبال صدر منتخب کئے گئے، لیکن علامہ نے محسوس کیا کہ میرزا یوں نے ایک ایسا جال بچھا رکھا ہے جس سے کشمیریٹ کی افادیت ختم ہو چکی ہے۔ آپ نے ۲۰ جون ۱۹۳۳ء کو صدارت سے استعفیٰ دیدیا اور ایک پریس بیان میں کہا کہ

"بد قسمتی سے کمیٹی میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے مذہبی فرقے (قادیانیت)

کے امیر کے سوا کسی دوسرے کا اتباع کرنا سرے سے گناہ سمجھتے ہیں۔ مجھے ایسے شخص سے ہمدردی ہے جو کسی روحانی سہارے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کسی مقبرے کا مہاجر باکسی زندہ نام نہاد پیر کا مرید بن جائے۔"

علامہ اقبال کا یہ بیان ۲۰ جون ۱۹۳۳ء کو شائع ہوا، دوسرا بیان ۲ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو جاری کیا، جس میں صدارت سے اپنی دستکشی کا سبب بیان کرتے ہوئے قادیانی امت کے پوشیدہ اغراض پر اشارات کئے کہ تحریک کشمیر کی آڑ میں اس نے اپنا دام تنزدیز بچھا کر مسلمانوں کو شکار کرنا چاہا، اس کے بعد علامہ قادیانیت کے بالاستیعاب مطالعہ میں مشغول ہو گئے اور سید سلیمان ندوی، علامہ انور شاہ اور سید نامہ علی شاہ کو خطوط لکھے کہ بعض استفسارات کئے۔ پہلا بیان ۳ مئی ۱۹۳۵ء کو جاری کیا۔ اس سے قادیانی قلم میں تھر تھری پیدا ہو گئی۔ انگریزوں کا مضطرب ہونا طبعی امر تھا کہ ان کی تخلیق کا مسئلہ تھا۔ دھرم پنڈت جواہر لال نہرو نے میرزائی امت کے دفاع میں "ماڈرن ریویو" کلمتہ میں تین مقالے تحریر کئے۔ علامہ نے ان مقالوں کے جواب میں 'اسلام اور حسدیت' کے زیر عنوان ایک معرکہ آرا مقالہ لکھا، پنڈت جواہر لال نہرو خاموش ہو گئے، لیکن خود قادیانی فضلا رہیں اس مقالہ کے علمی نکات اور واضح سوالات کا جواب نہ دے سکے، علامہ نے پنڈت جواہر لال نہرو کو اپنے ایک نجی خط عمرہ ۲۱ جون ۱۹۳۶ء میں لکھا کہ مرے ذہن میں اس سے متعلق کوئی ابہام نہیں کہ احمدی اسلام اور ہندوستان دونوں کے فدا رہیں، سید سلیمان ندوی کے نام علامہ

نے اپنے ایک خط محررہ، ۱۹۳۶ء میں لکھا "الحمد للہ اب قادیانی فتنہ پنجاب میں رفتہ رفتہ کم ہورہا ہے۔" مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی دو تین بیان چھپوائے ہیں۔

وہ بیان کہاں چھپے؟ راقم تلاش بسیار کے باوجود ان کا پتہ لگانے سے قاصر رہا، وہ بیان مل جاتے تو اس کتاب میں شریک ہو سکتے تھے۔

علامہ اقبال کا پہلا بیان

قادیانیوں اور جمہور مسلمانوں کی نزاع نے جو مسند پیدا کیا ہے وہ نہایت اہم ہے اور ہندوستان نے اس کی اہمیت کو حال ہی میں محسوس کرنا شروع کیا ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ ایک کھل چٹھی کے ذریعہ انگریز قوم کو اس مسند کی معاشرتی اور سیاسی الجھنوں سے آگاہ کروں، لیکن افسوس کہ میری صحت نے ساتھ نہ دیا، البتہ فی الوقت ایک ایسے مسند کے متعلق جو میرے نزدیک ہندی مسلمانوں کی پوری زندگی کو متاثر کرتا ہے، میں بسرت مختصراً کچھ عرض کروں گا، لیکن آغاز ہی میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں کسی مذہبی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا اور نہ میں قادیانی تحریک کے بانی کا نفسیاتی تجزیہ کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ پہلی چیز سے ان لوگوں کو کوئی دلچسپی نہیں جن کے لیے یہ بیان جاری کیا جا رہا ہے اور دوسری کے لیے ہندوستان میں ابھی وقت نہیں آیا۔ میرا نقطہ نظر تاریخ کے علاوہ موازنہ مذاہب کے ایک طالب علم کا ہے ہندوستان مختلف مذاہب اقوام کی سرزمین ہے۔ اسلام دینی حیثیت سے ان تمام مذاہب کی نسبت زیادہ گہرا ہے جو جزوی طور پر مذہب اور جزوی طور پر نسل سے تشکیل پاتے ہیں۔ اسلام نسلی تمیز و تصور کی کمالاً نفی کرتا اور اپنی اساس قطعاً دینی اعتقاد پر رکھتا ہے؛ چونکہ اس کی اساس ہی دینی ہے جو سرتاپا روحانیت ہے، اس لیے خفی رشتوں سے کہیں زیادہ لطیف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان ایسی تمام تحریکوں کے بارے میں بہت زیادہ حساس ہیں جنہیں وہ اپنی اساسی وحدت کے لیے خطرناک سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ہر ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور پر اسلام سے وابستہ ہے، لیکن اپنی بنیاد کسی نئی نبوت پر رکھتی اور ان تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیتی ہے جو اس کے مینہ الامانات پر اعتقاد نہیں رکھتے، مسلمان اس جماعت کو اسلام کی وحدت کے لیے ایک خطرہ تصور کرتے ہیں اور ایسا ہونا بھی چاہیے، کیونکہ وحدت اسلامی کا تحفظ ختم نبوت کے عقیدہ ہی سے ممکن ہے۔

انسانیت کی تمدنی تاریخ میں ختم نبوت کا تخیل اولین ہونے کے علاوہ تکمیل و تخلیق ہے۔ اس کی صحیح اہمیت کا اندازہ مغرب اور وسط ایشیا کے قبل از اسلام کے موبدانہ تمدن کی تاریخ کے بغور مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے۔ جدید تحقیق کے مطابق موبدانہ تمدن میں زرتشتی، یہودی، نصرانی اور صابی تمام مذاہب شامل ہیں، ان تمام مذاہب میں نبوت کے تسلسل و اجراء کا تصور نہایت لازم تھا، اس لیے وہ مسلسل انتظار کی کیفیت میں رہتے تھے۔ موبدانہ انسان کی یہ حالت انتظار غالباً نفسیاتی خط کا باعث تھی۔ عہد جدید کا انسان روحانی طور پر موبدیت سے بہت زیادہ آزاد فہم ہے۔ موبدانہ رویت کا نتیجہ یہ تھا کہ پرانی جماعتیں ختم ہوتیں اور ان کی جگہ مذہبی عیار (سٹڈ بان) نئی جماعتیں لاکھڑی کرتے۔ اسلام کی جدید دنیا میں جاہل اور جوشیلے ملاؤں نے جدید پریس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انتہائی ڈھٹائی سے بیسویں صدی میں قبل از اسلام کے موبدانہ نظریات کو رائج کرنا چاہا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اسلام جو تمام قومیتوں کو ایک ہی رستی میں پروردگار کا دعویٰ رکھتا ہے، ایسی تحریک کے ساتھ کوئی بہم رومی نہیں رکھ سکتا جو اس کی موجودہ وحدت کے لیے خطرہ ہو اور مستقبل میں انسانی معاشرہ میں مزید افتراق و انتشار کا باعث بنے۔

قبل از اسلام کی موبدیت کے احیاء کی دو صورتوں میں سے میرے نزدیک ہائیت و اقداریت سے کہیں زیادہ مخلص ہے کیونکہ وہ کھلے طور پر اسلام سے باغی ہے، لیکن مؤخر الذکر اسلام کی چند نہایت اہم صورتوں کو ظاہری طور پر قائم رکھتی، مگر باطنی طور پر اسلام کی روح اور مقاصد کے لیے انتہائی ملک ہے اس کا حاسد خدا کا تصور جس کے پاس مخالفین کے لیے لاتعداد زلزلے اور بیماریاں ہیں اور نبی سے متعلق نبوی کا تخیل اور روح مسیح کے لیے تسلسل کا عقیدہ۔ یہ سب اس قدر یہودیانہ ہیں کہ اس تحریک کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ ابتدائی یہودیت کی طرف رجوع کر رہی ہے۔ روح مسیح کا تسلسل مثبت یہودیت کی نسبت یہودی باطنیت کا جز ہے، پولی مسیح بال شیم (BAAL SHAM) کی تحریک کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر روبر لکھتا ہے ”کہا جاتا ہے کہ مسیح کی روح پیغمبروں اور صالح آدمیوں کے ایک طویل سلسلہ (جنہیں دور حاضر میں صادق کہا جاتا ہے) کے واسطے سے زمین پر اُترتی۔ اسلامی ایران میں قبل از اسلام کے موبدانہ اثرات کے تحت جو محمدانہ تحریکیں اٹھیں۔ انہوں نے تناسخ کے اس تصور کو چھپانے کے لیے ”بروز“، ”حلول“ اور ”ظلی“ وغیرہ کی اصطلاحات وضع کیں۔ موبدانہ نظریہ کی وضاحت کے لیے نئی اصطلاحات کا وضع کرنا اس لیے ضروری تھا کہ وہ مسلمانوں کے قلوب کو ناگوار نہ گزریں۔ حتیٰ کہ ”مسیح موعود“ کی اصطلاح بھی اسلامی نہیں

بلکہ اجنبی ہے اور اس کا مبداء بھی قبل از اسلام کا موجدانہ تصور ہے۔

یہ اصطلاح ہمیں اسلام کے دورِ اول کے دینی اور تاریخی ادب میں نہیں ملتی۔ اس حیرت انگیز حقیقت کا انکشاف پروفیسر وانگ نے اپنی کتاب موسومہ "احادیث نبوی میں ربط" میں کیا ہے۔ یہ کتاب احادیث کے گیارہ مجرعوں اور اسلام کے تین اولین تاریخی شواہد پر حاوی ہے۔ اور یہ بات ہر شخص باسانی سمجھ سکتا ہے کہ اسلام نے اس اصطلاح کو کیوں استعمال نہ کیا؟ یہ اصطلاح غالباً انھیں اس لیے قبول نہ تھی کہ اس سے تاریخی عمل کا غلط نظریہ قائم ہونا تھا۔ موجدانہ ذہن و قوت کو مدور حرکت تصور کرنا تھا، لیکن صحیح تاریخی عمل کو بحیثیت ایک تخلیقی حرکت کے ظاہر کرنے کی عظیم سعادت مسلمان مفکر اور مورخ ابن خلدون کے حصہ میں آئی۔

ہندی مسلمانوں نے قادیانی تحریک کے خلاف جس شدت احساس کا ثبوت دیا ہے وہ جدید اجتماعات کے طالب علم پر بالکل واضح ہے۔ عام مسلمان جیسے پچھلے ہی دنوں ایک صاحب نے "سول اینڈ میٹری گزٹ" میں طائرہ کا خطاب دیا تھا، اس تحریک کی مخالفت زیادہ تر حفظ نفس کے احساس کے تحت کر رہا ہے کیونکہ اسے عقیدہ ختم نبوت کے معانی و مطالب پر پوری دسترس نہیں۔ نام نہاد تعلیم یافتہ مسلمانوں نے اسلام میں ختم نبوت کے عقیدہ کے تمدنی پہلوؤں کو سمجھنے کی کوئی سعی حقیقی کوشش کبھی نہیں کی، حتیٰ کہ مغربیت کی سست رو اور غیر محسوس اثر پذیریری نے انھیں حفظ نفس کے جذبہ ہی سے عاری کر دیا ہے۔ بعض نام نہاد تعلیم یافتہ مسلمان اس حد تک آگے بڑھ گئے ہیں کہ اس معاملہ میں اپنے مسلمان بھائیوں کو رواداری کا مشورہ دے رہے ہیں۔ میں ہر برٹ ایرسن (گورنر پنجاب) کو تبلیغ و تلقین رواداری پر معذور سمجھتا ہوں کہ ایک ماڈرن فرنگی جس نے بالکل مختلف تمدن میں پرورش پائی ہو اس کے لیے اتنی گہری نظر پیدا کرنی دشوار ہے کہ وہ ایک بالکل مختلف تمدن رکھنے والی جماعت کی ہیئت ترکیبی سے متعلق اہم مسائل کو سمجھ سکے۔

ہندوستان میں حالات اور بھی عجیب و غریب ہیں۔ مختلف مذاہب کا یہ ملک جس میں ہر مذہبی گروہ کو بقا اور مستقبل کا انحصار اس کے اپنے استحکام پر ہے کہ جو مغربی لوگ اس پر حکمران ہیں ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں کہ مذہب میں عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کریں۔ اس "آزادانہ" اور "ناگزیر" پالیسی نے ہندوستان ایسے ملک پر بدقسمتی سے بہت بُرا اثر ڈالا ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے

یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ ہندوستان میں برطانیہ کے تحت مسلمانوں کا استحکام مقابلہ ثبت ہی کم محفوظ ہے ، حتیٰ کہ حضرت مسیح کے زمانہ میں یہودی جماعت کا رومن کے ماتحت محفوظ تھا ، ہندوستان میں کوئی سا مذہبی سٹے باز اپنی اغراض کی خاطر کوئی بھی دعویٰ کر سکتا اور ایک نئی جماعت کھڑی کر سکتا ہے اور یہ برل حکومت کسی خاص جماعت کے استحکام و یک جہتی کی ذرہ بھر پروا نہیں کرتی ، بشرطیکہ یہ سٹے باز حکومت کو اپنی اطاعت و وفاداری کے علاوہ اس امر کا یقین دلا دے کہ اس کے پیرو حکومت کی اطاعت کے فرائض اور سرکاری محمول باقاعدہ ادا کرتے رہیں گے ۔ اسلام کے حق میں اس پالیسی کا مطلب ہمارے عظیم شاعر اکبر نے اچھی طرح بیان کر لیا تھا ، جب اُس نے اپنے مطالباتی انداز میں کہا تھا ۔

گورنمنٹ کی خیر یار و منفاؤ

انا الحق کہو اور مچانسی نہ پاؤ

میں قدامت پسند ہندوؤں کے اس مطالبہ سے پوری ہمدردی رکھتا ہوں جو انہوں نے نئے دستور میں بر بناتے تحفظ مذہبی مصلحین کے خلاف پیش کیا ہے ۔ یہ مطالبہ مسلمانوں کی طرف سے یقیناً پہلے ہونا چاہیے تھا ، جو ہندوؤں کے برعکس اپنے اجتماعی نظام میں نسلی تفورک قلعی نفی کرتے ہیں ۔ حکومت کو موجودہ صورت حالات پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے اور اگر ممکن ہو تو اس معاملے میں جو فوقی وحدت کے لیے اشد ضروری ہے ۔ عام مسلمانوں کی ذہنیت کا اندازہ لگا چاہیے ۔ بہر حال جب کسی قوم کی وحدت خطرہ میں ہو تو اس کے لیے اور کوئی چارہ کار نہیں رہتا کہ معاندانہ قوتوں کے خلاف اپنا دفاع کرے ۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ مدافعت کا طریقہ کیا ہے ؟ اور وہ طریقہ یہی ہے کہ حقیقی جماعت کسی مذہبی سٹے باز کو تلقب بالبدین کرتے پائے تو اس کے دعاوی کو تحریر و تقریر کے ذریعہ جھٹلایا کرتے ۔ کیا یہ مناسب ہے کہ اصل جماعت کو تو رواداری کی تلقین کی جائے جس کا استحکام اور وحدت خطرہ میں ہو اور باغی گروہ کو تبلیغ کی پوری اجازت ہو جبکہ وہ تبلیغ جھوٹ اور دشنام سے لبریز ہو ۔

اگر کوئی گروہ جو حقیقی جماعت کے نقطہ نگاہ سے باغی ہے حکومت کی خصوصی خدمات انجام دے تو حکومت اس کی خدمات کا صلہ دینے کی پوری طرح مجاز ہے ۔ دوسری جماعتوں کو اس سے کوئی شکایت نہ ہوگی ، لیکن یہ توقع عبت ہے کہ خود جماعت ایسی قوتوں کو نظر انداز کر دے جو اُس کے اجتماعی وجود کے لیے سنگین خطرہ ہوں اس سلسلے میں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مسلم فرقوں کے باہمی مناقشات کا ان

بنیادی مسائل پر کچھ اثر نہیں پڑتا، جن پر سب فرقے باوجود اختلاف کے متفق ہیں۔ خواہ وہ ایک دوسرے کی خلاف ورزی کے فوٹے ہی دیتے ہیں۔

ایک اور چیز بھی حکومت کی خصوصی توجہ کی محتاج ہے، ہندوستان میں اس بنا پر کہ وہ ترقی پسندانہ خیالات رکھتے ہیں، مذہبی سٹے بازوں کی حوصلہ افزائی سے لوگ مذہب سے بالعموم بیزار ہونے لگتے ہیں۔ ————— اس طرح مذہب کا اہم عنصر ہندوستانی قوموں کی زندگی سے آخر کار خارج ہو جائیگا نتیجتاً ہندوستانی دماغ ایسی صورت میں مذہب کی جگہ کوئی اور بدل پیدا کرے گا، جس کی شکل روس کی مادی دہریت سے کسی طرح مختلف نہیں ہوگی۔

لیکن پنجابی مسلمانوں کو صرف اس مذہبی سوال ہی نے پریشان نہیں کر رکھا بلکہ کچھ تنازعے سیاسی نوعیت کے بھی ہیں، جن کی طرف سر ہربرٹ ایرسن نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے اشارہ کیا ہے۔ بلاشبہ یہ سوال خالصتاً سیاسی نوعیت کے ہیں، لیکن پنجابی مسلمانوں کے اتحاد پر مذہبی مسائل ہی کی طرح اثر انداز ہو رہے ہیں۔ جہاں مجھے پنجابی مسلمانوں کی وحدت کے احساس پر حکومت کا شکریہ ادا کرنا ہے، وہاں میں حکومت کو خود اپنا احتساب کرنے کا مشورہ بھی دوں گا۔ میں پوچھنا ہوں کہ شہری اور دیہاتی مسلمانوں کی تفریق کا ذمہ دار کون ہے؟ جس نے مسلمانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ان کا دیہی حصہ خود کئی گروہوں میں بٹ گیا ہے جو ہر دم آپس میں برسرِ پیکار رہتے ہیں۔

سر ہربرٹ ایرسن نے پنجابی مسلمانوں میں قیادت کے فقدان کا گلہ کیا ہے، لیکن اسے کاش وہ محسوس کرتے کہ شہری و دیہاتی کی تفریق جسے حکومت خود غرض سیاسی جیلہ بازوں کے ذریعے رخصت وحدت اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں، برقرار رکھے ہوئے ہے اس چیز نے اس قوم کو اس قابل ہی نہیں رہنے دیا کہ وہ صحیح راہنما پیدا کر سکے۔ میرے خیال میں اس حربہ کا استعمال ہی اس غرض سے کیا گیا ہے کہ صحیح قیادت پیدا ہی نہ ہو سکے۔ سر ہربرٹ ایرسن مسلمانوں میں صحیح قیادت کے فقدان کا ردنا کرتے ہیں، لیکن میں حکومت کے اس نظام کو جاری رکھنے کا ردنا کرتا ہوں جس نے اس صوبہ میں صحیح راہنما کی پیدائش ہی کو ناممکن بنا دیا ہے۔

علامہ کے اس بیان سے میر ذاتی امت کو کھلا اٹھی اور سرکاری دوائر میں کھلی بچ گئی تو آپ نے

ایک مختصر توضیحی بیان میں کہا ”مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے اس بیان سے بعض حلقوں میں غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں اور یہ تاثر لیا گیا ہے کہ میں نے حکومت کو یہ لطیف مشورہ دیا ہے کہ وہ قادیانی تحریک کا بزور انسداد کرے۔ میرا یہ مدعا ہرگز نہ تھا میں نے اس امر کی وضاحت کر دی تھی کہ مذہب میں عدم مدافعت کی پالیسی ہی ایک ایسا طریقہ ہے جسے ہندوستان کے موجودہ حکمران اختیار کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی پالیسی ممکن ہی نہیں، البتہ مجھے اعتراف ہے کہ میرے نزدیک یہ پالیسی مذہبی جماعتوں کے مفادات کے منافی ہے، لیکن اس سے بچنے کی اور کوئی راہ نہیں اور جنہیں اس سے خطرہ ہے انہیں اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے مناسب طریقے اختیار کرنے چاہئیں، میرے نزدیک حکومت کے لیے بہترین راستہ یہ ہے کہ وہ قادیانیوں کو ایک الگ جماعت دے دے اور یہ ان کی اپنی پالیسی کے بھی عین مطابق ہوگا۔ ادھر مسلمان بھی ان سے وہی رواداری برتیں گے جو وہ باقی مذاہب کے بارے میں اختیار کرتے ہیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو کے جواب میں

”ماڈرن ریویو“ کلکتہ میں پنڈت جواہر لال نہرو کے تین مقالوں کی اشاعت کے بعد مختلف مذہبی اور سیاسی مسالک کے مسلمانوں نے مجھے متعدد خطوط بھیجے۔ ان خطوط کے فردوں میں سے بعض نے خواہش کی ہے کہ میں احمدیوں کے متعلق مسلمانان ہند کی روش کے بارے میں مزید توضیح کروں اور اس کے حق، بجانب ہونے کا ثبوت ہم پہنچاؤں۔ بعض نے مجھ سے پوچھا ہے کہ احمدیت میں اصل تنقیح طلب مسئلہ میرے نزدیک کیا ہے، میں پیش نظر بیان میں سب سے پہلے ان تقاضوں کو پورا کرنا چاہتا ہوں جو میرے نزدیک بالکل بجا ہیں۔ پھر ان سوالات کا جواب دوں گا جو پنڈت جواہر لال نہرو نے پیش کئے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے اس بیان کے بعض حصے غالباً پنڈت جی کے لیے دلچسپی کا باعث نہ ہوں گے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ ان حصوں کو نظر انداز کر دیں تاکہ ان کا وقت بیجا صرف نہ ہو۔

میرے لیے یہ کتنا ضروری نہیں کہ جو مسئلہ مشرق اور غالباً پوری دنیا کے نہایت عظیم الشان مسائل میں سے ایک ہے اس کے ساتھ پنڈت جی کی دلچسپی کا خیر مقدم کرنا ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ وہ پہلے تو مہرت

ہندوستانی لیڈر ہیں۔ جنہوں نے دنیا سے اسلام کی موجودہ روحانی بے چینی کو سمجھنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ اس بے چینی کے متعدد پہلو اور امکانی اثرات ہیں، اس لیے حد درجہ مطلوب ہے کہ ہندوستان کے ذہنی فکر سیاسی لیڈر اس معاملے کے حقیقی مفہوم کے لیے دل کے دروازے کھولیں، جس نے اس وقت قلب اسلام میں ہیجان پیدا کر رکھا ہے۔

میں یہ امر پنڈت جی یا اس بیان کے کسی دوسرے خواہشمند سے چھپا نا نہیں چاہتا کہ پنڈت جی کے مقالوں نے فی الوقت میرے دل میں ایک حد تک احساسات کی تکلیف دہ کش مکش پیدا کر دی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ پنڈت جی وسیع تنزیہی ہمدردیوں کے انسان ہیں، لہذا میرا ذہن اسی طرف مائل ہو سکتا ہے کہ پیش کردہ مسائل کو سمجھنے کی خواہش میں وہ پُر خلوص ہیں، لیکن جس طریق پر انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے ایک ایسی نفسیاتی کیفیت بے نقاب ہوتی ہے جسے پنڈت جی سے منسوب کرنا مجھے دشوار نظر آتا ہے۔ میرا میلان فکری یہ ہے کہ قادیانیت کے بارے میں میرے بیان نے جو اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایک مذہبی اصول کی تشریح جدید انداز میں کی گئی تھی۔ پنڈت جی اور قادیانیوں دونوں کو شکل میں ڈال دیا، اس لیے کہ دونوں (پنڈت جی اور قادیانی مسلمانوں کے سیاسی و مذہبی اتحاد و یک جہتی کے ممکنات کو خصوصیت سے ہندوستان کے اندر ناپسند کرتے ہیں، اگرچہ دونوں کے وجود مختلف ہیں۔ بدیہی ہے کہ ہندوستانی قوم پرست کو جس کی سیاسی تصویریت نے احساس حقیقت کو عملاً کھل ڈالا ہے۔ شمال و مغربی ہند کے مسلمانوں میں خود مختاری کی خواہش پیدا ہونا گوارا نہیں۔ وہ سمجھتا ہے اور میرے نزدیک غلط سمجھتا ہے کہ قومیت ہند کی خاطر ملک کی تمام مستقل تنذیبوں کو مٹا دینا چاہیے، حالانکہ ان کے تعاون ہی سے ہندوستان ایک سیر حاصل اور پائیدار ثقافت کو نشوونما دے سکتا ہے، جن طور طریقوں کا حامی ہندوستانی قوم پرست ہے ان کی بنا پر جو قومیت وجود پذیر ہوگی، اس کا نتیجہ باہم نفی، بلکہ تشدد کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ ٹھیک اسی طرح بدیہی ہے کہ قادیانی بھی مسلمانان ہند کی سیاسی بیداری پر مضطرب ہیں، کیونکہ محسوس کرتے ہیں۔ مسلمانان ہند کا سیاسی اقتدار بڑھ جائیگا تو قادیانیوں نے رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت سے اپنے ہندوستانی نبی کی نمائندگی نکالتے کے جو منصوبے تیار کر رکھے ہیں وہ یقیناً درہم برہم ہو جائیں گے، میں نے مسلمانان ہند کو یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ ہندوستان کے اندر ان کی تاریخ کے موجودہ نازک دور میں داخلی اتحاد و ہم آہنگی حد درجہ ضروری ہے اور میں نے ان انتشار انگیز قوتوں کے خلاف انہیں متنبہ کیا تھا جو اصلاحی تحریکات کا لباس

ہیں کہ بروئے کار آئی ہیں۔ میرے لیے یہ امر کم حیرت افزا نہیں کہ میری ان کوششوں نے پنڈت جی کے لیے اس قسم کی قوتوں سے اظہارِ ہمدردی کا موقع بہم پہنچا دیا ہے۔

برہما میں پنڈت جی کے مزالکات کی چھان بین کے ناخوشگوار کام کو طول نہیں دینا چاہتا۔ جو اصحابِ قادیانیوں کے متعلق عام مسلمانوں کی روش کی مزید توضیح کے خواہاں ہیں۔ ان کے فائدے کے لیے میں ڈیورنٹ کی کتاب "فلسفے کی کہانی" سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں جس سے قادیانیت کے سلسلے میں زیرِ غور مسئلہ عام خواندہ کے ردِ برو زیادہ واضح ہو جائے گا۔ ڈیورنٹ نے سپینوزا جیسے عظیمِ تقدیر فلسفی کو جماعتِ بدد کے جانے کے متعلق یہودیوں کا نقطہ نگاہ چند فقروں میں جامعیت سے پیش کر دیا ہے۔ خواندگانِ بیلن کو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ اقتباس پیش کرنے سے میں خواہ مخواہ سپینوزا اور بانیِ احمدیت کے درمیان کسی قسم کے موازنے کا خواہاں ہوں۔ ان دونوں کے درمیان ذہن و دانش اور سیرت و کردار کے اعتبار سے بُعدِ بعید ہے "خدا مست" سپینوزا نے کبھی دعویٰ نہ کیا کہ وہ کسی نئی تنظیم کا مرکز ہے اور جو یہودی اس پر ایمان نہ لائیں وہ یہودیت کے دائرے سے خارج ہیں۔ لہذا سپینوزا کو جماعتِ بدد کرنے کے سلسلے میں یہودیوں کی روش کے متعلق ڈیورنٹ کا اقتباس قادیانیت کے سلسلے میں مسلمانوں کی روش پر بدرجہا بہتر انداز میں منطبق ہوتا ہے۔ اقتباس یہ ہے:

"مزید برآں اکابرِ یہود کی رائے تھی کہ ایسٹرڈم میں یہودیوں کی چھوٹی سی جماعت کو انتشار سے محفوظ رکھنے کے لیے مذہبی وحدت و ہم آہنگی واحد ذریعہ تھی اور غالباً یہ اتحاد کو بچاتے رکھنے کا ایک آخری وسیلہ تھا۔ یہودی قوم دنیا میں کبھر بھی تھی اس کی بقا کی یقینی تدبیر اور کوئی نہ تھی۔ اگر ان کی اپنی کوئی مملکت، کوئی ملکی قانون، سیکولر قوت و طاقت کے اپنے ادارے ہوتے، جن سے کام لیکر داخلی ہم آہنگی اور خارجی احترام حاصل کر سکتے تو

۱ DURANT

۲ STORY OF PHILOSOPHY

۳ SEPINOZA مشہورِ دنیوی فلاسفر ۱۶۴۹ء ایسٹرڈم میں پیدا ہوا۔ نسطر یہودی تھا۔

۴ AMSTERDAM

غالبہ زیادہ روادار بن جاتے، لیکن مذہب ان کے لیے حب وطن بھی تھا اور ایمان بھی۔ عبادت گاہ ان کے نزدیک مذہبی مراسم و عبادات کے علاوہ عمرانی و سیاسی زندگی کا مرکز بھی تھی، جس بائبل کی صحت کو سپینوزا نے محل نظر قرار دیدیا تھا، وہ قوم یہود کے لیے "سفری وطن" تھی۔ ان حالات میں انہوں نے مسئلہ عقائد سے انحراف کو غداری اور رواداری کو خود کشی قرار دیدیا۔"

یہودیوں کی حالت یہ تھی کہ وہ امپراطرم کے اندر اقلیت میں تھے، لہذا وہ سپینوزا کو ایک انتشار انگیز عامل قرار دینے میں بالکل حق بجانب تھے، جس سے ان کا جماعتی شیرازہ بکھر جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا اسی طرح مسلمانان ہند بھی قادیانی تحریک کو ہندوستان کے اندر اسلام کی اجتماعی زندگی کے لیے بدرجہا خطرناک قرار دینے میں بالکل حق بجانب ہیں اور قادیانی تحریک پوری دنیا سے اسلام کے کافر ہونے کا اعلان کر چکی ہے اور مسلمانوں سے مجلسی مناقضہ کرتی ہے۔ سپینوزا کا فلسفہ مابعد الطبیعیات یہودیوں کی اجتماعی زندگی کے لیے اتنا خطرناک نہ تھا، میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کا مسلمان وجداناً خاص نوعیت کے ان حالات کا صمیم احساس رکھتا ہے جن میں وہ ہندوستان کے اندر گھل ہوا ہے اور اسے کسی دوسرے ممالک کے مسلمانوں کے مقابلے میں انتشار انگیز قوتوں کا بدرجہا زیادہ احساس ہے۔ میرے نزدیک عام مسلمانوں کا یہ وجدانی اور اک قطعاً درست ہے اور مجھے کوئی شبہ نہیں کہ اس کی بنیاد مسلمانان ہند کے غمیر میں بہت گہری ہے جو لوگ ایسے معاملے میں رواداری کا نام لیتے ہیں وہ اس لفظ کے استعمال میں سید غیر محتاط ہیں، بلکہ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ رواداری کی حقیقت ہی سے واقف نہیں۔ رواداری کی روح انسانی قلب کی بے حد مختلف روشوں سے رونما ہوتی ہے۔ لیکن کتا ہے ایک رواداری فلسفی کی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں سچے ہیں۔ ایک رواداری مورخ کی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر غلط ہیں۔ ایک رواداری سیاست دان کی ہے جو تمام مذاہب کو یکساں مفید سمجھتا ہے، ایک رواداری اس انسان کی ہے جو فکر و عمل کے دوسرے طور طریقوں کو برداشت کر لیتا ہے، کیونکہ وہ خود فکر و عمل کے مختلف طور طریقوں سے بالکل بے پروا ہو جاتا ہے۔ پھر ایک رواداری کمزور آدمی کی ہے جو محض کمزوری کی بنا پر ان تمام ذلتوں کو انگیز کر لیتا ہے جو اس کی محبوب اشیا یا افراد کے لیے روارکھی جاتی ہے ظاہر ہے کہ رواداری کے یہ نمونے کوئی اخلاقی قدر و قیمت نہیں رکھتے۔ اس کے برعکس غیر مشتبہ طور پر

ظاہر ہوتا ہے کہ اس رواداری پر کار بند ہونے والا انسان روحانی اخلاق کا اظہار کر رہا ہے۔ حقیقی رواداری عقل و دانش کی وسعت اور روحانی پھیلاؤ سے پیدا ہوتی ہے۔ ایسی رواداری وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جو روحانی اعتبار سے قوی ہوں۔ اپنے ایمانی حدود کی پوری پوری حفاظت کرتے ہوئے دوسرے معتقدات برداشت کر لیں بلکہ بعض کی قدر بھی کریں۔ ایسے روادار کا ایمان ترکیبی و امتزاجی ہوتا ہے۔ اس لیے وہ دوسروں کے تعلق میں ہمدردی کے معانی بہ آسانی پیدا کر لیتا ہے اور ان کے ایمان کی قدر کر سکتا ہے، ہمارے عظیم القدر ہندوستانی شاعر امیر خسرو نے اس قسم کی رواداری کی حقیقت ایک بُت پرست کی کہانی کے سلسلے میں بڑی خوبصورتی سے پیش کی ہے۔ بتوں کے سانچہ بت پرستی کی شدید محبت و عقیدت کا ذکر کرتے ہوئے شاعر مسلمان خاندان کا کتاب کو خطاب کر کے کہتا ہے۔

اے کہ زُبتِ طعنہ بہ ہندو بہری

ہم زوے آموز پرستش گری

(ترجمہ) اے کہ تو ہندو کو بُت کا طعنہ دے رہا ہے کیا یہ ضروری نہیں کہ تو اُس سے پرستش و عبادت کا طریقہ سیکھ لے۔

خدا کا سچا پرستار ہی عبادت کی صحیح قدر و قیمت محسوس کر سکتا ہے۔ اگرچہ اس کا مروج دلیوتا ہوں، جن پر خدا پرست کا کوئی عقیدہ نہیں۔ جو لوگ ہمیں رواداری کی تلقین کر رہے ہیں ان کی حماقت یہ ہے کہ اپنے مذہبی حدود کی پوری پوری حفاظت کرنے والے انسان کی روش کو نارواداری قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ روش اخلاقی کمتری کا نشان ہے۔ حالانکہ یہ راستے غلط ہے وہ نہیں سمجھتے کہ اس روش کی قدر و قیمت اصلاحیاتی ہے۔ جہاں کسی جماعت کے افراد وجدانات یا معقول دلیل کی بنا پر محسوس کریں کہ عمرانی نظام کی اجتماعی زندگی خطرے میں ہے ان کی دفاعی حیثیت کا جائزہ لیتے وقت زیادہ ترجیحیاتی معیار پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ اس سلسلے میں ہر فکر و عمل کا اندازہ اس طرح کرنا چاہیئے کہ اس میں قدر بقا کی کیفیت ہے۔ اس سلسلے میں اصل سوال یہ نہیں کہ جس شخص کو کافرا یا مہدم قرار دیا گیا اس کے بارے میں فرد یا جماعت کی روش اخلاقی اعتبار سے اچھی ہے یا بُری۔ اصل سوال یہ ہے کہ یہ روش حیات بخش ہے یا حیات کش؟ پندت جواہر لال نہرو بظاہر یہ سمجھ رہے ہیں کہ جو معاشرہ مذہبی اصول پر مبنی ہوگا اس کے لیے لازماً ایک ممکنہ انتساب و تفریق کی ضرورت ہوگی۔ یہ سمیت کے تعلق میں تو یہ خیال درست ہے، لیکن تاریخ اسلام پندت جواہر لال کی منطق کے برعکس

یہ ثابت کر رہی ہے کہ اسلام کی گزشتہ تیرہ سو سال کی زندگی کے دوران میں ممکنہ احتساب و تعزیر سے تمام مسلم ممالک کا طائفاً آشنا رہے۔ قرآن نے ایسے ادارے کی صریح ممانعت کر دی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے دوسروں کی کمزوریاں تلاش نہ کرو اور ایک دوسرے کو پیٹھ پیچھے برا نہ کہو۔ پنڈت جی تاریخ اسلام کا مطالعہ کریں گے تو انھیں معلوم ہو جائیگا کہ یہودی اور عیسائی اپنے وطنوں میں مذہبی تعزیر و تعذیب سے بھاگ کر ہمیشہ اسلامی سرزمینوں میں پناہ لیتے رہے، جن دونیادوں پر اسلام کا ڈھانچہ قائم ہے وہ اتنی سادہ ہیں کہ کفرانِ معنی میں تقریباً غیر ممکن ہے، جو کسی شخص کو وائرہ اسلام سے خارج کر دے، یہ بالکل درست ہے کہ جب کوئی شخص ایسے اصول کا اعلان کرتا ہے جو موجب کفر ہو اور جن سے مروجہ عمرانی نظام کے لیے خطرہ پیدا ہو جاتے تو ایک آزاد مسلم مملکت یقیناً اس کے انسداد کے لیے قدم اٹھائے گی، لیکن اس حالت میں مملکت کا اقدام خالص مذہبی مصالح کے بجائے زیادہ تر سیاسی مصالح پر مبنی ہو گا۔ پنڈت جواہر لال ایک ایسے معاشرے میں پیدا ہوئے اور اسی میں انہوں نے پرورش پائی جس کے حدود بھی پوری طرح متعین نہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس میں کوئی داخلی ہم آہنگی بھی نہیں۔ نئی بخوبی اندازہ کر سکتا ہوں ایسے شخص کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ایک مذہبی معاشرہ عقائد عوام کی چھان بین کے لیے مملکت کی طرف سے مقرر کردہ ممکنہ احتساب کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے اور فروغ پا سکتا ہے۔ یہ حقیقت اس اقتباس سے بھی واضح ہے جو پنڈت جی نے کارڈینل نیوین کی تحریرات سے پیش کیا۔ وہ متحیر ہیں کہ آیا میں کارڈینل کے اصول کا اطلاق اسلام کے تعلق میں قبول کر لوں گا؟ میں انھیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اسلام اور کیتھولک مسیحیت کے داخلی نظاموں میں بہت بڑا فرق ہے۔ کیتھولک مسیحیت میں پُرہیج اور عقل سے بالا نوعیت کے عقائد کی کثرت ہے، جن سے تازہ الامادی تعبیرات کے ممکنات برابر پرورش پاتے رہے اور یہ حقیقت مسیحیت کی

۱. INQUIRITION مذہبی احتساب و تعزیر کا وہ محکمہ جس نے ہسپانیہ، اٹلی اور یوگپ کے دوسرے ممالک میں مدت تک قیامت برپا کی تھی۔

۲. اشارہ بظاہر سورۃ جرات کی آیت کے اس ٹکڑے کی طرف ہے: لَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَبِ بَعْضُكُم بَعْضًا

تاریخ سے واضح ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دین و دنیا دوں پر قائم ہے۔ اول خدا ایک ہے (لا الہ الا اللہ) دوم محمد، اللہ کے رسول ہیں اور ان مقدس ہستیوں کے سلسلے میں سے آخری ہیں جو وقتاً فوقتاً تمام ممالک اور تمام ادوار میں عالم انسانیت کو زندگی کا صحیح طریقہ سکھانے کے لیے وجود میں آتی رہیں، اگر عقیدہ ایسی چیز ہے جیسا کہ بعض مسیحی مصنفوں کی رائے ہے جو قتل سے بالا ہوتا ہے اور سیاسی اتحاد کے لیے اس سے اتفاق ضروری ہے خواہ اس کا بالبعد الطبعی مفہوم سمجھ میں آئے یا نہ آئے تو ان دو سادہ بنیادوں کو عقیدہ بھی قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ دونوں کی تائید عالم انسانیت کے تجربے سے ہو چکی ہے اور دونوں کا ثبوت عقلی استدلال کی بنا پر بخوبی پیش کیا جاسکتا ہے۔ ایسا کفر جس کے بارے میں یہ فتویٰ حاصل کرنا ضروری ہو کہ اس کا مرتکب دائرہ مذہب کے اندر رہا یا باہر نکل گیا۔ صرف اس مذہبی معاشرے میں زیر غور آسکتا ہے جو ایسی سادہ بنیادوں پر قائم ہو اور وہ بھی اس وقت جب ان سادہ بنیادوں میں سے دونوں یا کسی ایک کا رد مستلزم ہو۔ ایسا کفر تاریخ اسلام میں شاذ ہی واقع ہوا اور ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ اسلام حدود کی حفاظت کے متعلق زیادہ سے زیادہ اہتمام کے باوجود ایسی تعبیر کی اجازت دیتا ہے جو اصل حدود کے اندر رہے۔ کیونکہ ایسے کفر کا اظہار جو اسلام کے حدود سے تعرض کرے، تاریخ اسلام میں شاذ ہی پیش آیا۔ لہذا اس قسم کی سرکشی کے باب میں عام مسلمانوں کے احساسات طبعاً بہت شدید رہے، ہاتھوں کے خلاف مسلمانان ایران میں شدت احساس کا سبب بھی تھا۔ اسی طرح قادیانیوں کے خلاف مسلمانان ہند کے شدید احساسات کا سبب بھی یہی ہے۔

یہ درست ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی فرقوں میں فقہ و الہیات کے فروعی مسائل میں اختلاف پر بھی کفر کے نتوے اکثر صادر ہوتے رہے ان فتوؤں میں لفظ کفر فروعی مسائل الہیات کے اختلاف اور امتیازی کفر جو مرتکب کو ملت بدر کر دے، کے خلاف بھی بلا امتیاز استعمال کیا جاتا رہا۔ اس وجہ سے دور حاضر کے بہت سے تعلیم یافتہ مسلمان جنہیں الہیات اسلامی کی تاریخ کے بارے میں حقیقتہً کچھ علم نہیں، سمجھ رہے ہیں کہ یہ ملت اسلامیہ کے عمرانی اور سیاسی انتشار کی علامت ہے۔ حالانکہ یہ تصور بالکل غلط ہے۔ اسلامی الہیات کی تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ فروعی اختلافات پر بھی کفر کے جو نتوے ایک دوسرے کے خلاف صادر ہوتے رہے وہ انتشار انگیز ہونے کے بجائے حقیقتہً الہیات کے متعلق افکار میں ترکیب و ترتیب کے محرک بنتے رہے۔

پروفیسر گرگورینج کہتا ہے: ”جب ہم فقہ اسلامی کے نشو و ارتقار کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ایک طرف یہ دیکھتے ہیں کہ ہر عہد میں علمائے کرام معمولی عمر تک کی بنا پر ایک دوسرے کی مذمت میں اس حد تک پہنچتے رہے کہ کفر کا فتویٰ بھی صادر کر دیا، دوسری طرف وہی علمائے کرام زیادہ سے زیادہ وحدت مقصد کے پیش نظر پیشروؤں کے ایسے ہی اختلافات میں موافقت کی کوششیں کرتے رہے۔“ اسلامی دینیات کا طالب علم جانتا ہے کہ اس قسم کا کفر مسلم فقہاء کے نزدیک اصطلاحاً کفر، دن کفر اور ایک کفر کا دوسرے سے کم ہونا، کہلاتا ہے یعنی کفر کی وہ قسم جس کا مرتکب ملت سے خارج نہیں ہوتا، البتہ اعتراف کر لینا چاہیے کہ جب یہ معمولی کفر ملاؤں کے ہاتھ میں پہنچتا ہے تو بڑے فتنے کا باعث بن سکتا ہے، کیونکہ وہ ذہنی تساہل کی بنا پر دینی فکر کے سلسلے میں تمام مخالفات کو مطلق سمجھتے ہیں اور اختلاف میں اتحاد کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر لیتے ہیں، اس فتنے کے انسداد کی صورت یہی ہے کہ مدارس دینیات کے طلبہ کے سامنے اسلام کی ترکیبی و آئینی روح کا تصور زیادہ سے زیادہ واضح طریق پر پیش کریں اور انہیں از سر نو بتائیں کہ دینیات کے علم کلام میں منطقی تضاد اصول حرکت کا وظیفہ ادا کرتا ہے۔ باقی رہا بڑے کفر کا مسئلہ تو یہ صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کسی مفکر یا مصلح کی تعلیمات اسلام کے حدود پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ بد قسمتی سے قادیانیت کی تعلیمات کے سلسلے میں یہ صورت موجود ہے۔

یہاں یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ تحریک احمدیت دو گروہوں میں بٹی ہوئی ہے، ایک گروہ قادیانیوں کا ہے اور دوسرا لاہوریوں کا۔ قادیانی گروہ بانی تحریک کو مکمل نبی تسلیم کرتا ہے، لیکن لاہوری گروہ نے اعتقاداً یا مصلحتاً یہی مناسب سمجھا کہ قادیانیت کو مذہم سُرور میں پیش کیا جاتے تو ماہم یہ مسئلہ کہ بانی احمدیت ایسا نبی تھا جس کی بعثت کا انکار مستلزم کفر ہو، دونوں گروہ کے درمیان محل نزاع ہے۔ احمدیوں کی اس داخلی کشمکش کے سلسلے میں یہ فیصلہ کرنا کہ کون حق بجانب ہے، میرے پیش نظر مقصد کے لیے غیر ضروری ہے۔ میں سمجھتا ہوں اور اسکے وجہ ابھی پیش کر دیں گا کہ ایسے نبی کا خیال جس سے انکار ملت سے خارج ہونے کو مستلزم ہو احمدیت کی اصل داساس ہے اور قادیانیوں کا موجودہ امام لاہوری امام کے مقابلے میں روج تحریک سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔

اسلام میں ختم نبوت کے تصور کی تہذیبی و ثقافتی قدر و قیمت کی پوری تشریح میں نے دوسری جگہ کر دی ہے۔ اس کا مفہوم بالکل سادہ ہے یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جنہوں نے اپنے پیروؤں کو ایک قابل عمل قانون دیکر آزاد کر دیا جو انسانی ضمیر کی گہرائیوں سے طور پذیر ہو رہا ہے۔ کسی دوسری انسانی ہستی کے آگے روحانی اعتبار سے تسلیم نہ کیا جاسکے۔ دینیات کے نقطہ نگاہ سے اس اصول کا مطلب یہ ہے کہ جس عمرانی و سیاسی نظام کو اسلام کہا جاتا ہے، وہ کامل و مکمل اور ابدی ہے۔ رسول اللہ (صلعم) کے بعد کوئی ایسا انسان ممکن ہی نہیں جس سے انکار مستلزم نہ کفر ہو۔ جو بھی شخص ایسے الہام کا دعویٰ کرے وہ اسلام سے غداری کا ترکیب ہوگا۔ چونکہ قادیانیوں کا عقیدہ ہے کہ بانی احمدیت الہام کا حامل تھا لہذا وہ پوری دنیا سے اسلام کو کافر قرار دیتے ہیں۔ خود بانی تحریک کا استدلال جو صرف قرون وسطیٰ کے کلامی کے لیے زیرِ مباحثہ جاسکتا ہے۔ یہ ہے کہ اگر اسلام کے مقدس پیغمبر کی روحانیت دوسرے بنی کی تخلیق نہ کرے تو اس روحانیت کو ناکام سمجھا جائیگا، وہ اپنی نبوت کو اسلام کے مقدس پیغمبر کی نبوت پر ور روحانی قوت کی شہادت قرار دیتا ہے، لیکن اگر آپ یہ سوال کریں کہ آیا رسول اللہ (صلعم) کی روحانیت ایک سے زیادہ پیغمبروں کی تربیت بھی فرما سکتی ہے تو اس کا جواب نفی میں دیا جاتا ہے، اس کا مطلب صاف الفاظ میں یہ ہوا کہ محمد (صلعم) (معاذ اللہ) آخری نبی نہ تھے۔ آخری نبی میں ہوں۔

بانی احمدیت نے تاریخ انسانیت میں عموماً اور تاریخ ایشیا میں خصوصاً ختم نبوت کے اسلامی فکس کی ثقافتی و تہذیبی قدر و قیمت نہ سمجھی اور یہ تصور قائم کر لیا کہ ختم نبوت ان معنی میں رسول اللہ (صلعم) کا کوئی پیرو درجہ نبوت تک نہیں پہنچ سکتا۔ رسول اللہ (صلعم) کی نبوت میں ناقصی کا نشان ہے۔ میں اس کی نفسیات کا مطالعہ کرتا ہوں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ اپنے ادعائے نبوت کی خاطر وہ اسلام کے مقدس پیغمبر کی اس خصوصیت سے فائدہ اٹھاتا ہے جسے وہ تخلیقی روحانیت قرار دیتا ہے، لیکن ساتھ ہی رسول اللہ (صلعم) کی "خاتمیت" سے انکار کر دیتا ہے کیونکہ اس روحانیت کی تخلیقی صلاحیت صرف ایک نبی یعنی بانی تحریک احمدیت تک محدود رکھتا ہے۔ اس طرح یہ نیا بنی چپ چاپ اس بزرگ ہستی کی خاتمیت پر متصرف ہو جاتا ہے جسے وہ اپنا روحانی مورث قرار دیتا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ میں اسلام کے مقدس پیغمبر کا بروز ہوں۔ اس طرح وہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ رسول اللہ (صلعم) کا بروز ہونے کی صورت میں اس کی خاتمیت حقیقتہً خود رسول اللہ (صلعم) کی خاتمیت ہے گویا معاملے کو

کو اس نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو رسول اللہ (صلعم) کی خاتمیت کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ دونوں خاتمیتوں کو اس کی اپنی اور رسول اللہ (صلعم) کی خاتمیت ایک قرار دیکر وہ تصور خاتمیت کے زمانی مفہوم سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔

تاہم ظاہر ہے کہ لفظ بروز کامل مماثلت کے معنی میں بھی اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا تا کیونکہ بروز ہر حال اصل سے الگ ہو گا۔ صرف اوتار کی حیثیت میں بروز اصل سے متحد ہوتا ہے لہذا اگر ہم بروز کے معنی "روحانی صفات میں مثالی" قرار دیں تو استدلال بے اثر رہے گا، لیکن اگر اس کے برعکس ہم بروز کے معنی "آریائی تصور کے مطابق اوتارے میں" تو استدلال بظاہر قابل قبول بن جائیگا مگر ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو جائیگا کہ اس طریقہ ظہور کا تجوز ایک مجوسی ہے جس نے ہمیں بدل لیا ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے اور اس سلسلے میں ہسپانیہ کے عظیم القدر مسلمان صوفی محی الدین ابن عربی کی سند پیش کی جاتی ہے کہ ایک مسلمان ولی کے لیے بھی روحانی ارتقار کے دوران میں ایسے تجربات ممکن ہیں جنہیں صرف شعورِ نبوت سے منقص مانا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شیخ محی الدین ابن عربی کا یہ نظریہ نفسیات کے نقطہ نگاہ سے ناعلم ہے، لیکن اگر اسے درست بھی مان لیا جائے تو قادیانیوں کا استدلال شیخ محی الدین ابن عربی کے صحیح موقف سے متعلق کا غلط فہمی پر مبنی ہے۔ شیخ اسے ایک خالص ذاتی تجربہ قرار دیتے ہیں، جس کی بنا پر کوئی ولی ان لوگوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار نہیں دے سکتا، جو اس پر اعتقاد نہ رکھیں اور ایسا اصلاً جو ہی نہیں سکتا۔ دراصل شیخ کے نقطہ نگاہ کے مطابق ایک عہد یا ایک ملک میں ایک سے زیادہ ولی ہو سکتے ہیں، جو شعورِ نبوت تک پہنچ سکتے ہیں، لیکن قابل غور نکتہ یہ ہے کہ اگر مان بھی لیا جائے ایک ولی کے لیے نفسیاتی اعتبار سے عرفانِ نبوت حاصل کر لینا ممکن ہے تو اس عرفان کی عمرانی و سیاسی اہمیت کوئی نہیں، کیونکہ وہ کسی نئی تنظیم کا مرکز نہیں بن سکتا اور اس اعلان کا حقدار نہیں ہو سکتا کہ وہی تنظیم رسول اللہ (صلعم) کے پیروؤں کے لیے ایمان و کفر معیار ہے۔

شیخ محی الدین ابن عربی کی صوفیانہ نفسیات سے قطع نظر کرتے ہوئے میں "فتوحات مکیہ" سے متعلقہ عبارتوں کا مطالعہ غور و احتیاط سے کر چکا ہوں اور مجھے یقین ہو چکا ہے کہ عظیم القدر ہسپانوی صوفی رسول اللہ (صلعم) کی خاتمیت کا ویسا ہی پختہ معتقد ہے، جیسا کوئی راسخ العقیدہ مسلمان ہو سکتا ہے، اگر اسے صوفیانہ کشف میں محلول ہو جاتا کہ آگے چل کر مشرق میں تصوف کے بعض ہندوستانی آقا اس کی صوفیانہ نفسیات کے پردے میں رسول اللہ

(صلعم) کی خاتمت پر زولگانے کے لیے تیار ہو جائیں گے تو وہ علمائے ہند سے بھی پہلے دنیا کے مسلمانوں کو خدا را بن اسلام کے خلاف متنبہ کر دیتا۔

اب میں احمدیت کی حقیقت پر آتا ہوں۔ تقابلی مذہب کے نقطہ نگاہ سے اس کے مآخذ پر بحث حد درجہ دلچسپ ہوگی۔ اس سلسلے میں یہ امر بھی زیر غور آئیگا کہ اسلام سے پیشتر کے موسیٰ تصورات کس طرح اسلامی تصوف کے ذریعے سے اس کے بانی پر اثر انداز ہوتے، لیکن میرے لیے یہاں یہ بحث شروع کرنا غیر ممکن ہے، صرف یہ کہ دنیا کا یہ ہے کہ احمدیت کی اصل حقیقت قرون وسطیٰ کے تصوف اور دینیات کے گڑ میں چھپی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے ہند نے اسے خالص دینی تحریک سمجھا اور اس کے انسداد کے لیے دینی حربے لیکر نکل پڑے، میں سمجھتا ہوں کہ اس تحریک سے بچنے کا یقیناً مناسب نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس سلسلے میں علماء صرف جزواً کامیاب ہوئے۔ بانی احمدیت کے الہامات کا نفسیاتی تجزیہ احتیاط سے کیا جائے تو یہ غالباً اصل شخصیت کی داخل زندگی کا ایک ایک پہلو بروئے کار لانے کے لیے ایک موثر طریقہ ہوگا۔ مولوی منظور الہی نے بانی کے الہامات کا جو مجموعہ شائع کیا، میں اس کا ذکر کر دیتا ہوں اس مجموعے میں نفسیاتی چھان بین کے لیے سیر حاصل اور تنوع ذخیرہ موجود ہے۔ میری راستے میں یہ کتاب بانی احمدیت کے کردار اور شخصیت کے لیے ایک کلید مہیا کرتی ہے مجھے امید ہے کہ کسی جدید نفسیات کا کوئی نوجوان طالب علم اس کا سنجیدہ مطالعہ اپنا فرض منصبی قرار دے لے گا، اگر وہ قرآن مجید کو معیار بنائے گا اور یہی اسے کرنا چاہیے، البتہ وجہ یہاں یہاں پیش نہیں کئے جاسکتے اور اگر وہ اپنے مطالعے کو بانی احمدیت اور معاصر غیر مسلم منصوفین مثلاً رام کرشن بنگالی کے تجربات کی تقابلی تحقیق تک توسیع دے گا تو اسے اس تجربے کی اصولی حیثیت کے متعلق ایک سے زیادہ مرتبہ سرشتی حیرت بننا پڑے گا جس کی بنا پر بانی احمدیت کے لیے نبوت کا دعویٰ کیا جا رہا ہے۔

عوام کے نقطہ نگاہ سے ایک اور طریقہ بھی ہے جو یکساں موثر اور زیادہ بار آور ہے۔ یعنی ہندوستان میں مسلمانوں کے دینی فکر کی تاریخ کم از کم ۱۹۹۹ء سے پیش نظر رکھ لی جاتے اور اس کی روشنی میں احمدیت کی حقیقت سمجھی جاتے۔ ۱۹۹۹ء وینائے اسلام کی تاریخ میں حدود ۱۹۹۹ سال ہے۔ اس سال ٹیپو سلطان نے شہادت پائی اور اس کی شہادت کے ساتھ ہندوستان میں سیاسی زلزلہ کے لیے مسلمانوں کی امیدوں کے تمام چراغ گل ہو گئے اسی سال نوابینو کی جنگ ہوئی جس میں ترک بڑا تباہ کر دیا گیا۔ جس شخص نے ٹیپو سلطان کی تاریخ شہادت کسی بڑے بلاغ نظر

تھا۔ یہ تاریخ ٹیپو سلطان کے مقبرے کی دیوار پر کندہ ہے !

ذہب عزار دوم والفسد کلما

(دوم اور ہندوستان کی عزت و شان کا طعنا جاتی رہی)

یوں ۱۷۹۹ء میں ایشیا کے اندر مسلمانوں کا سیاسی زوال آخری حد پہنچ گیا، لیکن جس طرح جنگ جینا کے دن جرمی کی ذلت خیر شکست سے جدید جرمین قوم اُٹھی، اسی طرح یہ کینا بھی بالکل بجا سمجھا جاسکتا ہے کہ ۱۷۹۹ء میں مسلمانوں کے سیاسی انحطاط سے دورِ حاضر کا اسلام پیدا ہوا اور اپنے ساتھ نئے مسائل لایا، اس نکلنے کی توفیق میں آگے چل کر کروں گا۔ فی الحال میں خواندگانِ کرام کی توجہ ان بعض مسائل کی طرف منقطع کرنا چاہتا ہوں جو ٹیپو سلطان کی شہادت اور ایشیا میں یورپی سامراج کے فروغ کے بعد اسلامی ہند میں برستے کار آتے۔

کیا اسلام میں خلافت کا تصور ایک مذہبی ادارے کو مستلزم ہے ؟ ہندوستان اور ان ملکوں کے مسلمان جو سلطنتِ ترکیہ کے دائرے سے باہر ہیں، ان کا رشتہ خلافتِ ترک سے کیا ہے ؟ کیا ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالسلام ؟ اسلام میں اصولِ جہاد کا حقیقی مفہوم کیا ہے ؟ ترک ان مجید کا ارشاد ہے : ”خدا کی اطاعت کرو اور ان کی جو تم میں سے اصحابِ امر و حکم ہوں، یعنی تمہارے فرمانروا“۔ ”تم میں سے“ کا مطلب کیا ہے ؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں امامِ مہدی کے فوراً کے متعلق پیش گوئی کی گئی ہے، ان کی حیثیت کیا سمجھی جاتے ؟ یہ اور اس قسم کے دوسرے سوالات جو بعد میں پیدا ہوتے، بدیہی وجود کی بنا پر صرف مسلمانانِ ہند سے تعلق رکھتے تھے، لیکن جو یورپی سامراج

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

۱۸۵۷ء کو برطانوی اور فرانسیسی بیڑے نے مصر اور ترکی کے متحدہ بیڑے کو تباہ کیا تھا، ترکی نے یونانیوں کی بنیاد نو کرنے کے لیے قدم اٹھایا تھا، انگریزوں اور فرانسیسیوں نے اسے ناکام بنا دیا۔

ٹیپو سلطان شہید کی تاریخ شہادت میں بظاہر اس واقع کی طرف نہیں بلکہ نپولین کے حملہ کی طرف اشارہ ہے جو اسی دور کا واقعہ ہے جس میں ٹیپو سلطان نے شہادت پائی، البتہ یہ درست ہے کہ ترکی بیڑے پر ناپریزی میں سخت ضرب لگی اور اس کی جنگی قوت بُری طرح مجروح ہوئی، اگرچہ یہ واقعہ ٹیپو سلطان کی شہادت سے کم و بیش اٹھائیس سال بعد پیش آیا۔

۱۷۹۸ء (JENNA) یہ جنگ اکتوبر ۱۷۹۸ء میں ہوئی تھی اور نپولین نے اس میں پروشیا کی قوت تباہ کر دی تھی۔

یَا اَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا اطِيعُوا اللَّهَ وَاطِيعُوا الرَّسُولَ وَاطِيعُوا اُولَیْکُمْ

اسلامی دنیا میں نیزی سے تسلط حاصل کرتا جا رہا تھا، اسے بھی ان سوالات سے گہری دلچسپی تھی، ان پر جو بحثیں ہوئیں وہ ہندوستان میں اسلامی تاریخ کا ایک نہایت دلچسپ باب ہیں۔ یہ داستان بہت طویل ہے اور تاحال کسی زبردست صاحبِ قلم کے انتظار میں ہے، جن مسلمان مدبروں کی نگاہیں زیادہ تر حفاظتی حال پر جمی ہوئی تھیں، وہ علماء کے ایک طبقے کو ایسے دینی استدلال پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گئے جو ان کے نزدیک ذلتی حالات سے مطابقت رکھتا تھا، مگر محض منطق کے زور سے ان عقائد پر قابو پالینا آسان نہ تھا، جو صدیوں سے جمہور مسلمانانِ ہند کے ضمیر پر مستط چلے آ رہے تھے۔ ایسے حالات میں منطق یا تو سیاسی مصلحت کی بنا پر قدم آگے بڑھا سکتی ہے یا قرآن و احادیث کی تازہ تعبیر کا طریقہ اختیار کر سکتی ہے۔ دونوں صورتوں میں ظاہر تھا کہ یہ عوام کو متاثر نہ کر سکے گی۔ مسلم عوام کی شدید مذہب پسندی کو صرف ایک چیز یقینی طور پر متاثر کر سکتی تھی اور وہ آسمانی سند تھی۔ ٹھیکہ عقائد کی تشریح کئی کے لیے ضروری سمجھا گیا کہ کوئی ایسی الہامی بنیاد تلاش کی جاسے جو مذکورہ مسائل سے تعلق رکھنے والے دینی اصول کی تعبیر سیاسی اختیار سے منوں طریق پر کر دے۔ یہ الہامی بنیاد احمدیت نے دنیا کی اور احمدی خود مدعی ہیں کہ برطانوی سامراج کے لیے یہ سب سے بڑی خدمت ہے جو انہوں نے انجام دی۔ سیاسی اہمیت کے دینی نظریات کی الہامی بنیاد کے لیے پیغمبرانہ دعوے کا مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ اس مدعی کے نظریات قبول نہیں کرتے وہ مطلق کافر ہیں اور لازماً دوزخ کے شعلوں کی نذر ہوں گے۔ احمدیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ مسیح ایک عام فانی انسان کی طرح ذات پاک تھے اور ان کے ظہور ثانی کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسی شخصیت رونما ہوگی جو روحانی اعتبار سے مسیح کی مثیل ہوگی۔ جس حد تک میں احمدیت کی اہمیت سمجھتا ہوں۔ اس سے تشدیک کو ایک حد تک مقبول شکل مل گئی، لیکن روح تحریک کے لیے ایسی چیزیں ضروری نہیں۔ میری رائے میں یہ نبوت کی طرف ابتدائی اقدامات تھے اور تحریک کے اصل مقاصد نبوت ہی پر اور کر سکتی تھی۔

جو ملک تہذیب و تمدن کی ابتدائی منزلوں میں ہیں۔ وہاں منطق نہیں، بلکہ روحانی سند و اختیار سے کام لیا جاسکتا ہے۔ جہاں خاصی جہالت موجود ہو، نیز خوش اعتقادی حد درجہ عجیب امر یہ ہے کہ خوش اعتقادی اور ذہانت بعض اوقات پہلو بہ پہلو نظر آتی ہیں۔ پھر کسی شخص میں یہ اعلان کر دینے کی جسارت ہو کہ وہ ایسے ربانی الہام کا حامل ہے جس سے انکار دائمی لعنت کا موجب ہوگا، اس کے بعد کسی محکوم ملک میں ایسی سیاست آمیز دینیات ایجاد کر لینا اور ایک جماعت بنالینا آسان ہے، جن کا عقیدہ سیاسی غلامی ہو، پنجاب کے سادہ لوح کسان جو صدیوں سے ہر قسم کے ناجائز تصرفات کا تختہ شش چلے آتے ہیں۔ مبہم دینی اصطلاحات کے جال میں بھی بہ سہولت

پھنس جاتے ہیں، خواہ وہ کتنا ہی فرسودہ ہو۔ پنڈت جواہر لال نہرو تمام مذاہب کے راسخ العقیدہ لوگوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ متحد ہو جائیں اور اس چیز کے ظہور میں تاخیر پیدا کریں جسے وہ ہندوستانی قومیت سمجھتے ہیں اس طنز آمیز مشورے میں فرض کر لیا گیا ہے کہ احمدیت ایک اصلاحی تحریک ہے۔ پنڈت جی کو علم نہیں کہ ہندوستان میں جس خدنگ اسلام کا تعلق ہے احمدیت میں انتہائی اہمیت کے مذہبی اور سیاسی مسائل مضمر ہیں، میں پہلے واضح کر چکا ہوں کہ اسلام کے مذہبی فکر کی تاریخ میں احمدیت کا وظیفہ ہندوستان کے اندر موجودہ سیاسی غلامی کے لیے عالمی بنیادیں مہیا کرنا ہے۔ خالص مذہبی مسائل کو چھوڑ دیجیے، صرف سیاسی مسائل کی بنا پر بھی پنڈت جی ایسے شخص کے لیے قطعاً زیبا نہیں کہ وہ مسلمانان ہند کو ارتجاعی قدامت پسندی سے متمم کریں، اگر وہ احمدیت کی حقیقی حیثیت سے آگاہ ہوتے تو مجھے کوئی شبہ نہیں کہ ایک مذہبی تحریک کے متعلق مسلمانان ہند کی روش کو متفق ستائش سمجھتے جو ہندوستان کے مصائب و آلام کے لیے ربانی الہام کی مدعی ہے۔

نحوانندگان کرام پر واضح ہو چکا ہوگا کہ آج ہندوستان میں اسلام کے رخساروں پر احمدیت کی جو زردی نظر آ رہی ہے وہ اس ملک میں مسلمانوں کے مذہبی فکر کی تاریخ کا کئی ناگمان مظہر نہیں جن انکار و تصورات نے بالآخر اس تحریک کی شکل اختیار کی، وہ بانی احمدیت کی پیدائش سے بھی بہت پہلے مذہبی مباحث میں نمایاں ہو چکے تھے میرا یہ مطلب بھی نہیں کہ بانی احمدیت اور اس کے رفیقوں نے سوچ سمجھ کر اپنا پروگرام تیار کیا، مگر کہہ سکتا ہوں کہ تحریک احمدیت کے بانی نے ضرور کئی آواز سنی ہوگی، لیکن یہ آواز خدا سے حیات و قدرت کی طرف سے آئی یا عوام کے روحانی افلاس سے اٹھی، اس کا انحصار پیدا کردہ تحریک کی حیثیت اور یہ آواز سننے والوں کے فکر و جذبہ کی نوعیت پر ہے۔ نحوانندگان کرام کو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ میں استغاروں میں بات کر رہا ہوں۔ قوموں کی تاریخ حیات میں بتاتی ہے کہ جب کسی گروہ کی زندگی میں مد کے بعد جزر پیدا ہوتا ہے تو اغماط و بھاتے خود انقاد الہام کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ شاعر غلطی، ادیب راور بد بر سب اس سے متاثر ہوتے ہیں اور داعیوں کی ایسی جماعت بن جاتے ہیں جو سحر آفریں فن یا منطق کی قوت سے زندگی کی تمام زشت و مکروہ چیزوں کو عظمت و شان کا لباس پہنانے کے لیے وقف ہو جاتے ہیں۔ یہ داعی نادانستہ و نوبیدی کو درخشاں صورت میں پیش کرتے ہیں۔ مگر دار و عمل کی زوایا و اقدار کی جڑ کو کھل کر دیکھتے ہیں اس طرح ان لوگوں کی روحانی قوت و نہمت تباہ کر ڈالتے ہیں جو ان کے حلقہ سحر میں آ جاتے ہیں۔ اس قوم کے عزم کی فرسودہ حالت کا صرف تصور کر لینا کافی ہے جو آسمانی سند کی بنا پر سیاسی ماحول کو آخری و قطعی چیز تسلیم کر لیتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ تمام کردار جنہوں نے احمدیت کے ڈرامے میں حصہ لیا۔ زوال و

انحطاط کے ہاتھوں میں محض سادہ لوح حربے تھے۔ اسی قسم کا ڈرامہ ایران میں بھی کھیل گیا، لیکن وہاں وہ مذہبی اور سیاسی مسائل پیش نہ آئے جو احمدیت نے ہندوستان میں اسلام کے لیے پیدا کر دیئے۔ روس نے باہت کے لیے رواداری کا انتظام کر دیا اور باہیوں کو اجازت دی کہ عشق آباد میں اپنا پہلا تبلیغی مرکز قائم کر لیں۔ احمدیوں کیلئے انگلستان نے ایسی ہی رواداری کا اظہار کیا اور انھیں وولنگ میں اپنا پہلا تبلیغی مرکز قائم کر لینے کی اجازت دیدی اس سوال کا فیصلہ مشکل ہے کہ روس اور انگلستان نے یہ رواداری سامراجی مصلحت کی بنا پر اختیار کی یا یہ ان ملکوں کی خالص وسعتِ قلب کا نتیجہ تھی۔ البتہ اتنا قطعی طور پر واضح ہے کہ اس رواداری نے ایشیا میں اسلام کے لیے مشکل مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ اسلام کی ہیئت ترکیبی کے باب میں جو میرا تصور ہے اس کے پیش نظر میرے دل میں خفیف سا بھی شبہ نہیں کہ اسلام کے لیے اس طرح جو مشکلات پیدا کی گئی ہیں، ان سے وہ زیادہ پاک و صاف ہو کر نکلتے گا۔ زمانہ بدل رہا ہے۔ ہندوستان میں حالات نے نیازِ رخ اختیار کر لیا ہے۔ جمہوریت کی نئی روح ملک کے اندر پھیل رہی ہے۔ یہ یقیناً احمدیوں کی آنکھیں کھول دے گی اور انہیں یقین دلا دے گی کہ انہوں نے دین میں جو نئی چیزیں پیدا کیں وہ بالکل بے سود ہیں۔

اسلام قرونِ وسطیٰ کے تصوف کا اچھا رہی برداشت نہ کر گیا، جس نے اس کے پردوں سے صحتِ مندانہ وجدانات چھین لیے اور ان کے بدلے میں محض مبہم افکار دے دیئے، اس تصوف نے گزشتہ صدیوں میں اسلام کے بہترین دل و دماغ اپنے اندر جذب کر لیے اور ملک داری کے معاملات اوسط درجے کے آدمیوں پر چھوڑ دیئے۔ دورِ حاضر کا اسلام اس تجربے کے اعادے کا روادار نہیں ہو سکتا اور یہ بھی برداشت نہیں ہو سکتا کہ پنجاب کا تجربہ دھرایا جاتے، یعنی مسلمانوں کو نصف صدی تک اُن دینی مسائل میں الجھاتے رکھ جن کا زندگی سے کوئی بھی تعلق نہ تھا، اسلام تازہ فکر و تجربہ کی وسیع روشنی میں پہنچ چکا ہے۔ کوئی دلی یا مذہبی بوت اسے قرونِ وسطیٰ کے تصوف کے کمر میں واپس نہیں لے جا سکتا۔

اب میں پنڈت جواہر لال نہرو کے سوالات کی طرف توجہ ہوتا ہوں، میں سمجھتا ہوں پنڈت جی کے مقالات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں اسلام یا انیسویں صدی کے اند اس کی مذہبی تاریخ سے عملاً کوئی آگاہی نہیں اور نہ انھیں نے وہ سب کچھ پڑھا ہے، جو میں ان کے سوالات پر لکھ چکا ہوں، میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ سب کچھ دُہراؤں جو پہلے لکھ چکا ہوں نہ یہاں انیسویں صدی میں اسلام کی مذہبی تاریخ بیان کر سکتا ہوں۔ جس کے بغیر دنیا نے اسلام کی موجودہ حالت کا اندازہ کرنا غیر ممکن ہے۔ ترک اور دورِ حاضر کے اسلام پر

سیکڑوں کتابیں اور مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ میں ان میں سے بیشتر پڑھ چکا ہوں اور اغلب ہے، وہ پندت جی کی نظر سے بھی گزر چکے ہوں۔ میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ ان کتابوں اور مقالوں کے مصنفوں میں سے ایک بھی نہیں، جس نے اس مملکت کی نوعیت سمجھی ہو یا اس ملت کے بارے میں صحیح اندازہ کیا ہو جس سے یہ مملکت رونما ہوا، لہذا ضروری ہے کہ انیسویں صدی میں ایشیا کے اندر اسلامی فکر کی بڑی بڑی لہروں کا تذکرہ اختصاراً کر دیا جائے۔

میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ۱۶۹۳ء میں مسلمانوں کا سیاسی زوال آخری حد پر پہنچ چکا تھا، لیکن اسلام کی داخلی روح حیات کی بڑی شہادت اس واقعے کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی کہ اسے معاً اندازہ ہو گیا، دنیا میں اس کا اصل موقف کیا ہے۔ انیسویں صدی کے اندر سرسید احمد خاں ہندوستان میں، سید جمال الدین افغانی افغانستان میں اور مفتی عالم جان روس میں پیدا ہوئے۔ غالباً یہ اصحاب محمد بن عبدالوہاب سے متاثر ہوئے، جن کی ولادت ۱۷۴۳ء میں نجد کے اندر ہوئی۔ یہی محمد بن عبدالوہاب اس تحریک کے بانی تھے، جسے عموماً وہابی تحریک کہا جاتا ہے اور جسے بحال طور پر دورِ حاضر کے اسلام میں زندگی کی پہلی دھڑکن سمجھنا چاہیے۔ سرسید احمد خاں کا اثر بحیثیت عمومی ہندوستان میں محدود رہا تاہم اغلب ہے کہ دورِ حاضر کے مسلمانوں میں وہ پہلے فرد ہوں، جنہوں نے آنے والے دور کے مثبت کردار کی ایک جھلک پائی۔ سرسید کی تجویز تھی کہ مسلمانوں کی بیماریوں کا علاج دورِ حاضر کی تعلیم ہے مفتی عالم جان نے روس میں یہی مسلک اختیار کیا، لیکن سرسید کی حقیقی عظمت کا زاریہ ہے کہ وہ پہلے ہندوستانی مسلمان تھے، جنہوں نے اسلام کو نئے نقطہ نگاہ سے پیش کرنے کی ضرورت محسوس کی اور اس کے لیے سرگرم عمل ہو گئے ہم ان کے مذہبی نظریات سے اختلاف کر سکتے ہیں مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ انہی کی حساس روح تھی، جو دورِ حاضر کے تقاضوں کی بنا پر سب سے پہلے مصروف عمل ہوئی۔

مسلمانان ہند کی انتہائی قدامت پرستی زندگی کے حقائق پر گرفت کھو چکی تھی۔ وہ سرسید احمد خاں کی مذہبی روش کی حقیقی حیثیت کا اندازہ نہ کر سکے۔ شمال و مغرب ہندوستان ملک کے باقی حصوں کے مقابلے میں

۱۔ مستند روایات کے مطابق شیخ محمد بن عبدالوہاب ۱۱۵۰ھ (۱۷۳۳ء) میں بمقام عینہ (نجد) پیدا ہوئے اور وفات ایک روایت کے مطابق ۱۲۰۶ھ (۱۷۹۱ء) کو دوسری روایت کے مطابق ۱۲۰۸ھ (۱۷۹۳ء) کو واقعہ ذی قعدہ ۱۲۰۶ھ (جولائی ۱۷۹۳ء) میں ہوئی۔

زیادہ پس ماندہ تھا اور یہاں پیروں کا تسلط بھی زیادہ تھا۔ سرسید کی تحریک سے جلد بعد احمدیت کی تحریک شروع ہو گئی احمدیت سامی و آریائی تصوف کا ایک عجیب مغربہ تھی جس کے نزدیک مذہبی احیاء کا مطلب یہ نہ تھا کہ فرد کی داخلی زندگی قدیم اسلامی صورتیت کے اصول کے مطابق پاک ہو جائے، بلکہ اس نے مسیح موعودؑ کی خانہ پُری سے عوام کی کیفیتِ انتظار کے لیے اطمینان کا سامان بہم پہنچا دیا۔ پھر اس مسیح موعودؑ کا ولیفہ بھی یہ نہ تھا کہ فرد موجودہ و درجہ صف و انحطاط سے نجات حاصل کر لے۔ صرف یہ تھا کہ اپنی خودی کو غلامانہ حیثیت میں اس انحطاط کے حوالے کر دے اس ردِ عمل میں ایک نہایت نازک تضاد موجود ہے، یعنی تحریک احمدیت نے اسلام کا ضبط و نظم قائم رکھا، لیکن اس عزیمت کو تباہ کر دیا جسے تقویت پہنچانا اس ضبط و نظم کا مقصد تھا۔

مولانا سید جمال الدین افغانی مختلف وضع کے انسان تھے۔ قدرت کے طور طریقے عجیب ہیں، جس فرد کو مذہبی فکر و عمل کے اعتبار سے ہمارے عہد میں سب پرستش حاصل تھی، وہ افغانستان میں پیدا ہوا، سید جمال الدین دنیا کی تقریباً تمام اسلامی زبانوں میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ انہیں خدا نے مسور گن فصاحت و بلاغت سے مشرف فرمایا تھا، ان کی بے چین روح مختلف اسلامی ملکوں میں منتقل ہوتی رہی۔ ایران، مصر اور ترکی میں انہوں نے بعض نہایت ممتاز آدمیوں پر گہرا اثر ڈالا۔ ہمارے عہد کے سب سے بڑے علمائے دین مثلاً مفتی محمد عبدہ اور نوجوانوں میں سے بعض لوگ جو آج کل کر سیاسی لیڈر بنے مثلاً زغلول پاشا مصر میں انہیں کے شاگرد تھے، انہوں نے کبھی بہت کم، مذاکرات سے بہت زیادہ کام لیا۔ اسی ذریعے سے ان تمام افراد کو چھوٹے چھوٹے سچے سچے دینا دیا جو ان کے دائرہ ربط و تعلق میں آئے۔ انہوں نے کبھی نہیں یا عہد ہونے کا دعویٰ نہ کیا، لیکن ہمارے عہد کا کوئی بھی فرد نہیں جس نے سید سے بڑھ کر مسلمانوں کے روح و قلب میں جوش و ولولہ پیدا کیا ہو، سید کی روح اب تک دنیا سے اسلام میں کار فرما ہے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی کار فرمائی کہاں تک پہنچے گی۔

سوال کیا جاسکتا ہے کہ ان عظیم القدر مسلمانوں کا مقصد و نصب العین کیا تھا؟ جواب یہ ہے کہ انہوں نے دنیا سے اسلام میں تین بڑی قوتوں کو کار فرما دیکھا اور تمام تر ترجیحات انہیں قوتوں کے خلاف بنا دیں پیدا کرنے پر مرکوز کر دیں۔

۱۔ ملا تہمت

علماء ہمیشہ اسلام کے لیے بہت بڑی قوت کا سرچشمہ رہے، لیکن رفتہ رفتہ خصوصاً تباہی بندگان کے وقت سے

انہوں نے حد درجہ قدامت پسندی اختیار کر لی اور اجتماعِ قانونی مسائل کے متعلق آزادانہ فیصلے کا حق کی آزادی بھی دینے پر راضی نہ ہوئے۔ وہ اپنی تحریک جو انیسویں صدی کے مسلم داعیانِ اصلاح کے لیے تحریکِ عمل کا سرچشمہ تھی، دراصل علماء کے اسی جمود کے خلاف ایک بغاوت تھی۔ غرض انیسویں صدی کے مسلم داعیانِ اصلاح کا اولین مقصد یہ تھا کہ عقائد کی تجدید کی جائے اور روز افزوں تجربات کی روشنی میں قانون کی نئی تعبیر کے لیے آزادی دلائی جائے۔

۲۔ تصوف

مسلم عوام پر ایسا تصوف مسلط تھا جس نے حقائق کی طرف سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ لوگوں کی اصل قوت کمزور کی جا رہی تھی اور ان میں گوناگوں اوبام پرستوں کا دور دورہ تھا، تصوف روحانی تعلیم کی ایک ایسی قوت تھی جس کا درجہ بہت بلند تھا، لیکن رفتہ رفتہ یہ گرتے گرتے ہوتے عوام کی بے خبری و خوش اعتقادی سے ناندہ اٹھانے کا ذریعہ رہ گیا۔ ندریسا اور غیر مرئی طریق پر مسلمانوں کی عزیمت کمزور ہو گئی اور ان میں اتنی تن آسانی آگئی کہ شریعتِ اسلام کے پختہ نظم و ضبط سے بچاؤ کے پلو پیدا کرنے کی کوششوں میں لگ گئے۔ انیسویں صدی کے داعیانِ اصلاح نے اس تصوف کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور مسلمانوں کو دعوت دی کہ وہ دنیائے حاضر کی تیز روشنی میں پنہیں۔ یہ داعیانِ اصلاح مادہ پرست نہ تھے، ان کا نصب العین یہ تھا کہ مسلمانوں کی آنکھیں کھل جائیں۔ وہ روجِ اسلام سے آشنا ہو جائیں جس کا مقصد مددِ مادی دنیائے گریز نہیں بلکہ اس کی تسخیر تھا۔

۳۔ مسلم ملوک

ان کی نظریں صرف اپنے خاندانی مفاد پر جمی ہوئی تھیں اور وہ جب تک اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے تھے اپنے ملک، زیادہ قیمت پیش کرنے والوں کے ہاتھ فروخت کر دینے میں بھی تامل نہیں کرتے تھے۔ دنیائے اسلام میں اس صورتِ حال کے خلاف بغاوت کے لیے مسلم عوام کو تیار کر دینا سید جمال الدین افغانی کا خاص مشن تھا۔ ان داعیانِ اصلاح نے دنیائے اسلام کے فکر و احساس میں جو انقلاب پیدا کیا اس کا تفصیل بیان یہاں ممکن نہیں، لیکن ایک امر واضح ہے انہوں نے بڑی حد تک کارفرماؤں کے دوسرے گروہ کے لیے زمین ہموار کر دی، مثلاً زغول پاشا، مصطفیٰ کمال اور رضا شاہ داعیانِ اصلاح نے تعبیرات پیش کیں، استدلال سے کام لیا اور ضروری چیزیں کھول کر بیان کر دیں جو لوگ ان کے بعد برسرِ کار آئے۔ وہ اگرچہ رسمی علوم میں فرد تو تھے تاہم وہ اپنے

صحت مند وجہانات پر اعتماد کرتے ہوئے حوصلہ مند اندرون فضا میں پہنچ گئے اور وقت ضرورت جبر سے کام لیکر بھی زندگی کے نئے حالات کے تقاضے پورے کر دیئے۔ ایسے آدمیوں سے غلطیاں ہو سکتی تھیں، لیکن قوموں کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ بعض غلطیوں سے بھی اچھے نتیجے حاصل ہوتے۔ یہ لوگ منطق سے کام نہیں لیتے بلکہ ان کے اندر زندگی خود جبر و جہد سے اپنے مسائل حل کر لیتی ہے۔

یہاں یہ بھی بتادینا چاہیے کہ سرستید احمد خاں، سید جمال الدین افغانی اور آخر الذکر کے سیکڑوں پیرو اور شاگرد جو اسلامی ملکوں میں پھیلے ہوئے تھے، مغربیت ماب مسلمان زتھے انہوں نے قدیم دہستانوں کے ملاؤں کے روبرو زانو سے ادب نہ کیا اور اسی ذہنی دروہانی فضا میں سانس لیتے رہے جس کی از سر نو تشکیل کے لیے وہ آگے چل کر کوشاں رہے۔ جدید افکار کا دباؤ تسلیم کیا جاسکتا ہے مگر جو سرگزشت اختصاراً بیان کی جا چکی ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ترکی میں جو انقلاب پیدا ہوا اور اغلب ہے وہ رو دیا بدیر دوسرے اسلامی ملکوں میں برپا ہوا۔ بڑی حد تک اندرونی قوتوں ہی کا آفریدہ ہے۔ دورِ حاضر کی دنیا سے اسلام پر سطحی نظر رکھنے والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ اس دنیا میں موجودہ بحران تمام تر بیرونی قوتوں کا رہین منت ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان سے باہر کی اسلامی دنیا اور خصوصاً ترکی نے اسلام چھوڑ دیا ہے ؟ پنڈت جواہر لال نر دے جتھے میں کہ ترکی اب اسلامی ملک نہیں رہا۔ انہیں یہ اندازہ نہیں کہ کسی فرد یا قوم کے مسلمان نہ ہونے کا مسئلہ اسلامی نقطہ نگاہ سے خالص فتنی مسئلہ ہے اور اس کا فیصلہ اسلام کے بنیادی اصول کے مطابق ہونا چاہیے۔ جب تک کوئی شخص اسلام کے دو بنیادی اصول - خدا ایک ہے (لا الہ الا اللہ) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے آخری رسول ہیں (محمد رسول اللہ) کا قائل ہے تو اسے کٹر مُلا بھی دائرۃ اسلام سے خارج نہیں کر سکتا، اگرچہ وہ شریعت اور آیاتِ قرآنی کی جو تعبیرات پیش کر رہا ہے، وہ غلطی کیوں نہ ہوں۔

شاید پنڈت جواہر لال نر دے کے ذہن میں وہ مفروضہ یا حقیقی بدعات ہیں جو اناترک نے جاری کیں۔ آئیے ہم تھوڑی دیر کے لیے ان کا جائزہ بھی لے لیں، کیا ترکی میں عام ملذتی نقطہ نگاہ کا نشو و ارتقا ہے جو اسلام کے مافی نظر آتا ہے ؟ مسلمان ترک دنیا میں خاصاً وقت صرف کر چکے اب وقت آگیا ہے کہ وہ حقائق پر نظر ڈالیں مادیت مذہب کے خلاف کوئی اچھا حربہ نہیں، لیکن پیشہ ور صوفیوں اور مُلاؤں کے خلاف یہ خاصا موثر ہے جو مسلمانوں کو دانستہ فریب دیتے ہیں تاکہ ان کی بے خبری اور خوش اعتقادی سے فائدہ اٹھا سکیں۔ روح اسلام

مارے کے ساتھ ربط ضبط سے ہرگز خائف نہیں، خود قرآن مجید کا ارشاد ہے: "وَنِيَا سَ اِنَا حَصْرَ نَ بَحْلَ بَا زَشْتِ
چند صدیوں میں دنیا سے اسلام کی تاریخ کے پیشِ نظر ایک غیر مسلم کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ مادی نقطہ نگاہ کی ترقی
خود شناسی کی ایک شکل ہے۔"

پھر کیا قدیم لباس کا ترک اور لاطینی رسم الخط کا نفاذ اسلام کے منافی ہے؟ اسلام کسی خاص ملک کا
مذہب نہیں۔ یہ ایک ایسا معاشرہ ہے جس کی کوئی خاص زبان اور کوئی خاص لباس نہیں بلکہ ترکی زبان میں قرآن
کی تلاوت بھی ایسی چیز نہیں کہ اسلامی تاریخ میں اس کا نمونہ موجود نہ ہو۔ شخصائیں اسے اندازے کی شدید غلطی
سمجھتا ہوں، جن لوگوں نے دورِ حاضر میں عربی زبان و ادب کا مطالعہ کیا، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ صرف ایک ہی غیر
یورپی زبان ہے جس کا مستقبل یقینی مسلم ہے اور وہ عربی زبان ہے، اطلاعات موصول ہو چکی ہیں کہ خود ترکوں
نے بھی مقامی زبان میں قرآن کی تلاوت ترک کر دی۔

کیا تعددِ ازواج کی تنسیخ اور علماء کے لیے اجازت نامے کا حصول اسلام کے منافی سمجھا جاتے؟ شریعت
اسلام کے مطابق اسلامی مملکت کے امیر کو یہ اختیار حاصل ہے کہ اگر شرعی "اجازت" سے کسی وقت خاص حالات
میں عمرانی خرابی پیدا ہوتی نظر آئے تو انہیں مسوخ کر دے۔ باقی رہا علماء کے لیے اجازت نامے کا لائسنس لینے
کا معاملہ تو میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر مجھے اختیار حاصل ہو جائے تو یقیناً اسے اسلامی ہند میں جاری کر دوں۔ قصہ گو ملا
ہی عام مسلمانوں کی حماقت کا بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔ انہیں قوم کی مذہبی زندگی سے خارج کر کے آنا ترک نے
وہ کارنامہ انجام دیا جس سے ابن تیمیہ یا شاہ ولی اللہ کا دل خوش ہو جاتا۔ شکوۃ میں رسول اللہ (صلعم) کی
ایک حدیث بیان کی گئی ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ اسلامی مملکت کا امیر اور اس کے مقرر کردہ فرد یا افراد ہی
لوگوں میں وعظ کھنے کے حقدار ہیں۔ مجھے علم نہیں کہ آنا ترک اس حدیث سے آگاہ تھا یا نہیں تھا، لیکن یہ امر

۱۔ یہ سورۃ قصص کی آیت نمبر ۷، کا ایک ٹکڑا ہے۔ تارون کے ذکر میں فرمایا گیا ہے: "وَابْتَغِ فِيمَا
اَرْسَلَ اللّٰهُ الدّٰارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَفْسَكَ لِمَنِ ابْنُكَ مِنْ الدّٰنْيَا وَ اَحْسِنْ كَمَا اَحْسَنَ
اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَتَّبِعِ الْفٰسَادِیْنَ الْاَرْضِ" یعنی اللہ نے جو تجھے دیا ہے اس سے آخرت
کا ٹھکانہ کمالے اور دنیا میں اپنا حصہ نہ بھول اور بھلائی کر، جیسے اللہ نے تیرے ساتھ
بھلائی کی۔

تعب انگیز ہے کہ اسلامی ضمیر کی روشنی نے اس اہم مسئلے کے متعلق اس کے دائرہ عمل کو منور کر دیا۔

سوئزر لینڈ کا ضابطہ قوانین جس میں قانون میراث بھی شامل ہے اختیار کرنا یقیناً ایک بہت بڑی غلطی ہے جو محض نوجوانی کے جوش و اصلاح میں سرزد ہوئی اور اس حد تک قابل معافی سمجھی جاسکتی ہے کہ قوم بہت آگے جانے کا زبردست جذبہ رکھتی ہے۔ جب مدت تک ملائیت کی بیڑیوں میں زندگی بسر کر چکنے کے بعد رہائی نصیب ہوتی ہے تو آزادی کی خوشی بعض اوقات کسی قوم کو عمل کے نامزد مودہ راستوں پر لے جاتی ہے، لیکن ترکی اور باقی اسلامی دنیا کو ابھی تک اسلامی قانون میراث کے ان اقتصاد ہی پیلوڈ کا صحیح اندازہ کرنا ہے جو تاحال بروستے کار نہیں آئے اور یہ قانون میراث ایسا ہے جس کے متعلق خان کشر نے کہا تھا: ”یہ اسلامی شریعت کی حدود و جملے مثال شاخ ہے۔“

کیا خلافت کی تفسیر یا مذہب و حکومت کی علیحدگی کو منافی اسلام قرار دیا جا رہا ہے؟ اسلام روح و اصل کے اعتبار سے سامراج نہیں۔ خلافت بنی امیہ کے وقت سے عملاً ایک قسم کی سلطنت بن چکی تھی۔ اس کی تفسیر کے متعلق یہ سمجھنا چاہیے کہ روح اسلام نے امارت کے درپے سے کار فرمائی کی۔ خلافت کے معاملے میں ترکوں کے اجتہاد کو سمجھنے کے لیے ہمیں ابن خلدون کی رہنمائی پر نظر رکھنی چاہیے جو اسلام کا بہت بڑا فلسفی مورخ تھا اور اسے دورِ حاضر کی تاریخ نگاری کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ میرے لیے بہتر طریقہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ اپنی کتاب فکر اسلامی کی تشکیل جدید سے یہاں ایک اقتباس پیش کر دوں:

”ابن خلدون اپنی مشہور کتاب ”مقدمہ“ میں اسلامی خلافت کے متعلق تین مختلف نظریے پیش کرتا ہے (۱) عالمی امامت ایک ربانی ادارہ ہے، لہذا اس کے قیام سے مفر نہیں (۲) اس کا تعلق محض وقتی مصلحت سے ہے (۳) ایسے ادارے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آخری تعبیر خوارج نے اختیار کر لی جو اسلام کا ابتدائی جمہوری گروہ تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جدید ترکی نے پہلی تعبیر چھوڑ کر دوسری تعبیر اختیار کر لی ہے، یعنی معتزلہ کا نظریہ جو عالمی امامت کو محض وقتی مصلحت سمجھتے تھے۔ ترکوں کا استدلال یہ ہے کہ ہمیں اپنے سیاسی فکر و نظر میں گزشتہ سیاسی تجربات کے مطابق عمل پیرا ہونا چاہیے۔ گزشتہ سیاسی تجربہ غیر مثبتہ طور پر واضح ہے کہ عالمی امامت

کا تصور عملاً ناممکن ہو چکا ہے۔ اس پر کار بند ہونا صرف اس وقت ممکن تھا جب کمالوں کی سلطنت متحد تھی۔ پھر اس سلطنت کا شیرازہ بکھرا اور خود مختار وحدتیں پیدا ہو گئیں۔ اب یہ تصور قابل عمل نہیں رہا اور یہ دورِ حاضر کی اسلامی تنظیم میں زندہ عامل کے طور پر کام نہیں دے سکتا۔

مذہب و حکومت کی علیحدگی بھی اسلام میں کوئی غیر مانوس تصور نہیں۔ امام کی "عنایت کبریٰ" کے عقیدے کے مطابق شیعہ ایران میں ایک لحاظ سے بہت پہلے یہ علیحدگی عمل میں آچکی ہے، لیکن مذہبی و سیاسی وظائف کی تقسیم کے متعلق اسلامی تصور کو کلیسا اور مملکت کی علیحدگی کے یورپی تصور سے خطا ملنے لگنا چاہیے۔ اسلام نے صرف وظائف کی تقسیم کی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اسلامی مملکت میں رفتہ رفتہ شیخ الاسلام اور وزراء کے مناصب پیدا ہو گئے یورپ میں یہ علیحدگی روح و مادہ کی مابعد الطبعی ثنویت پر مبنی ہے مسیحیت ابتدا میں راہبوں کا ایک نظام تھی جسے معاملات دنیا سے کوئی سروکار نہ تھا، اسلام ابتدا ہی سے ایک سول معاشرہ تھا جس کے سول قوانین تھے، اگرچہ اصلاً ان کے متعلق الہامی ہونے کا عقیدہ تھا۔ مابعد الطبعی ثنویت نے جس پر یورپی تصور مبنی ہے، مغربی قوموں کے لیے نہایت تلخ ثمرات پیدا کئے۔ مدت ہوئی امریکہ میں ایک کتاب تصنیف کی گئی تھی جس کا نام تھا "اگر مسیح شکوگوتے" اس کتاب پر تبصرہ کرتا ہوا ایک امریکی مصنف لکھتا ہے:

"مستر سٹیڈ کے کتاب سے جو سبق حاصل کیا جا سکتا ہے یہ ہے کہ عالم انسانیت جن برائیوں کے ہاتھوں مصیبت میں پڑا ہوا ہے ان کا انسداد صرف مذہبی جذبات کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے، لیکن انسداد کا ضروری کام بڑی حد تک مملکت کے حوالے کر دیا گیا ہے پھر مملکت کا نظم و نسق ان سیاسی مشینوں کو سونپ دیا گیا ہے جو خرابی اور بداطواری کا مرحلہ ہیں۔ ایسی مشینیں ان برائیوں کے انسداد کے لیے نہ صرف آمادہ ہی نہیں، بلکہ نااہل بھی ہیں۔ بے شمار انسانوں کو نکتہٴ فحشا سے اور مملکت کو دولت و سستی سے بچانے کا اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں کہ فرائض عامہ کے متعلق شہریوں میں مذہبی بیداری پیدا کی جائے۔"

ہر حال مسلمانوں کے سیاسی تجربے کی تاریخ میں مذہب و مملکت کی علیحدگی صرف وظائف تک محدود تھی اصل تصورات سے اسے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا اسلامی ملکوں میں مذہب و مملکت کی علیحدگی کا مطلب یہ ہے کہ قانون سازی کے متعلق مسلمانوں کی سرگرمیاں عوام کے ضمیر سے آزاد ہو گئیں، جس نے صدیوں سے اسلامی روحانیت کی آغوش میں تربیت پائی ہے اور پھولا پھلا ہے۔ صرف تجربہ ہی بتا سکے گا کہ دورِ حاضر کے ترکی میں یہ تصور کون سی عملی شکل اختیار کرتا ہے، ہم صرف دعا ہی کر سکتے ہیں کہ اس سے وہ برائیاں پیدا نہ ہوں جو اس نے یورپ اور امریکہ میں پیدا کیں۔

میں نے ترکوں کی نئی اصلاحات پر اختصاراً جو بحث کی اس میں روستے سخن پنڈت جواہر لال سے زیادہ عام مسلمان خواندگان کرام کی طرف تھا۔ جس نئی چیز کا ذکر پنڈت جی نے بطور خاص کیا ہے یہ ہے کہ ترکوں اور ایرانیوں نے نسلی اور قومی نصب العین اختیار کر لیے ہیں معلوم ہوتا ہے وہ سمجھ رہے ہیں ایسے نصب العین اختیار کر لینے کا مطلب یہ ہوا کہ ترکی اور ایران اسلام سے دست بردار ہو چکے ہیں۔ تاریخ کا طالب علم خوب جانتا ہے کہ اسلام کا ظہور ایسے زمانے میں ہوا تھا جب انسانوں کے درمیان اتحاد کے پرانے اصول مثلاً خونِ رشتہ داری اور ملکیت نامک ثابت ہو رہے تھے۔ اسلام نے انسانوں کے درمیان اتحاد کی بنیاد خون اور ہڈیوں پر نہیں بلکہ انسانی قلوب پر رکھی۔ عالم انسانیت کے نام اس کا عمرانی پیغام یہ ہے: "نسلی قیود ختم کر دو، ورنہ خانہ جنگیوں میں تباہ ہو جاؤ گے" یہ کس مبالغہ نہیں کہ اسلام فطرت کے نسل ساز منصوبوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا اور وہ اپنے خاص اداروں کے ذریعہ سے ایک ایسا نقطہ نگاہ پیدا کرتا ہے جو فطرت کی نسل ساز قوتوں کا انسداد کرتا رہے گا۔ گزشتہ ایک ہزار سال کے اندر اس نے انسانی تربیت کے سلسلے میں ایسا کام انجام دیا جو حیثیت اور بدھ مت کے دو ہزار سالہ کام سے بھی بدجواز زیادہ اہم تھا، یہ واقعہ ایک معجزے سے کم نہیں کہ ہندوستان کا مسلمان مراکش پہنچتا ہے تو نسل اور زبان کے اختلاف کے باوجود اسے کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ یہاں ہم یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اسلام سرے سے نسل کا مخالف ہے، تاریخ سے ظاہر ہے کہ عمرانی اصلاحات کے سلسلے میں اسلام نسلی تعصب کو تدریجاً مٹانے کا قائل ہے اور وہ ایسا راستہ اختیار کرتا ہے جس میں مزاحمت کا کم سے کم امکان ہو۔

قرآن مجید کا ارشاد ہے: "ہم نے تمہیں نسلوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا اس لیے کہ باہم پہچانے جاؤ اور اصل یہ تقسیم کوئی ذریعہ امتیاز نہیں، اور خدا کے نزدیک امتیاز و شرف اسی کے لیے ہے، جو سب سے زیادہ متقی یعنی زندگی میں سب سے زیادہ پاکیزہ ہے۔" غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ نسل کا مسئلہ بہت وسیع ہے، اور انسانوں (تشریح اگلے صفحہ پر)

میں سے عصبیت کو ختم کرنے کے لیے بہت زیادہ وقت درکار ہے، لہذا اسلام نے اس مسئلے کے متعلق ایسا طریقہ اختیار کیا کہ رفتہ رفتہ تعصبات و امتیازات مٹا دے اور خود نسل ساز عامل نہ بنے۔ یہی معقول اور قابل عمل طریقہ ہو سکتا ہے۔ سر آر تھر کیٹھ کی چھٹی سی کتاب ”مسئلہ نسل“ میں ایک نہایت عمدہ ٹکڑا ہے جسے انتہا سادہ بیان پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

”اور اب انسان پر یہ حقیقت منکشف ہو رہی ہے کہ فطرت کا ابتدائی مقصد — نسل سازی — دور جدید کی اقتصادی دنیا کی ضرورتوں سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا اور انسان اپنے دل سے پوچھ رہا ہے: مجھے کیا کرنا چاہیے؟ جس نسل سازی پر فطرت اب تک کاربند رہی کیا اسے ختم کر دوں اور دائمی امن حاصل کر لوں یا کیا فطرت کو کھلا چھوڑ دوں کہ وہ اپنے پرانے راستے پر بڑھی چلی جاتے جس کا لازمی نتیجہ صرف ایک ہوگا یعنی جنگ۔ انسان کو پہلا یا دوسرا طریقہ چن لینا چاہیے، بین بین چلنا ممکن ہی نہیں۔“

غرض ظاہر ہے کہ اگر اتاترک کا محرک تورانیوں کا اتحاد ہے تو وہ روح اسلام کے خلاف اتنا نہیں جارہا جتنا روح زمانہ کے خلاف جارہا ہے۔ اگر وہ نسلوں کی مطلقیت کا معتقد ہے تو دیرِ حاضر کی روح سے شکست کھا بیگا ہو رہا ہے۔ جو روح اسلام کے عین پہلو پہلو جاری ہے۔ شخصائیں نہیں سمجھتا کہ اتاترک تورانی اتحاد کے جذبے سے متاثر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سلفانی اتحاد، جو نیت کے اتحاد اور ایگلو سیکشن اتحاد کے نعروں کا صرف ایک سیاسی جواب ہے۔

جو کچھ میں اوپر لکھ چکا ہوں، اس کا مطلب ٹھیک ٹھیک سمجھ لیا جائے تو یہ جان لینا مشکل نہیں کہ

(بقیہ نمبر سابقہ)

۱۰ سورۃ ہجرات آیت نمبر ۱۳ یٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَاۤیِٕلَ لِتَعَارَفُوْۤا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰیْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ حَبِیْرٌ ۝

۱۱ SIR ARTHUR KEITH

۱۲ THE PROBLEMS OF RACE

قومی نصب العین کے متعلق اسلام کی روش کیا ہے اگر قومیت کا مطلب یہ سمجھا جائے کہ ہر شخص کو وطن سے محبت ملتی ہے بلکہ وہ اس کی عزت کے لیے جان بھی دے سکتا ہے تو یہ قومیت مسلمانوں کے ایمان کا جز نہیں۔ اسلام سے قومیت کا تصادم اُس وقت ہوتا ہے جب وہ ایک سیاسی تصور کا کردار اختیار کر لیتی ہے اور انسانوں کے اتحاد کا ایک اصول ہونے کی مدعی بن جاتی ہے۔ اس طرح مطالبہ کرتی ہے کہ اسلام محض ایک نجی عقیدے کے طور پر پس منظر میں چلا جائے اور قومی زندگی میں اس کے لیے زندہ عامل کی حیثیت باقی نہ رہے۔ ترکی، ایران، مصر اور دوسرے اسلامی ملکوں میں ایسا مسئلہ پیش ہی نہیں آ سکتا۔ ان ملکوں میں مسلمانوں کو بہت بڑی اکثریت حاصل ہے اور وہاں کی اقلیتیں — یہودی، مسیحی اور زرتشتی — شریعت اسلام کے مطابق ”اہل کتاب“ یا ”ثیل اہل کتاب“ ہیں اور شریعت اسلام نے ان کے ساتھ عمرانی روابط قائم کر لینے کی آزادی دیدی ہے ان میں ازدواجی تعلقات بھی شامل ہیں مسلمانوں کے لیے قومیت صرف ان ملکوں میں ایک مسئلہ بنتی ہے، جہاں وہ اقلیت میں ہیں اور قومیت کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں کی مستقل ہستی بالکل مٹ جائے مسلم اکثریت والے ملکوں میں اسلام قومیت کو گوارا کر لیتا ہے۔ کیونکہ ان ملکوں میں اسلام اور قومیت عملاً ایک ہیں، لیکن اسلامی اقلیت والے ملکوں میں مذہبی وحدت کے طور پر مسلمانوں کے لیے خود مختاری کا مطالبہ بالکل حق بجانب ہے۔ دونوں صورتوں سے اسلام کو عین مطابقت ہے۔

سطور بالا میں دنیا سے اسلام کی امروزہ حالت کا صحیح نقطہ علامتہ پیش کر دیا گیا ہے۔ اگر اسے ٹھیک ٹھیک سمجھ لیا جائے تو واضح ہو جائیگا کہ اسلامی اتحاد کے اساسات و معانی کسی خارجی یا داخلی قوت سے قطعاً متزلزل نہیں ہوتے، میں پہلے کھول کر بیان کر چکا ہوں کہ اسلامی اتحاد اسلام کے دو بنیادی عقیدوں پر مشتمل ہے ان میں پانچ مشہور ارکان اسلام کا اضافہ کر لینا چاہیے۔ یہ اسلامی اتحاد کے اساسی اجزاء ہیں اور یہ اتحاد رسول اللہ (صلعم) کے عہد مبارک سے زمانہ حال تک قائم رہا ہے پچھلے دنوں اس میں ایران کے اندر بہائیتوں نے اور ہندوستان کے اندر قادیانیوں نے خلا پیدا کیا۔ یہی اتحاد دنیا سے اسلام میں عملاً یکساں روحانی فضا پیدا کرنے کا ضامن ہے۔ اسی کی بدولت اسلامی ملکوں میں سیاسی اتحاد کے لیے سہولتیں مہیا ہوتی ہیں مسلم ملکوں کا اتحاد ایک عالمی مملکت کی صورت میں بھی اختیار کر سکتا ہے اسے نصب العین سمجھنا چاہیے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مسلم ملکوں کی ایک جمعیت بن جائے یا متعدد و خود مختار ملکیتیں ایسے شقائق اور معاہدے کر لیں جو خالص سیاسی اور اقتصادی مصلحتوں پر مبنی ہوں۔ رفتار زمانہ سے اس سادہ مذہب کے تصورات نظام کے تعلق کی یہ کیفیت ہے

اس تعلق کی گہرائی کا اندازہ قرآن مجید کی خاص آیات ہی کی روشنی میں کیا جاسکتا ہے، لیکن یہاں انکی تفصیل ممکن نہیں کیونکہ اس معاملے سے انحراف کرنا پڑے گا جو اس وقت ہمارے سامنے ہے، سیاسی اعتبار سے اسلامی اتحاد صرف اس وقت متزلزل ہوتا ہے جب اسلامی ملکیتیں ایک دوسرے سے جنگ کرتی ہیں اور مذہبی اعتبار سے اس وقت متزلزل کی نسبت آتی ہے جب مسلمان بنیادی عقیدوں اور ارکان پر سے انحراف کریں، اس ابدی اتحاد کے مفاد کا تقاضا یہی ہے اپنے حلقے کے اندر کی کڑی گود برداشت نہیں کر سکتا۔ البتہ اس حلقے سے باہر ایسے گروہ کے ساتھ رواداری کا وہی برتاؤ کیا جائے گا جو دوسرے مذاہب کے پیروؤں سے مرعی رکھا جاتا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فی الوقت اسلام ایک عبوری دور سے گزر رہا ہے یہ سیاسی اتحاد کی ایک صورت سے منتقل ہو کر دوسری صورت کی طرف جا رہا ہے، جس کا تعین ابھی تک تاریخ کی قوتوں نے نہیں کیا۔ دنیا سے حاضرہ میں واقعات ایسی تیزی سے پیش آرہے ہیں کہ کوئی پیش گوئی کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ اگر سیاسی اعتبار سے دنیا سے اسلام متحد ہو گئی تو غیر مسلموں کے متعلق اس کی روش کیا ہوگی؟ اس سوال کا جواب صرف تاریخ ہی دے سکتی ہے۔ میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اسلام یورپ اور ایشیا کے عین درمیان واقع ہے اور یہ زندگی کے متعلق مشرق و مغرب کے نقطہ نگاہ کا امتزاج ہے۔ اسی کو مشرق و مغرب کے درمیان ایک قسم کا واسطہ بننا چاہیے، لیکن اگر اہل یورپ کی حماقتوں نے مسلمانوں سے مصالحت ناممکن بنا دی تو نتیجہ کیا ہوگا؟ یورپ میں آج کل روز بروز جو حالات پیش آرہے ہیں ان کا تقاضا یہ ہے کہ اسلام کے متعلق یورپ کی روش میں بنیادی تبدیلی ہو جائے۔ ہم صرف یہی دعا کر سکتے ہیں کہ سامراجی حرص یا اقتصادی استحصال کے تقاضے سیاسی بصیرت پر پردہ نہ ڈال دیں۔

جس مذہب ہندوستان کا تعلق ہے میں یورپ سے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہاں کے مسلمان کسی ایسے سیاسی نظریے کے رد پر دستبردار نہیں ہو سکیں گے جو ان کی مستقل تہذیبی حیثیت کو تباہ کر دے مستقل تہذیبی حیثیت کے متعلق اطمینان ہو جائے تو مذہب اور عصبیت وطن کے تقاضوں میں ہم آہنگی کرنے کے لیے ان پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔

میں ہزبائی نس آغا خاں کے متعلق بھی ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ میرے لیے یہ معلوم کرنا دشوار ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے آغا خاں کو کیوں حملے کا نشانہ بنایا۔ شاید وہ سمجھتے ہیں کہ قادیانی اور اسماعیل ایک ہی تہذیب کے چٹے بٹے ہیں، وہ بظاہر اس حقیقت سے آگاہ نہیں کہ اسماعیلیوں کی فقہی تاویلات کتنی ہی غلط کیوں نہ ہوں اسلام کے بنیادی اصول پر ان کا ایمان ہے۔ بلاشبہ وہ ذاتی ادا امت پر اعتقاد رکھتے ہیں، لیکن ان کے نزدیک

امام ربانی امام کا حامل نہیں ہوتا، بلکہ صرف شریعت کا شارح ہوتا ہے۔ کل ہی کی بات ہے ملاحظہ ہو
شمارۃ الاولیاء ۱۲ مارچ ۱۹۳۴ء ہر باقی نفس آغا خاں نے اپنے پیروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

”شہادت دو کہ اللہ ایک ہے (اشہدان لا الہ الا اللہ) شہادت دومحمد اللہ کے
رسول ہیں (اشہدان محمد رسول اللہ)۔ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ کعبہ سب کا قبلہ ہے۔ تم
مسلمان ہو اور مسلمانوں کے ساتھ نہیں رہنا چاہیے۔ مسلمانوں کو سلام، السلام علیکم کہہ کر کرو
اپنے بچوں کے نام اسلامی رکھو۔ مسجدوں میں مسلمانوں کے ساتھ باجماعت نماز ادا کرو۔ روزے
پابندی سے رکھو۔ اپنی شادیاں اسلامی قانون نکاح کے مطابق کرو۔ تمام مسلمانوں کیساتھ بھائی
جیسا سلوک روا رکھو۔“

اب پیٹڈ جوام لالہ نرو فیصلہ فرمیں کہ آیا آغا خاں اسلامی اتحاد کی نمائندگی کر رہے ہیں یا نہیں؟
علامہ کے ان دونوں بیانیوں نے قادیانیت کو مسلمانوں کی ذہنی فضا سے نکال باہر کیا اور قادیانی قلعہ
سمسار ہو گیا۔ علامہ ان بیانیوں کے بعد کچھ دن کم تین سال زندہ رہے، اگر پاکستان بن جانے تک زندہ رہتے تو
اغلب تھا کہ میرزائی امت آغاز ہی میں اقلیت کا درجہ پا جاتی۔ ظفر اللہ خاں وزیر خارجہ نہ ہوتا اور قادیانی
پاکستان میں اقتدار حاصل نہ کرتے جو مختلف الاصل سازشوں کا محرک ہوا پاکستان میں نہ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم
نبوت چلتی نہ مسلمانوں کا خون ارزاں ہوتا، نہ مارشل لا لگتا، نہ ملک مسکری چنگل میں جاتا نہ دولت ہوتا، نہ
قادیانیت عرب ملکوں میں صہیونیت کا نقش ہوتی۔ نہ عالمی سامراج اس سے گٹھ بندھن کرنا اور نہ عالمی سامراج
کا آلہ کار ہونے کی حیثیت میں اسے کوئی حوصلہ ہوتا۔

علامہ اقبال کی رحلت کے بعد کل سیاست کے رجعتی مسلمانوں اور سرکاری دواڑے کے لاوین فرزندوں نے
قادیانیت کی طرف داری کا ڈول ڈالا۔ جب پاکستان بنا تو ظفر اللہ خاں قادیانیت کے لیے ریڑھ کی ہڈی ہو گیا
قائد اعظم کی وفات کے بعد سرکاری افسروں کی عیاشی اور بعض وزراء کی لاوینی رنگ لائی۔ ان خواص ہی کی
بدولت میرزائی مسلمانوں کی صف میں شامل ہو گئے۔ کئی ایک دانشوروں نے تور شکم کا ایندھن لیکر سرکاری
مسک کی اعانت کا ناد پھونکا، لیکن کسی میں یہ حوصلہ نہ تھا کہ میرزائیوں کو مسلمان کہنے کے لیے حوام سے ہٹکام ہو

وہ ان مہاجرین کے خلاف گل کرتے یا زہر اگلتے جو قادیانیت کا تعاقب کرتے اور قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ گردانتے تھے۔

سب سے افسوسناک پہلو یہ تھا کہ جو لوگ فہم و نظر کے میدانوں میں علامہ اقبال کے وارث کہلا رہے تھے اور ان کے سوانح و افکار کو اپنی ملکیت قرار دیتے انہوں نے ایک آدھ استثناء کے سوا اس باب میں علامہ اقبال سے فرار کیا بلکہ یہ صحیح تر یہ کہ غدار ہی کی۔ علامہ اقبال کا عشق ختم المرسلین عام مسلمانوں کے دل میں راسخ ہو چکا تھا اور من حیث البہامت وہ قادیانیوں کے اسلام پر صاد کرنے کو تیار نہ تھے۔

تحریک راست اقدام

- ۱۹۵۳ء کی تحریک راست اقدام میرزا رایت کے خلاف سب سے بڑی تحریک تھی۔ اس سے پہلے میرزا رایت کی پیدائش سے لیکر کسی دور میں اتنا زبردست مظاہرہ کبھی نہ ہوا تھا۔ یہی تحریک تھی جس میں !
- (۱) مسلمانوں کے تمام فرقوں نے متحد العمل ہو کر احتجاج کیا۔
 - (۲) حکومت نے مسلمانوں کی متفقہ آواز کو ٹھکرا کر اُس سے ٹکری لی۔
 - (۳) پنجاب میں پولیس کا نظام شل ہو گیا۔ صوبائی سیکرٹریٹ کا ماتحت ملازم غوثاک حکومتی تشدد کے خلاف تحریک میں احتجاجاً شامل ہو گیا۔ اس کے علاوہ لاہور میں ریلوے، ٹیلی گراف اور ٹیلی فون کے عملہ نے بھی ہڑتال کی۔
 - (۴) اکثر اضلاع کی انتظامیہ بے بس ہو گئی۔
 - (۵) حکومت نے پاکستان کی بھادر فوج کو اپنی ہی قوم کے خلاف استعمال کیا۔
 - (۶) فوج نے مارشل لا کی شدت کو ہمہ جہت استعمال کیا۔
 - (۷) ان حکام کو جو تحریک میں شامل تھے، ایک مختصراً ذہن کے ساتھ بیہانہ سلوک کا مستحق گردانا گیا۔
 - (۸) مسلمانوں کی ایک ڈارجیل میں بند کر دی گئی، بہت سے مسلمان، پولیس اور فوج نے سسر عام شہید کئے۔

(۹) بعض پولیس افسر جو گنگنا راتیں گزارنے کے عادی تھے، انہوں نے مسلمانوں کو میر عام گولیوں سے بھون ڈالا اور ان کی لاشوں کے ساتھ امتیازی و حشیانہ سلوک کیا۔

(۱۰) میرزائیوں نے اپنی جمیعوں اور کاروں میں سوار ہو کر بے گناہ مسلمانوں کو شہید کیا۔

(۱۱) میرزائیوں کو مہر عنوان سے تحفظ دیا گیا۔

(۱۲) سب سے اہم مقام نامک تحقیقاتی عدالت کا وہ ڈرامہ تھا جو پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس محمد منیر کی صدارت میں کھیلا گیا۔ اس کے کل ۱۱۷ اجلاس ہوئے جن میں جسٹس منیر نے عمار کا استغاثہ کیا اور جب ۸۷ صفحات پر مشتمل انگریزی میں رپورٹ تیار کی تو وہ اسلام کے نام پر قائم شدہ مملکت کے ایک صوبائی چیف جسٹس کی اسلام کے خلاف شرمناک دستاویز تھی۔

اس تحریک کا آغاز کیونکر ہوا۔ احرار کے باب میں بیان ہو چکا ہے۔ میرزا بشیر الدین محمود عالمی اقتدار کی شہ پر اقتدار کا خواہاں نہ ہوتا میرزائی افسر اپنے عقائد کی آبادی میں منہک نہ ہوتے، سر فخر اللہ خاں وزارت خارجہ کی مسند پر فروکش ہو کر مختلف عہدوں پر قادیانیوں کی بھرتی نہ کرتا اور سفارت خانوں میں قادیانی امت دہریہ خدمات کے لیے مامور نہ ہوتی تو نہ مختلف مکاتیب فکر کے عمار متہد اسمل ہوتے اور نہ مسلمانوں میں تحریک اس شباب کو پہنچتی۔ اس تحریک کے پھیلاؤ کا واحد سبب یہ تھا کہ میرزائی خطرہ واضح ہو چکا تھا، خواجہ ناظم الدین سیدھے سادے مسلمان تھے۔ انہوں نے مجلس عمل کے نوؤ سے صاف صاف کہا اور تحقیقاتی عدالت کے سامنے بیان دیتے ہوئے بھی اعتراف کیا کہ وہ مجلس عمل کے مطالبات تسلیم کرنے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ کیونکہ خارجی دہاؤ قادیانیوں کے حق میں تھا اور امیکہ ظفر اللہ خاں کی علیحدگی پر پاکستان کی غذائی ضروریات کے لیے گندم دینے کو تیار نہ تھا۔ صرف یہی چیز ظاہر کرتی ہے اور یہ اس وقت کے وزیر اعظم کا بیان تھا کہ میرزائی رسوم کا حال کیا تھا اور ظفر اللہ خاں نے استعماری طاقتوں کو اپنے لیے کیونکر ڈھال رکھا تھا۔

آل پاکستان مسلم پارٹیز کانفرنس کے مطالبات، احرار کے باب میں درج کئے جا چکے ہیں۔

۱۔ قادیانیوں کو جدا گانہ اقلیت قرار دیا جائے۔

۲۔ سر فخر اللہ خاں کو وزارت خارجہ سے سبکدوش کر دیا جائے۔

۳۔ میرزائی افسروں کو کلیدی آسامیوں سے ہٹایا جائے۔

۴۔ ربوہ کی بقیہ اراضی پر مہاجرین کو آباد کیا جائے۔

جب خواجہ صاحب نے مندرجہ بالا عذر کے تحت ان مطالبات کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تو ان پارٹیز نے ایک مجلس عمل قائم کی اور اس طرز کے راست اقدام کا فیصلہ کیا کہ

۱۔ خواجہ ناظم الدین مطالبات تسلیم نہ کرنے کے عذر پر مستغنی ہو جائیں۔

۲۔ میرزائیوں کا کامل مقاطعہ کیا جائے۔

تمام پارٹیز سے پندرہ ارکان کی ایک مجلس عمل قائم کی جاتے جو راست اقدام کی انچارج ہو اور راست اقدام پر تھاکہ پانچ رضا کار مطالبات کے جھنڈے اٹھا کر وزیر اعظم کی کوشی پر جاتیں اور پرامن رہ کر نگار نظامہ رو کریں۔ اسی قسم کا مظاہرہ گورنر جنرل ہاؤس پر کیا جاتے عوام سے اپیل کی گئی کہ وہ رضا کاروں کے ساتھ بالکل نہ جاتیں۔ مولانا ابوالحسنات کو پہلا ڈکٹیٹر مقرر کیا گیا۔ خواجہ ناظم الدین سے آخری دفعہ ۲۲ فروری کو ملا۔ خواجہ صاحب نے دو لوگ جواب دید یا تو ۲۶ فروری کو اس صورت حال پر غور کرنے کے لیے کراچی میں مجلس عمل کا ایک اجلاس ہوا، اس میں راست اقدام کا فیصلہ کیا گیا، لیکن اسی شب یعنی ۲۶ اور ۲۷ فروری کی درمیانی رات کو حکومت نے سید عطار اللہ شاہ بخاری، مولانا ابوالحسنات قادری، ماسٹر تاج الدین انصاری، مولانا لال حسین اختر اور سید مظفر علی شمس کو بعض دوسرے رفقاء سمیت کراچی میں گرفتار کر لیا۔ ہر تحریک کا خاصہ ہے کہ جب اس کے راہ نماؤں طرح گرفتار کئے جاتے ہیں تو عوام بھڑک اٹھتے ہیں اور ان کا احتجاج ہمہ گیر ہو جاتا ہے۔ ملک میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی، پنجاب آگ بگولہ ہو گیا۔ تمام صوبہ میں تحریک کے نمایاں راہ نما اور معروف کارکن بھی اسی رات پکڑ لئے گئے۔ لاہور، گوجرانوالہ، سیالکوٹ راولپنڈی، لال پور اور منٹگمری میں تحریک کا طوفان برپا ہو گیا، راقم نے لاہور کے احتجاجی جلوس خود دیکھے، ان کا جوش و خروش بے پناہ تھا لیکن سب پرامن تھے وہ دہلی دروازہ سے نکلتے اور فلینک روڈ سے گورنمنٹ ہاؤس کی طرف جاتے پولیس انہیں اسبل ہال کے چوک میں روکتی اور گرفتاریاں کرتی۔ آخر پولیس نے اپنے وحشیانہ تشدد کا آغاز کیا اور مختلف اکابر کی گرفتاریوں کے بعد ان مورچوں پر حملہ آور ہو گئی جو اس غرض سے قائم تھے، مولانا اختر علی خاں ایڈیٹر زمیندار تحریک سے نکل جانا چاہتے تھے، لیکن عوام کے دباؤ میں آکر گرفتار ہو گئے۔ حضرت مولانا احمد علی نے ایک جلوس کی راہ نمائی کی۔ انہیں گرفتار کیا گیا۔ پولیس کا انداز یہ تھا کہ وہ رضا کاروں کو پکڑتی اور ٹرکوں پر سوار کر کے کہیں دھج جا کر چھوڑ دیتی۔ ۲ مارچ کو افسروں نے ایک میٹنگ کر کے اپنی امداد کے لیے فوج کو درخواست کی اسی رات دفعہ ۱۴ لگا کر جلوس وغیرہ نکالنے کی ممانعت کر دی۔ ۱۵ مارچ کو جناح باغ میں فوج پہنچ گئی اس کے ساتھ بارہ مورچے پولیس بھی آگئی، لیکن اندرون شہر کا علاقہ دفعہ ۱۴ سے مستثنیٰ رکھا گیا، ۱۵ مارچ کو اندر کل میں ۳۱ آدمی دفعہ ۱۴

کی خلاف ورزی میں پکڑے گئے۔ ادھر ٹونٹن مارکیٹ مال روڈ پر ایک جلوس لائٹی چارج سے منتشر کیا گیا، ایک ہجوم شنگری روڈ سے چینگ کر اس کی طرف جا رہا تھا اس کو پولیس نے گولی چلا کر منتشر کیا، لاہور کی مسجد وزیر خاں میں مولانا عبد الستار نیازی نے تحریک کا بیڈ کو اثر قائم کیا، کئی جگہ پولیس اور عوام میں مڈ بھڑ ہوئی، ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس نے راقم سے بیان کیا کہ ایک ایسی تحریک جو پرامن ہو، لیکن پولیس اس کو ختم کرنے سے قاصر ہو، تو اس صورت میں پولیس خود تشدد اٹھا کر اپنے تشدد کا راستہ نکالتی ہے، یہی اس تحریک میں ہوا۔ دن بھر پولیس اور عوام میں کئی جگہ تصادم ہوا سید فردوس شاہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس سٹی کوتوالی کو مسجد وزیر خاں سے باہر اہانت قدآن کے الزام میں لوگوں نے قتل کر دیا اس کے جسم پر پولیس رپورٹ کے مطابق ۵۲ زخم تھے۔ ان کے علاوہ بعض پولیس افسر زخمی ہوئے ان سے ریوالتور کے علاوہ ہندو قیں چھین لی گئیں۔ کئی جگہ گولی چلائی گئی اور ان سے باقی نقصان ہوا، اسی رات کرنیوانڈ کر دیا گیا، لیکن رات بھر شہر منگامہ زار بار بار۔ ۵ مارچ کو اندرون شہر پولیس سے آزاد ہو گیا، کوئی پولیس افسر شہر میں داخل ہونے کے لیے تیار نہ تھا۔ نتیجہ لاہور شہر انتظامیہ کے ہاتھ سے نکل گیا۔ جہاں پولیس کو موقع ملتا وہ گولی چلاتی اور جہاں عوام کا بس چلتا، وہ ٹوڑ پھوڑ کرتے، ایک جیب میں قادیانیوں نے راہ چھتے آکاؤ کا مسلمانوں پر فائر کیا۔ اس کے جواب میں مسلمانوں نے ایک آٹھ قادیانی کو مار دیا کچھ آدمی بسیں جلادیں، اسی طرح دوپسٹ آفس ٹٹ گئے، پھر انہیں جلا دیا گیا۔ غرض پولیس کے بے پناہ تشدد نے عوام کو اس درجہ برا فروختہ کیا کہ پورا شہر الاؤ کی طرح بھڑک اٹھا۔ پولیس عیسوی معطل ہو کر رہ گئی۔ اس صورت حال کے پیش نظر گورنر نے بعض عوامی نمائندوں کو بلا کر مشاورت کی اس میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی بھی تھے، انہوں نے امن عامہ کی بحالی کے لیے جو مسودہ تیار کیا وہ مسودہ گورنر اور وزیر اعلیٰ نے منظور نہ کیا۔ وہ مطالبات کی حمایت میں تھا کہ حکومت ان پر غور کرے گی، لیکن حکومت کسی حال میں ان پر غور کرنے کو تیار نہ تھی۔ صوبائی سیکرٹریٹ کے عملہ کی ہڑتال کا دوسرا دن تھا۔ اس روز ریلوے ملازمین کے ایک حصہ نے بھی ہڑتال کر دی پولیس نے بیان کیا کہ وہ ایک ٹرین کو تباہ کر رہا ہے، سب سے زیادہ نقصان گوانڈی کے علاقہ میں ہوا کہ وہاں ایک قادیانی اسے۔ ایس۔ آئی عبدالکریم نے بعض آدمیوں کو ہلاک کیا، ملک خان باور سپرنٹنڈنٹ پولیس کشمیری نے بھی دو آدمی بلاوجہ شہید کر ڈالے۔ اسی رات گورنر نے فوج کے اعلیٰ افسروں کے ساتھ مارشل لا لگانے پر غور کیا چھ مارچ کو صورت حالات بالکل بے قابو ہو گئی بسیکرٹریٹ کے عملہ نے یکجا ہو کر مظاہرہ کیا کہ فائرنگ بند کر دو۔ تمام اعلیٰ افسروں نے انہیں سمجھانا چاہا، لیکن وہ بدستور مظاہرہ کرتے رہے۔ گورنر ہاؤس کی بیل کاٹ دی گئی فون ناکارہ کر دیئے گئے۔ ادھر انارکلی کی بعض دکانیں آگ کی نندہ ہونے لگیں، لاہور سٹی کوتوالی کا مامروہ کر لیا گیا ٹیل گراف آفس اور

نیل فون ایکسچ کے ملازموں نے ہڑتال کر دی۔ ریلوے کے ملازموں نے انجن شیط پر قبضہ کر لیا۔ لاہور اور منٹپورہ کے درمیان ریلوے پٹری اڑا دی گئی۔ کئی جگہ ٹریک کھٹک ٹوڑ دیئے گئے۔ جب صورت حالات اس انتہا کو پہنچ گئی کہ پورا نظام حکومت معطل ہو گیا تو ریٹھ بنے دن مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ اس دوران میں مسلم لیگ کی شہری و قصبائی شاخوں نے مجلس عمل کے مطالبات کی حمایت میں قراردادیں منظور کیں اور مرکزی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ اس سلسلہ میں تاخیر نہ کرے جب فوج نے مارشل لا کے تحت اہل لاہور کو اپنے خونخاک عمل سے روکنا شروع کیا تو میاں ممتاز دو تانہ نے ۱۰ مارچ کو ۹ مارچ کا جاری کردہ بیان واپس لے لیا۔ اس بیان میں انہوں نے عوام کو تسلی دیتے ہوئے تحریک ختم نبوت کے رہنماؤں سے فی الفور گفتگو شروع کرنے کا وعدہ کیا اور اس امر کا یقین دلایا تھا کہ ان کے وزیر ارکانی حکومت کے سامنے مجلس عمل کے مطالبات پیش کر کے انہیں تسلیم کر لینے کی سفارش کریں گے۔ میاں صاحب نے مرکزی حکومت کی تسدید ہی ہدایت پر یہ بیان واپس لیا۔ راجہ راجہ راجہ نے بے شمار لوگ گرفتار کر لئے، حتیٰ کہ مولانا مودودی کو بھی پکڑ کے جیل میں ڈال دیا، ان گرفتار شدگان کی سماعت کے لیے نوبی عدالتیں قائم کیں، المختصر ایک قومی فوج نے اپنی ہی قوم سے اس طرز کا سلوک کیا جو فاتح اقوام، مفتوح اقوام سے جنگ کے بعد کرتی ہیں۔ لاہور کے علاوہ سیالکوٹ میں بھی رہنماؤں کی گرفتاریاں سے عوام مشتعل ہو گئے۔ ابتداء انتظامیہ نے کی کہ احتجاجی مظاہرے کو منتشر کرنے کے لیے پچھلے ہی دن پولیس کے علاوہ فوج استعمال کی، مولانا محمد علی کاندھلوی کی گرفتاری کے بعد دارالعلوم شبابہ کے اندر پولیس داخل ہو گئی اور مجمع کو بندوق سے منتشر کرنا چاہا۔ عوام نے مزاحمت کی، پولیس گولی چلائی رہی، عوام دارالعلوم کی حرمت سے خشت باری کرتے رہے، خوب مقابلہ ہوا۔ پولیس گاڑیاں جلا دی گئیں۔ ڈسٹرکٹ جیل کی جیب کو نذر آتش کیا گیا، حتیٰ کہ مینسپل فائر بریگیڈ کو بھی جلا دیا گیا۔ یہ سب کچھ دارالعلوم اور اس کے گرد پیش پولیس کے گولی چلانے کا نذہ عمل تھا۔ اس کے نتیجہ میں ایک اے۔ ایس۔ آئی کے پیٹ میں چھڑا گھونپ دیا گیا۔ جب حالات ہاتھ سے نکل گئے تو ضلعی انتظامیہ نے فوج بولائی، اس نے گولی شرنج کی تو پہلے مارڈ ہوا میں چار آدمی شہید اور دس مجروح ہوئے، پولیس کے حوصلے بالکل پست ہو گئے تھے فوج نے گرفتاریوں کا ڈھیر لگا دیا۔ اکثر علماء نے مختلف مسجدوں میں مورچہ لگا لیا۔ کئی روزہ کشکش کے بعد ۱۴ مارچ کو حالات معمول پر آ گئے۔ مگر انوار الدین مولانا محمد اسماعیل کی گرفتاری سے ہنگامہ شروع ہو گیا۔ وہاں مولانا عبدالواحد بھی تحریک کب را مہنات تھے۔ ان کے علاوہ وزیر آباد میں مولانا عبدالغفور ہزارادی اور کامریہ عبدالکیم را مہناتی کر رہے تھے۔ حافظ آباد میں مولانا ابراہیم، مولانا فضل احمد اور مولانا محمد یحییٰ غنیم تھے جسکیم عبدالرحمن کو گوجرانوالہ کا ڈکٹیٹر مقرر کیا گیا۔ کئی ساڑھے چار ہزار رضا کار ضلع میں بھرتی ہو گئے۔ پولیس نے رضا کاروں کو کراچی جانے والی گاڑی

سے آمانا چاہا تو بڑھیر ہو گئی۔ اس کے بعد ہنگامے شروع ہو گئے۔ حکام نے اپنی امداد کے لیے فوج طلب کر لی۔

تحریک کے تمام راہنما پکڑ لئے گئے۔ مزید برآں مندرجہ ذیل مضافات پر تحریک کا زور شور تھا:

۱۔ کامونکے: حافظ عبدالشکور اور جناب لطیف احمد چشتی مقامی راہنما تھے۔

۲۔ گکھڑ: میر محمد بشیر صدر گکھڑ مسلم لیگ نے چند کونسلروں کے ساتھ اپنے تئیں گرفتاری کے لیے پیش کیا۔

۳۔ نوشہرہ و رکال: ڈاکٹر محمد اشرف نے قیادت کی۔

۴۔ سوہیہ: مولانا عبدالمجید برہمہ دیٹ انے اہتمام کیا۔

راولپنڈی میں اس تحریک کا اہم مرکز تھا۔ سید عطار اللہ شاہ بخاری اور قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے قادیانی مسئلہ پر اپنی پیشوا تقریریں سے عوام کو بیدار و متحرک کر دیا تھا۔ مولانا غلام اللہ خاں کو حکومت نے، ۲۷ فروری کی شب کو راولپنڈی میں گرفتار کر لیا۔ دس پردھڑاؤ و خطرے شروع ہونے لگے۔ خود میر انکوائری رپورٹ کے مطابق سب سے بڑا احتجاجی جلسہ جس کی نظیر ماضی میں نہ تھی، حضرت تہجد سید عظیم علی الدین شاہ پیر گوڑہ شریف کے زیر صدارت بیاقت باغ میں منعقد ہوا۔ پولیس نے اپنا حربہ استعمال کیا تو کھلم کھلا کلاوٹ ہو گیا۔ آخر مارچ کے تیسرے ہفتہ صورت حالات پر قابو پایا گیا۔ کئی ایک علماء گرفتار کئے گئے۔ جامع مسجد میں تحریک کا مرکز قائم ہو گیا، ایک ہزار ۳۲ رضا کار گرفتار کئے گئے۔ ہزارہ سے دو ہزار پٹھان مارچ کرتے ہوئے راولپنڈی کی طرف آرہے تھے۔ انتظار یہ بدحواس ہو گئی۔ ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس حضرت پیر گوڑہ شریف کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کی منت سہت کی کہ ان دو ہزار پٹھانوں کو واپس کر دیں۔ دونوں افسر انکسار ہو گئے۔ پیر صاحب قبلہ نے ان پٹھانوں کو واپس کیا کہ ہزارہ میں انتظار کریں۔ ادھر لائن پور تحریک کا ایک بڑا مرکز تھا۔ مولوی عبید اللہ احرار اور غازی محمد حسین، ۲۷ فروری ہی کو گرفتار کر لئے گئے، لیکن پورے ضلع میں کئی سو کارکن معروف جہد تھے۔ تمام شہر زعماء کی گرفتاری سے نعل و در آتش تھا۔ عوام کے جوش و جذبہ کا یہ حال تھا کہ پولیس کے حواس جواب دے گئے۔ دُور زرہ احمی کالج بند کر دیا گیا ڈپٹی کمشنر نے یہاں بھی فوج طلب کر لی۔ گرفتاریوں کا تانا بانہ ہو گیا۔ کئی مسلم لیگ راہنما اور بعض ایم۔ ایل۔ اے گرفتاری کے لیے پیش ہو گئے۔ پولیس کے طریقہ عمل سے لائق پور کے حالات، رمارچ کو غایت درجہ خراب ہو گئے۔ شیخ بشیر احمد مدرس مسلم لیگ سمیت، ۱۰ اٹھاس گرفتار کئے گئے۔ ان کی گرفتاری کے خلاف دس ہزار افراد نے احتجاجی جلوس نکالا۔ ضلع کپری میں تصادم ہو گیا۔ ریوے اسٹیشن پر مظاہرہ ہونے لگا پولیس نے گولی چلا کر چار آدمی

شہید اور چار آدمی سخت زخمی کر ڈالے۔ اس کے بعد کرنیو لگا دیا گیا۔ اگلے روز شہداء کی نماز جنازہ ادا کرنے کے لیے پچاس ہزار افراد مشیت ایک جلوس نکلا تو اس جلوس پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے فوج بوا کر گولی چلا دی۔ تین آدمی شہید اور ایک زخمی ہوا۔ جلوس نے اندرونی ٹرانسیشن سسٹم کاٹ دیا۔ اگلے روز ۹ مارچ کو کرنیو کو توڑتے ہوئے زراعتی کالج کے طلبہ نے ایک بہت بڑا جلوس نکالا۔ عوام کرنیو کی وجہیں بکھیرتے رہے۔ تمام ضلع میں تحریک پھیل گئی۔ سب سے اہم بدل مولانا تاج محمود نے ادا کیا کہ ایک مسجد میں مورچہ لگاکے بیٹھ گئے اور انتظامیہ کے نظام کو معطل کر دیا۔ وہ نسل ہو کے رہ گئی۔ منگمری (ساہیوال) میں تحریک کے منظم درہما مولانا محمد عبداللہ، مولانا حبیب اللہ اور مولانا لطف اللہ (جامعہ رشیدیہ) کے علاوہ مولانا بشیر احمد رضوانی اوصفتی ضیاء الحسن لدھیانوی تھے۔ انہوں نے منگمری میں ۲ ہزار، اوکاڑہ میں ڈیڑھ ہزار، عارف والا میں سات سو اور چیم وطنی میں دو سو رضا کار بھرت کیے۔ انتظامیہ نے ۲۴، ۲۴ گھنٹے کا کرنیو لگا کر حالات پر قابو پایا۔ حقیقت یہ ہے کہ پولیس کا ایک طرف تھا، دوسری طرف متروک آفسر اور قادیانی طاغوت تھا جس نے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنا شروع کر دی۔ اینڈ آرڈر کے چہرے کا غمازہ بنالیا تھا۔

یہ ذکر پتلے آچکا ہے کہ ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس نے خود راقم سے بیان کیا تھا کہ ہر روز کے مظاہروں کو سنیٹے کے لیے تشدد کی نیرٹھا کر کرکے ختم کی جائیگی۔ چنانچہ حکام نے اپنے سفید پوش اہل کاروں کی معرفت پولیس پر تہوار کرایا، اس طرح لاہور میں فائرنگ کی بنیاد رکھی۔ بعض منجھے قادیانی اپنی جیبوں میں سوار ہو کر مسلمانوں پر گولیاں داغے اور انہیں شہید کرتے رہے۔ راقم نے لاہور میں جینز بیچ ہوم مال سٹور پر اپنی آنکھوں دیکھا کہ ۱۵ سے ۲۲ سال کی عمر کے نوجوانوں کا ایک مختصر سا جلوس کمرطبیہ کا دروازہ پرے ہٹے جا رہا تھا وہ ایک بے ضمیر سپرنٹنڈنٹ پولیس ڈی۔ سی۔ آل ملک حبیب اللہ کے حکم پر کسی وازنگ کے بغیر فائرنگ کا ہدف بنا آٹھ دس نوجوان شہید ہو گئے۔ ان کی لاشوں کو ملک صاحب نے اپنے ماتحتوں سے ٹروکوں میں اس طرح پھینک دیا جس طرح جانور شکار کئے جاتے ہیں۔ یہ نظارہ انتہائی دردناک تھا۔ لاہور چھاپان میں ایک قادیانی افسر نے گریوں کی بوچھاڑ کی، لیکن گولی کھانے والوں نے انتہائی استقامت اور کردار کی پختگی کا ثبوت دیا۔ ایک نوجوان ٹری ہسپتال میں زخموں سے چورچور بے ہوش پڑا تھا۔ جب اُسے قدرے ہوش آیا تو اس نے پہلا سوال سرجن سے یہ کیا کہ میرے چہرے پر کسی خوف یا اضمحلال کے نشان تو نہیں ہیں۔ جب اسے کہا گیا کہ نہیں تو اس کا چہرہ دوزخ سے متماثل تھا۔ جن لوگوں کو مدار سمیت گرفتار کر کے لاہور کے شاہی قلعہ میں تفتیش کے لیے رکھا گیا ان کے ساتھ پولیس نے اطلاق باخنگی کا سلوک کیا۔ ایک انتہائی ذلیل ڈی۔ ایس۔ پی کو ان پر مامور کیا۔ وہ علماء کو اس قدر فحش دانش گامیاں دیتا اور عریانی فقرے کہتا تھا کہ ع

خود خوفِ خدا تھا رہا تھا

پولیس کا تو شمار ہی شرفار پر مشق ناز رہا ہے، لیکن فوج نے ہر اس شخص کو ذیل کیا جس پر یہ لگانا گیا کہ وہ تحریک ختمِ نبوت سے کوئی سائنق رکھتا ہے۔

ایک مارشل لار پہل جنگِ عظیم کے بعد انگریزوں نے امرتسر لاہور اور گوجرانوالہ میں لگایا تھا، ایک مارشل لار آزادی کے اس زمانہ میں لگا کر جن لوگوں نے پہلا مارشل لار دیکھا تھا وہ اس مارشل لار کو زیادہ بھیانک بتاتے تھے مگر جنرل اعظم خاں اس احساس سے خالی الذہن تھے کہ وہ اپنے اقتدار و اختیار کی شقاوت کا استعمال اپنی ہی قوم پر کر رہے ہیں۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا عبدالستار نیازی کو فوج نے پکڑا۔ ایک فوجی عدالت نے ان کے مقدمہ کی سماعت کی دونوں کو مرآتے موت سنائی۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سنٹرل جیل لاہور میں پھانسی کی کوٹھڑی میں تھے۔ ان سے پہلے نے گئے تو انہوں نے کہا، اس حکومت سے کوئی پس نہ کرنا، پھانسی پا جاؤں تو انہی کپڑوں میں دفنا دینا۔ ان سے چند قدم آگے دوسری کوٹھڑی میں مولانا عبدالستار نیازی تھے۔ وہ مولانا مودودی کے ملاقاتیوں کو بلا کر رکھتے۔ اس بزدل حکومت میں یہ جرات نہیں کر بھی پھانسی پر لٹکا سکے۔ بھلا مولانا کو پھانسی کے تختہ پر کیسے لٹکا سکتی ہے؟ کسی حالت میں وہ مولانا کو پھانسی دینے کا خطروہ مول نہیں لے گی۔ وہ اپنی موت سے ڈرتے ہیں۔ آخر مارشل لار کچھ عرصہ بعد ختم ہو گیا، لیکن عوام کے دلوں میں اپنی ہی فوج کے خلاف ایک تلق پیدا کر گیا۔ اس تلق کا ازالہ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہوا جب بسا اور فوج نے بھارتی سیناؤں کے دانت کھٹاکے۔ میجر فتناز دونانہ کو ایک ہی ماہ کے اندر اندر وزارتِ اعلیٰ سے مجروح ہونا پڑا۔ ان کی جگہ ملک فیروز خان فون آگئے۔ انہوں نے آتے ہی مولانا احمد علی کو رہا کر دیا۔ اور مارشل لار کے آثار سے فیصد ماخوذ بین چھوڑ دیئے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا عبدالستار نیازی کی منزائیں عمر قید میں تبدیل کر دی گئیں۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ان کے رفقاء کو حبس اس میں۔ اسے رحمن نے ۸ فروری ۱۹۶۷ء کو میاں مسعود علی قصوری بار ایٹ لار کی دائرہ کردہ رٹ سننے ہی رہا کر دیا اور وہ رفقاء سمیت سنٹرل جیل لاہور میں رہا ہو گئے۔

ایک انداز سے کے مطابق ایک ہزار مسلمان اس تحریک میں شہید کئے گئے کسی قدر مجروح ہوئے معلوم نہ ہو سکا لیکن گرفتار شدگان کے متعلق پندرہ ہزار کا اندازہ لگایا گیا۔

اس تحریک اور حکومتی تشدد نے کئی چیزیں کو ختم دیا۔

(۱) اپنی ہی قوم سے دشمنانہ سلوک کیا گیا جس سے نوکر شاہی کی سیاست کا چکر پڑ گیا۔ اور اس نے حکومت کا

خواب دیکھنا شروع کیجئے۔

(۶) جمہوریت کا فالوئنگ ہو گیا۔ ملک غلام محمد نے میاں ممتاز دو تانہ کو خواجہ ناظم الدین سے درخواست کرایا۔ پھر ماہ بعد خواجہ ناظم الدین کو درخواست کر دیا اور نیشنل اسمبلی توڑ ڈالی۔

(۳) مولوی تمیز الدین سپیکر نیشنل اسمبلی نے برخانگل کے خلاف رٹ کی، لیکن جسٹس منیر نے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کی حیثیت سے ملک غلام محمد کے فعل کو جائز قرار دیکر ایک غیر قانونی اقدام کی توثیق کی نتیجہ عدالتی وقار مجروح ہو گیا اور ملک سازشوں کی ایک نئی ڈگر پر آگیا۔

(۴) فوجی جرنیلوں کا مزاج سیاسی ہو گیا اور وہ ملک پر مکرانی کے خواب دیکھنے لگے۔ نیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کے خود نوشت سوانح حیات جس سے اس میلان کی نشاندہی ہوتی ہے۔

(۵) جس جماعت نے ملک بنایا تھا یعنی مسلم لیگ وہ نوکر شاہی کی داشتہ ہو گئی۔

(۶) عوام اور حکومت متشابہ نہیں تو مقصود ادارے ہو گئے۔

اس قریب کا سب سے بڑا احمقہ تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ تھی گورنر پنجاب نے تحقیقاتی عدالت کو آرڈی نٹس نمبر ۱۹۵۳ء کی ہدایات و شرائط کے مطابق قائم کیا تھا۔ جسٹس محمد منیر اس کے صدر اور جسٹس محمد رستم کیانی ممبر تھے۔ کمیٹی کی تجویز کردہ ترمیموں کے بعد فسادات پنجاب سے متعلق تحقیقات عام ایکٹ ۱۹۵۴ء بن گیا۔ یکم جولائی ۱۹۵۳ء کو تحقیقات کا آغاز ہوا۔ کل ایک سو ستترہ اجلاس ہوئے جن میں ایک سو بارہ اجلاس شہادتوں کے لیے مخصوص رہے۔ کمیشن نے ۲۸ فروری ۱۹۵۴ء کو اپنا کام ختم کیا اور انگریزی میں نین سو ستاسی صفحات کی ایک رپورٹ لکھی۔ اس کا اردو ترجمہ سرکاری اتہام میں کرایا گیا جو کمزور تعلقات عامہ نے اسی سائز کے چار سو پینتیس صفحات میں شائع کیا۔ اس تحقیقات میں جو ادارے شامل کئے گئے وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ حکومت پنجاب - صوبہ مسلم لیگ

۳۔ مجلس احرار - مجلس عمل (مقرر کردہ مجلس ختم نبوت پنجاب)

۵۔ جماعت اسلامی - صدر انجمن احمدیہ ربوہ

۶۔ احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور

میاں ممتاز دو تانہ نے ایک درخواست میں استدعا کی کہ انہیں بھی ایک فریق بنایا جائے۔ اس پر عدالت نے انہیں ایک فریق قرار دیدیا اور ہدایت کی کہ وہ ایک تحریری بیان داخل کریں۔ تمام فریقوں نے حکومت پنجاب اور

صوبائی مسلم لیگ کے سوا تفصیلی بیانات داخل کئے۔ اس رپورٹ کو کسی ایک ذیلی عنوانات کے تحت چھ حصوں میں تقسیم کیا گیا جس میں ایم۔ آر کیانی بخود راقم سے کہا تھا کہ وہ اس کتاب کی اشاعت سے پریشان و پشیمان ہیں۔ اس میں جو حصہ اسلام کے خلاف ہے اور جہاں تمام احرار سے متعلق جیسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ جسٹس منیر کے قلم سے ہیں۔ اس رپورٹ کا غالب حصہ ایک طرف آلائشوں کا حامل ہے اور کسی لحاظ سے بھی پوری رپورٹ کسی جج کی تحریر یا تجزیہ نہیں۔ بلکہ ایک ایسے اخبار کا ادارہ ہے جو کف در وہاں قلم سے تبصرہ کرنے کا عادی ہو۔ ڈاکٹر جاوید اقبال خلف الرشید علامہ اقبال نے اپنی ایک نظریاتی کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے کہ یہ ایک ایسی دستاویز ہے جو اسلام کے خلاف خود مسلمان جموں کے قلم سے نکلی ہے۔ اس کی اشاعت روک لی جائے اس کتاب کا ضبط کیا جانا ہی بہتر ہے۔ آج تک فتنہ اسلام کے خلاف دنیا سے اسلام میں ایسی دستاویز شائع نہیں ہوئی۔ یہ سب سے بڑی تحریر ہے جس میں دو مسلمان جموں نے مسلمانوں کی رسوائی کا سامان کیا ہے۔ اس رپورٹ کا مر جانا یقینی تھا اور یہ رپورٹ جلد ہی مرگئی بعض یورپی مصنفوں نے اس سے فائدہ اٹھانا چاہا، لیکن مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے جوابی تبصرہ نے جوار دو کے علاوہ انگریزی اور عربی میں شائع کیا گیا۔ اس رپورٹ کی چتا تیار کی جس میں اس کا وجود بسم ہو گیا جسٹس منیر احرار کے پیدائشی مخالف تھے اس لیے انہوں نے اپنی طبیعت کا تمام زہران کے خلاف اگلا۔ وہ لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے لیکن احرار کے خلاف تمام بُرے الفاظ پر اعتماد کیا اور خود میں قدر بہت سے الفاظ ہو سکتے تھے ایک جج کی رعایات کو پس پشت ڈال کر ان کے خلاف استعمال کئے۔ حتیٰ کہ سی۔ آئی۔ ڈی کے بے فیملی افراد کی یادداشتوں سے ان کو کردہ الفاظ کو بطور استدلال نقل کیا جن میں احرار پر غداری کا بیہودہ الزام دھرا گیا اور ان کے راہنماؤں کو ہدف مطاعن بتایا گیا۔ جسٹس منیر کو یہ جرات تو نہ ہوئی کہ وہ فادیا نیت کا دفاع کرتے یا ان کے مسلمان ہونے کا فتویٰ صادر فرماتے، لیکن انہوں نے فادیا نیوں کو مختلف واسطوں سے تحفظ دیا اور بڑے خوش چہانت کرنا چاہا کہ مرزا غلام احمد کے پیروکار ایک مظلوم جماعت ہیں تمام رپورٹ غیر عدالتی اسلوب سے لکھی گئی، لیکن شروع سے آخر تک جموں نے اپنے تئیں عدالت کے حصار میں محفوظ رکھا۔ خود راقم الحروف کو تو بین عدالت کے جرم میں طلب کر لیا۔ راقم نے اپنے اخبار میں ایک شذرہ بعنوان ”ٹاکو گالی نہ دو“ لکھا جو خلیفہ عبدالکیم مرحوم کے ایک کتابچہ ”مٹلا اور اقبال“ کا جواب تھا۔ جسٹس منیر اس شذرہ سے بہت جزیر ہوئے راقم نے جواب دیا کہ اس شذرہ کا اس عدالت کیساتھ کوئی تعلق نہیں اور نہ اسلام سبب مجھ سے ہو گیا ہے۔ احرار نے اسلام کا دفاع کیا ہے اور اگر اسلام کا دفاع کرنا جرم ہے تو احرار کو اپنے جرم کا اعتراف ہے جسٹس منیر راقم کی صاف گوئی سے ٹخنہ پڑ گئے اور آئندہ

تاریخ ڈال کر اس روز معاملہ خود ہی ختم کر دیا۔ جن علماء کو شہادت کے لیے طلب کیا گیا ان کو نہ صرف تفصیلات استہزا کا نشانہ بنایا گیا بلکہ مسلمان کی تعریف کیا ہے؟ کا سوال اٹھا کر اسلام پر چھینٹے اڑاتے گئے۔ اور ساری رپورٹ سنڈ اس کا پلندہ ہوگئی، اس کے برعکس علماء نے اپنی ثقاہت کو قائم رکھا اور طیش میں نہ آئے۔ اگر کوئی عالم دین یا متعلقہ راہنما جسٹس منیر کے اہل علم سوالات کا منہ توڑ جواب دیتا تو عین ممکن تھا اس قسم کی گستاخانہ رپورٹ تیار نہ ہوتی، لیکن علماء کی شرافت نے جسٹس منیر کے دیدے چوڑھ کر دیے اور وہ علماء کے خلاف مسلسل نیش زنی کرتے رہے۔ اس رپورٹ کے مؤلفین سے کہیں زیادہ حکومت کے اعضاء سیانے تھے جنہوں نے اپنا معاملہ اس بیان پر ختم کر دیا کہ حکومت کا اس بارے میں کوئی نقطہ نگاہ نہیں۔ اس رپورٹ کو علماء کے خلاف ایک اجتماعی مقدمہ COLLECTIVE TRAIL کی خصوصیت حاصل ہوگئی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے مشرقی پاکستان کے حالات پر ایک تجزیاتی رپورٹ قلمبند کی تو اس میں لکھا کہ ہندو اور کمیونسٹ دماغ منیر رپورٹ سے خصوصی فائدہ اٹھا رہے ہیں اس وقت دنیا میں کوئی ایسی دوسری دستاویز موجود نہیں جو مشرق و مغرب میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس قدر غلط فہمیاں پھیلانے کا موجب ثابت ہوئی ہو۔

ادھر ثقہ حلقوں میں یہ بات گردش کرتی رہی کہ مرزا بشیر الدین محمود نے سی۔ آئی۔ ڈی کی بہت سی نفسی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر انہیں اپنے ہاتھ میں رکھا اور احرار سے متعلق اس قسم کی متعفن رپورٹیں لکھوائیں جو انسانی دماغ کی معصیت کا نمونہ تھیں۔ جسٹس منیر نے اپنے ذوق کے باعث ان رپورٹوں پر انحصار کیا اور انہیں حدیث کا درجہ و دیگر اپنے قلم کی لکد کوئی کا راستہ ہموار کیا۔ ان کے نزدیک ساری تحریک "احرار احمدی نزار" تھی اور احرار نے پاکستان دشمنی کے تحت تمام ہنگامہ برپا کر لیا تھا۔ جن شہروں میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ان کے رفقاء کی گرفتاری کے بعد تحریک کے حق میں زبردست مظاہرے ہوتے ان تمام شہروں کا ذکر اوپر آچکا ہے جسٹس منیر نے ہر شہر کے مظاہرے کی تفصیلات دیکر یہ ضرور دیکھا کہ ان شہروں میں احرار غلام غلام و جوحہ کے باعث طاقتور تھے اور جو مظاہرے ہو رہے تھے وہ احرار کی بدولت تھے۔ المختصر شروع سے آخر تک جسٹس منیر کے ذہن میں جو چیز سوار رہی وہ احرار کا وجود تھا۔ انہیں اس ساری تحریک میں احرار ہی احرار نظر آ رہے تھے کہ احرار نے پاکستان کو خراب و برباد کرنے کے لیے اس تحریک کا ڈول ڈالا اور ان کا نشانہ و مقصد یہ تھا کہ پاکستان کیونکر تباہ ہوتا ہے۔ ممکن تھا جسٹس منیر احرار پر اس سفاک حملہ آور نہ ہوتے اگر ختم نبوت کے مسئلہ میں تمام جماعتیں ایک ہو کر اپنا مقدمہ لڑتیں اور اپنی جماعتی صفائی پیش کرنے کی بجائے متحدہ دفاع کرتیں جسٹس منیر نے میرزا بشیر الدین محمود اور

سرفراز شاہ خاں کی نگہداری کے فرائض نہایت ہوشیاری سے انجام دیتے، لیکن اس ذہنی ترقی کے باوجود کہ وہ چیف جسٹس کی مسند پر متمکن تھے۔ انہیں یہ حوصلہ نہ ہوا کہ میرزا بیٹوں کے مسلمان ہونے کا فیصلہ کریں۔ اصرار پر طاعن و مطاعن کے باوجود تسلیم کیا کہ قسریک بھر کسی وقت کر دے سکتی ہے۔

بلاشبہ اُس وقت تحریک پسپا ہو گئی۔ خواجہ ناظم الدین کی برطانی کے بعد لادین عناصر کا حوصلہ بڑھ گیا۔ ملک غلام محمد نے ”الغلاب“ کیا تو سردار عبدالرب نشتر کو بھی ان کے اسلامی ذہن کی پاداش میں کاہنہ سے حذف کر دیا۔ میاں شقائق احمد گورمانی وزیر داخلہ تھے۔ مولانا ظفر علی خاں کی شدید علامت کے پیش نظر راقم انہیں مولانا اختر علی خاں کی رہائی پر آمادہ کر رہا تھا کہ ان کے دولت کدہ پر سکندر مرزا آگئے۔ مرزا ان دنوں ڈیفنس سیکرٹری تھے انہیں معلوم ہوا کہ مولانا اختر علی خاں کی رہائی کا مسئلہ ہے تو جھڑک اُٹھے۔ فرمایا کہ وہ رہا نہیں ہو سکتے راقم نے عرض کیا کہ اُن کے والد بیمار ہیں۔ کہنے لگے کہ وہ خود تو بیمار نہیں؟ راقم نے کہا ان کے والد کی غلطی خدمات میں اسی کے پیش نظر اختر علی خاں کو رہا کر دیا جائے۔ سکندر مرزا نے باپ اور بیٹے دونوں کو گالی لڑھکا دی اور کہا: ”دونوں کو مرنے دو۔“ راقم نے مرزا صاحب کو ٹوکا کہ ہفتہ پہلے آپ کا بیٹا ہوائی حادثہ میں موت کی نذر ہو گیا ہے۔ اس قسم کے الفاظ آپ کو نہ بولنا چاہئیں۔ گورمانی صاحب نے راقم کے تیور دیکھ کر صحبت ختم کر دی، لیکن مرزا صاحب نے فرمایا یہ کاہنہ کی غلطی ہے کہ اُس نے ان ملاؤں کو چھانسی نہیں دی۔ ہمارے مشورہ کے مطابق پندرہ میں علما کو دار پر کھنچو ادیا جاتا یا گولی سے اڑا دیا جاتا تو اس قسم کے جھیلوں سے ہمیشہ کے لیے نجات ہو جاتی جس صبح دولتانہ وزارت برخواست کی گئی اس رات گورنمنٹ ہاؤس لاہور میں سکندر مرزا کا ایک ہی بول تھا۔ ”مجھے یہ نہ بتاؤ فلاں جگہ ہنگامہ فرو ہو گیا یا فلاں جگہ مظاہرہ ختم کر دیا گیا۔ مجھے یہ بتاؤ وہاں کتنی لاشیں پھائی ہیں۔ کوئی گولی بیکار تو نہیں گئی؟“ عبد الرب نشتر راقم کے بہتوں دوست تھے ان سے اس مسئلہ پر گفتگو ہوتی تو فرمایا ”جن لوگوں نے شدید انتہا ختم نبوت کو شہید کیا اور اُن کے خون سے ہولی کھیل ہے میں اندر خانہ کے رازدار کی حیثیت سے جانتا ہوں کہ اُن پر کیا میت رہی ہے؟ اور وہ کن حادثات و سانحات کا شکار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے“

”غلوب کا اطمینان سلب کر لیا اور ان کی روحوں کو مرطبان میں جھٹلا کر دیا ہے“

اس تحریک کی پہچان کے بعد ملک سیاسی توانائی سے محروم ہو گیا اور جمہوریت نالغ کا شکار ہو گئی ایک طرف عالمی استعمار کی مداخلت بڑھ گئی دوسری طرف علاقائی سازشوں کا سلسلہ چل نکلا۔ جن لوگوں نے قائد اعظم کے دست راست کی حیثیت سے پاکستان کی تحریک میں حصہ لیا تھا وہ ایران حکومت سے خارج ہونے لگے اس زمانہ ہی سے

میرزائیوں نے عالمی استعمار کے سرے کی حیثیت سے مرہ بازی شروع کی اور مختلف حکموں میں حصول اقتدار کا منصوبہ تیار کیا۔ ایوب خاں برسرِ اقتدار آگئے تو قادیانی کئی واسطوں سے ان کے مزاج میں ذلیل ہو گئے۔ انہوں نے فوج میں بڑی سے بڑی جگہ پیدا کی، اقتصادی زندگی کو ہاتھ میں لینا شروع کیا۔ ان کی سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ مرزا غلام احمد کا پوتا ایم۔ ایم احمد مرکزی حکومت میں تناسل سیکرٹری ہو گیا۔ پھر پلاننگ کمیٹی کی سربراہی حاصل کی اور اقتصادی منصوبوں کا انچارج ہوا۔ جوں جوں ایوب خاں کی ہوا اکھڑتی گئی توں توں انہیں قادیانی قرب کی ضرورت پڑتی گئی۔ ایک طرف حکومت پاکستان کے مختلف شعبوں میں سی۔ آئی۔ اے کا ہاتھ کار فرما تھا دوسری طرف سیاسی پہل کا آغاز ہو چکا تھا۔ میرزائی ایک طرف ایوب خاں کو اپنی وفاداری کا یقین دلاتے دوسری طرف سی۔ آئی۔ اے کے حسبِ منشاء شطرنج کھیلتے۔ ایوب خاں کے ساتھیوں میں نواب کالا باغ گندہ پنجاب قادیانیوں کے مخالف تھے۔ بالاخر قادیانی انہیں نکلوانے میں کامیاب ہو گئے۔ دو گئے تو قادیانی ایوب خاں کی مونچھ کا مال ہو گئے۔ انہوں نے حکومت سے ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت اخبارات کے نام اس امر کا سرکلہ جاری کرایا کہ اشارۃً وکنایتہً یا تفصیلاً واجمالاً کسی طرح بھی قادیانی فرقہ پر خفی و جلی تنقید نہ کی جائے کسی نے خلاف ورزی کی تو وہ قانون کے مطابق مستوجبِ سزا ہو گا۔ ہفتہ وار ”چٹان“ نے عرب ممالک کی اس دوسری خبر پر الحمد للہ کا عنوان جمایا کہ ”وہاں اس فرقہ کی مرکزوں کا احتساب کیا جا رہا ہے ہم بھی ان پر نگاہ رکھیں۔“ اس مختصر نوٹ پر چٹان پریس ضبط کر لیا گیا اور راقم کو ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار کر کے پنجاب سے باہر نکلے بند کر دیا گیا۔ اس سلسلہ کی تفصیلات ایک علیحدہ باب میں آئیں گی، لیکن ۱۹۵۳ء کی تحریک کے پسپا ہونے کا نتیجہ تھا کہ صدر ایوب کی حکومت نے ایڈوکیٹ جنرل کی معرفت لاہور ہائی کورٹ کے ڈویژنل جج کو پاکستان کی تاریخ میں پہلی دفعہ اس امر کا بیان دیا کہ قادیانی مسلمان ہیں۔ اس سے بھی کسی پچکے کو یہ جرأت نہ ہوئی تھی۔

ممکن تھا حکومت کو حوصلہ دہوتا، لیکن جس بُری طرح ۱۹۵۳ء کی تحریک کو کچلا گیا تھا اس نے کئی برسوں کے لیے مسلمانوں کے جذبات کو دم م کر دیا تھا۔ اس دوران میں کئی سانحات ہوتے رہے ایوب خاں کے مارشل لار کی عمرو راز ہو گئی۔ سید عطار اللہ شاہ بخاری جو اس تحریک کی روح رواں تھے اپنے اللہ کے ہاں چلے گئے۔ ان کے جانشین قاضی احسان احمد شجاع آبادی تھے اور ان کا موضوع ہی قادیانیت تھا، لیکن ان کا پیمانہ عمر بھی بریز ہو گیا۔ مولانا سید ابوالحسنات بھی اللہ کو پارے ہو گئے، بعض دوسرے راہنما عمل سیاست میں گھو گئے۔ جن علماء نے اس مسئلہ کو اپنے خطبات میں مقامی طور پر زندہ رکھا وہ ختم نبوت کے مطالب پر غلط کرتے یا قلم اٹھاتے

انہیں اس امر کا اندازہ ہی نہ تھا کہ میرزا قیاسی سیاست کی حیثیت سے پرورش پا رہے اور پروان چڑھ رہے ہیں۔ اس موضوع پر آئندہ صفحات میں گفتگو ہوگی۔ زیر نگاہ مسئلہ ۱۹۵۳ء کی تحریک کا ہے کہ اس کا مارا د باعلیہ کیا تھا اور اس پر کیا مبنی؟

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی گرفتاری سے پہلے نیا دہلی میں مسند کے نام سے ایک پمفلٹ میں پوری کئی بیان کی۔ پھر سی پمفلٹ ان کی گرفتاری اور مزارعے موت کا باعث ہوا۔ اپنے مقدمہ میں مولانا نے تین جامع بیان داخل کئے۔ ان بیانیوں کے بعد میرزا کو اتاری رپورٹ چھپ کر سامنے آئی تو اس پر جماعت نے ایک مبسوط تبصرہ کیا اور ان خامیوں کی نشاندہی کی جو اس رپورٹ میں واضح طور پر موجود تھیں۔ اس کی روداد ایک علیحدہ باب میں درج ہے۔ سب سے بڑی بات جو اس تحریک میں پسپائی کے بعد پیدا ہوئی وہ مجلس ختم نبوت کا قیام تھا، اس کا صدر دفتر ملتان میں قائم کیا گیا۔ شاہ جی اس سال ۱۳ ستمبر کو صدر منتخب کئے گئے۔ مولانا محمد علی ہالند صری ناظم اعلیٰ مقرر ہوئے۔ مولانا قاضی احسان احمد مجلس کے مرکزی سفیر تھے۔ ان کے علاوہ پیپاس کے لگ بھگ سفیر مقرر کئے گئے جو وقتاً فوقتاً مختلف صوبوں اور ضلعوں کے سربراہ رہے۔ اُدھر تحریک کی اندوھناک پسپائی سے لوگوں میں مایوسی کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ کئی لوگ ان شہداء کے متعلق جو اس تحریک ناموس ختم نبوت پر قربان ہو چکے تھے یہ سوال کرتے کہ ان کے خون کا ذمہ دار کون ہے؟ شاہ جی نے لاہور کے ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے جواب دیا کہ:-

”جو لوگ تحریک ختم نبوت میں جہاں تنہا شہید ہوئے ان کے خون کا جواب دہ میں ہوں۔ وہ عشق رسالت میں مارے گئے۔ اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ ان میں جذبہ شہادت میں نے پھونکا تھا۔ جو لوگ ان کے خون سے دامن بچانا چاہتے اور ہمارے ساتھ رہ کر اب کتنی گترا رہے ہیں۔ ان سے کہتا ہوں کہ میں حشر کے دن بھی ان کے خون کا ذمہ دار ہو رہا ہوں گا۔ وہ عشق نبوت میں اسلامی سلطنت کے ہلاک خاؤں کی بھینٹ ہو گئے، لیکن ختم نبوت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بھی سات ہزار حافظ قرآن اس مسئلہ کی خاطر شہید کر دیئے تھے۔“

شاہ جی تحریک کی پسپائی سے غایت درجہ ملول تھے۔ ان کا دل بکھ چکا تھا۔ فرماتے غلام احمدؒ کی نبوت کے لیے تحفظ ہے، لیکن محمدؐ کی ختم نبوت کیلئے تحفظ نہیں۔ عموماً اشکبار ہو جاتے۔ اسی زمانہ میں ایک دن تقریر کرنے کے لیے اٹھے تو عمر بھر کی روایت کے برعکس نہ خطبہ مسنونہ پڑھا، نہ زیر لب ورد کیا۔ فرمایا:-

منظر پرینڈنٹ، ایڈیٹر اینڈ منیجنگ ایڈیٹر نے مقدمہ لگایا اور شہید رہ گئے۔

”شاہ جی یہ کیا؟“

فرمایا ————— "ایک سیکور ریاست کے شہریوں سے مخاطب ہوں؛ لوگ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

بولے ————— "ہنسو نہیں۔ ہر ہنسی کے تعاقب میں آنسو ہوتے ہیں؟"

آواز آئی شاہ جی خطبہ پڑھتے!

جواب دیا ————— "بھائی اسلام سب جوڈس ہو چکا ہے۔ قرآن پڑھنا سہل نہیں رہا۔ جسٹس منیر نے

ترہین عدالت میں طلب کر لیا تو سوچتا ہوں بڑھی ہڈیاں ان کا تاؤ سکیں گی؟"

جب تک زندہ رہے ہر تقریر میں تحقیقاتی رپورٹ پر چوٹ کرتے اور جسٹس منیر سے متعلق ایک آدھ

پہلو دار فقرہ ضرور کہتے۔ اکثر مولانا ظفر علی خاں کے اس شعر پر مردھنستے تھے ۷

میرزا بیوں کا نام ذرا دیر سے مٹ

حق کے جلال سے یہی اک ڈھیل ہو گئی

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اُردو کی تماشہ گاہ میں

خواجہ ناظم الدین کی حکومت نے تحریک راست اقدام ۱۹۵۳ء کو جس بے جھج سے کھلا اس کی ہیجان زدہ روداد اجمالی طور پر پچھلے باب میں آچکی ہے، چونکہ ملک کے وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین تھے اس لیے ان کے نفاذ اقتدار میں فدا یان ختم نبوت سے جو ٹکڑا کیا گیا اور راست اقدام کی تحریک کو جس وحشیانہ انداز میں چھٹاڑا گیا اُس کی نشاندہی کے لیے خواجہ صاحب کے عہد وزارت کا تعین لازم ہے۔ ورنہ خواجہ صاحب شاید اس قدر مجرم نہ تھے جن لوگوں نے اس تحریک کو حکومت کے ہل پر تھس نسیس کیا اور مارشل لا کے جھوٹے میں بیٹھ کر شیدایان خاتم النبیین پر گزریاں چلوائیں ان میں کچھ تو وزارت کے لادین ارکان تھے، چوہدری ظفر اللہ خاں کے آقا یان ولی نعمت کا دباؤ تھا اور خواجہ صاحب ہی کی روایت کے مطابق امریکی حکومت نے اپنا حمایتی و نفاذی قادیانی امت کے پٹے میں ڈال رکھا تھا۔ خواجہ صاحب نے منیر انکو آرمی کمیٹی کے سامنے اس امر کا اعتراف کیا تھا کہ ظفر اللہ خاں وزارت سے الگ کئے جاتے تو پاکستان امریکی گندم کی امداد سے محروم ہو جاتا جس کی اُن دنوں ملت کے باعث پاکستان کو سخت ضرورت تھی۔ یہی دوزخانہ تھا جب قادیانی امت نے امریکہ کی صیہونی خواہشوں سے گٹھ جوڑ کیا اور عرب ملکوں میں اسرائیل کی خاطر جاسوسی کے فرائض انجام دینے کا معاہدہ کیا۔ خواجہ صاحب نے امریکی گندم کے متعلق جو کچھ کادہ غلط نہ تھا۔ اس وقت امریکہ کی وزارت خارجہ اور غیر مالک کی امداد کا شعبہ سیولویوں کے ہاتھ میں تھا اور وہ امریکہ کی

پراسرار خدمات بجالانے کے لیے قادیانی امت کو تلاش کر چکے تھے۔ ادھر اتفاق سے پاکستان کی سیاسی زندگی میں
 یسودکرسی کا اقتدار قائم ہو چکا تھا اور بعض نمایاں عہدوں پر اس قماش کے اشخاص فائز تھے جن کا ضمیر برطانوی
 استعمار کی مٹی میں گندھا ہوا تھا۔ مثلاً ملک کے ڈیفنس سیکرٹری میر جنرل اسکندر مرزا بنگال کے روایتی خدار
 میر جعفر کی اولاد تھے۔ جب تک انگریز رہے ان کی سیاسی خدمات بجالانے میں اپنا جوڑ نہیں رکھتے تھے۔
 خواجہ صاحب کے زمانہ وزارت تک مرکزی انسروں میں تھے، لیکن ملک کے عوام بالکل نہ جانتے تھے کہ حکومت
 کے دوائروں میں وہ کوئی سیاسی طاقت رکھتے ہیں۔ ملک غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کی وزارت کو برخواست کیب تو
 اس کے ساتھ ہی اسکندر مرزا مطلع سیاست پر نمودار ہو گئے۔ انہیں پچھلے مشرقی پاکستان میں گورنر بنایا گیا۔ پھر مرکزی
 حکومت میں وزیر داخلہ ہو گئے۔ اس کے بعد ملک غلام محمد کی بمبونا علاقہ سے فائدہ اٹھا کر گورنر جنرل کا عہدہ
 سنبھالا۔ جب چوہدری محمد علی نے پاکستان کا آئین تیار کیا تو ملک کے صدر بن گئے۔ پھر کئی ایک وزارتوں سے
 کھیلتے رہے۔ آخر مارشل لار ناندیکا، لیکن اسی کے ہاتھوں مارے گئے اور ملک سے جلا وطن ہو کر انگلستان چلے گئے
 وہاں لندن کے ایک ہوٹل میں کچھ عرصہ ملازمت کی۔ آخر کار موت کا بلاوا آگیا اور مر کے ایران میں دفن ہوئے۔
 اسکندر مرزا مسئلہ طور پر لادین تھے! انہیں علمائے دین سے سنت نفرت تھی اور ہر ایسے ادارے کو فاکر دینے
 کے حق تھے جس کی اساس یا مزاج میں مذہب ہو۔ انہیں اس امر کا سنت افسوس تھا کہ تحریک ختم نبوت میں
 مارشل لار کو وسیع نہیں کیا گیا اور نہ ملاؤں کو تختہ دار پر کھینچا گیا۔ یہ بات راقم نے ان کے ہونٹوں سے خود سنی
 وہ میاں مشتاق احمد گورانی وزیر داخلہ کے بنگلہ پر تشریف لاتے۔ تعارف جواز جہاں انہوں نے کئی اور غلط باتیں
 کیں وہاں یہ گلہ بھی کیا کہ وزارت نے ان کی بات نہیں مانی۔ اگر پاکستان کے ملاؤں کو اس تحریک کی فضا میں پھانسی
 پر لٹکا دیا جاتا تو ملک ہمیشہ کے لیے ان سے پاک ہو جاتا۔ اسکندر مرزا کے علاوہ ملک غلام محمد بھی علماء سے معاندت
 میں پیش پیش تھے۔ کچھ اور چہرے بھی تھے جن کا معاملہ اب اللہ کے سپرد ہے۔ ان تمام چہروں کا ذکر کرتے ہوئے
 سردار عبدالرب نشتر نے راقم سے کہا تھا کہ جن لوگوں نے تحریک ختم نبوت میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل اور ختم نبوت
 کے مسئلہ کو اپنے اقتدار کی مسند پر قربان کیا، انہیں جانتا ہوں کہ ان کے شب و روز کی دیرانی کا حال کیا ہے اور ان
 دماغ دول پر کیا بیت رہی ہے۔ خدا کے ہاں دیر ہے اندھیرا نہیں۔

تحریک راست اقدام کا عظیم المیہ یہ تھا کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو مارشل لار کے تحت خود ساختہ جرم میں
 موت کی سزا دی گئی۔ دلچسپ امر یہ تھا کہ ۲۶ فروری ۱۹۵۷ء کو مجلس عمل کے مقتدر راہنہ کراچی میں گرفتار کئے گئے۔

انہیں سندھ کی منتقل جیلوں میں رکھا گیا۔ ادھر حکومت نے عوام کے جوش ایمان سے بے بس ہو کر لاہور میں ۲۶ مارچ کو مارشل لا نافذ کر دیا اُس کے بائیس روز بعد ۲۸ مارچ کو مرکزی حکومت کے لا دین عناصر نے ہفت ویز کر کے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو فوج کی معرفت مارشل لا کے تحت گرفتار کر لیا اور لاہور کے شاہی قلعہ میں رکھا، وہاں مولانا سے تحریک ختم نبوت کی داستان پوچھی، مولانا فرماتے ہیں کہ پوچھ گچھ دو روز رہی، مجموعی طور پر تین گھنٹے صرف ملتے اسکے بعد ۳۵ روز تک میں قلعہ میں رہا جب ایک مقدمہ تصنیف کر لیا گیا تو مجھے لاہور سنٹرل جیل بھیج دیا۔ ملک غلام محمد گورنر جنرل پاکستان سرمنٹی کو لاہور آئے۔ ان کے ساتھ اسکندر مرزا بھی تھا۔ یہاں انہوں نے اس وقت کے بعض اعلیٰ فوجی افسروں سے بات چیت کی۔ پھر ۵ مئی کو واپس چلے گئے اور ۹ مئی کو اس امر کا آرڈی منس جاری کیا کہ مارشل لا کی عدالتیں مارشل لا کے نفاذ سے قبل مزد ہونے والے جرائم کی بھی سماعت کر سکتی ہیں اور ان عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف ملک کی کسی عدالت میں کوئی اپیل نہیں ہو سکتی۔ مولانا کا مقدمہ چارپانچ دن چھی دن مئی کو ختم ہو گیا اور ۱۱ مئی کی رات کو اندسے ضابطے کے تحت انہیں سزائے موت کا حکم سنایا گیا۔ اس فیصلے سے تمام دنیا نے اسلام میں رنج و اندوہ کی لہر دوڑ گئی۔ پاکستان میں ہر چہرہ غموں ہو گیا ادھر حکومت کو دو تین دن ہی میں پتہ چل گیا کہ اس فیصلے کے نتائج کیا ہوں گے؟ اور موت ان ارباب حکومت کے پیچھے بھی ہے جن کی ذہنی بیماری اس سزا کا باعث ہوئی ہے۔ چنانچہ ۱۴ مئی کو موت کی سزا عمر قید میں بدل دی گئی۔

مولانا کے خلاف مارشل لا کے ضابطہ نمبر ۱ اور تعزیرات کی دفعہ ۱۵۴ الف کے تحت مقدمہ چلایا گیا۔ جرم یہ تھا کہ انہوں نے تادیبی مسئلہ نامی پمفلٹ لکھا جو مارشل لا سے ایک دو روز پہلے چھپ چکا تھا اور مارشل لا کے پورے زمانہ میں شائع ہوتا رہا اور کبھی ایک دن کے لیے بھی اس پر کوئی پابندی عائد نہ کی گئی اس پمفلٹ کا مضمون یہ تھا کہ اصل مسئلہ کیا ہے؟ اس بارے میں کوئی سی غلط فہمی نہ رہے اور لوگ کس طرز کے مسنون پروپیگنڈے کا شکار نہ ہوں۔ اسس اس پمفلٹ میں ایسی کوئی بات نہ تھی جو حکومت کی پریشانی کے لیے کسی شکن کا باعث ہوتی۔ لیکن حکومت ایک ارادہ کر چکی تھی اس کی تکمیل کے لیے اس نے پمفلٹ کی آرٹی اور مولانا کو سزائے موت سنائی۔ اس کے علاوہ جماعت اسلامی کے روزنامہ ”تسنیم“ کو ماخوذ کیا اور اس کے ایڈیٹر کو اس جرم میں تین سال قید با مشقت کی سزا دی۔ تماشہ یہ تھا کہ مولانا مودودی کے جن دو بیانیوں کو حکومت نے بغاوت پھیلانے کے مترادف قرار دیا وہ ”تسنیم“ کے علاوہ لاہور و کراچی کے دوسرے اخبارات میں بھی شائع ہوتے تھے۔ پھر جس پمفلٹ کی اشاعت پر مولانا مودودی کو سزائے موت کا مستوجب گردانا گیا اس کے خلاف مارشل لا کی پوری مدت میں فوجی حکام نے کوئی پابندی لگائی اور نہ مرکزی یا کسی صوبائی حکومت نے

قابلِ تذعن سمجھا۔ آج تک وہ پمفلٹ مسلسل فروخت ہو رہا ہے اور مئی ۱۹۵۳ء تک اردو، انگریزی، سندھی، گجراتی اور بلوچہ میں نوے ہزار سے زائد شائع ہو کر لاکھوں افراد کی نظر سے گذر چکا تھا۔

مولانا کا جرم دراصل یہ تھا کہ ۱۹۵۲ء تک وہ اسلامی دستور کی تحریک کو عامۃ المسلمین کے رُک و رویشے میں اتار چکے تھے اور یہ لادین مقتدرین کے لیے سب سے بڑا خطرہ تھا۔ انہوں نے قادیانی مسئلہ کے جرم میں مولانا کو مزارعے موت سنا کر اس خطرے کا تدارک کرنا چاہا لیکن مزارعے موت دینے کا حوصلہ نہ کر سکے کہ انہیں اپنی موت بھی نظر آرہی تھی، البتہ اُس مارشل لار کے بعد ملک سے جمہوری روح ختم ہو گئی۔ مارشل لار نے اس طرح ہال و پیر پیدا کئے کہ ملک کا مقدر ہی مارشل لار ہو گیا اگر اُس وقت کے سیاسی حکمران مارشل لار کی مشق نہ کرتے تو ملک اس حال نہ پہنچتا جس حال کو بعد میں پہنچا۔ اور نہ جمہوری سیاست ہی اس طرح پامال ہوئی۔ اس مارشل لار نے دہری خرابیاں پیدا کیں۔ ایک خرابی یہ کہ فوج کے جرنیلوں کو حصولِ اقتدار کا چمک لگ گیا۔ دوسری خرابی یہ کہ سیاستدان پٹ گئے۔ ملک غلام محمد اور اسکندر مرزا تو جسد ہی ناما غفیل ہو گئے، لیکن ایوب خاں اور یحییٰ خاں نے ملک کو جو تھکے دیئے وہ اس کے جمہوری وجود اور قومی سالمیت کے لیے سرطان ہو گئے۔ ملک دو ٹوٹ ہو گیا۔ جمہوریت میں دم ہی نہ رہا۔ مولانا ملک میں اسلامی دستور کی تحریک کے بانی تھے اور اس سلسلہ میں خاں یاقوت علی خاں کے زمانہ ہی میں ایک ذہنی فضا پیدا کر چکے تھے۔ اس فضا ہی کا نتیجہ آئین کے سر آغاز میں قرار داد مقاصد کا چہرہ نما تھا۔ ان کی مساعی مشکور کی بدولت ۱۱ سے ۱۹ جنوری ۱۹۵۳ء تک یعنی راست اقدام کی تحریک سے ڈیڑھ ماہ پہلے ملک کے ۳۳ سربراہ آوروہ علماء نے کراچی میں جمع ہو کر دستوری سفارشات میں کئی ایک ترامیم منظور کرائی تھیں۔ انہی میں ایک ترمیم یہ تھی کہ قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ۔ ایک اقلیت قرار دیا جائے۔ مولانا کا خیال تھا کہ آئین کی بنیادیں طے ہو جائیں تو آئینی سفارشات کی روشنی میں مسئلہ خود بخود طے ہو جائے گا اور اگر اس سے الگ راست اقدام کی تحریک چمک اُٹھے تو نہ صرف صورتحال ہی مختلف ہو جائیگی بلکہ ان سفارشات کے تمام و کمال تاراج ہو جانے کا احتمال ہے۔ اس صورت میں حکومت مسئلہ بھی حل نہ کرے گی بلکہ آئین کو اسلامی بنانے کی تحریک ہی سے فرار کر جائے گی۔ جو اس وقت تمام حلقہ ہائے خیال کے برگزیدہ ملک کی مقدمہ کوششوں سے اٹل ہو چکی ہے۔ لیکن مجلسِ عمل کے دوسرے زعماء فوری طور پر راست اقدام کے حق میں تھے۔ حکومت کے مرکزی بزرگ چہروں نے، ۲۶ فروری کی شب کو انہیں پکڑ دیا۔ ان کی گرفتاری سے مسلمانوں میں احتجاج کا ایک طوفان اٹھا۔ اس کے بعد لادین مقتدرین نے جس جس انداز میں گل کھلائے وہ ڈھکے چھپے نہ رہے۔ پنجاب کو خون میں نہلیا گیا اور ان تمام قادیانی رسالت کی ذہنی یا جسمانی اہانت بے دین و ذرا و حکام کا لازماً ہو گئی جو ختم نبوت

کے مسئلہ میں متفقہ آواز رکھتے تھے۔ مولانا مودودی کا متناقصہ یہ تھا کہ وہ اس مسئلہ میں اپنے تلمیذ مسلمانوں کے اجتماعی ضمیر کی راہنمائی کر رہے تھے اور قادیانی مسئلہ "پمپٹ کلکرا" انہوں نے مسئلہ کی حقیقی روح کو پیش کیا تھا، ان کا اصل جرم دستور کو اسلامی بنانے کی تحریک کا نشرواستقامت تھا۔ مشر چند ریگر گورنر پنجاب نے تحریک مغم نبوت کی بے پناہی سے گہرا کرم مارچ کو مقامی زعماء کا ایک اجلاس طلب کیا۔ مولانا ابراہام علی بھی مدعو کئے گئے اور وہ شریک ہوئے۔ مولانا نے اس اجلاس میں گورنر سے کہا کہ اس وقت دو ہی راستے ہیں۔ ایک راستہ یہ ہے کہ پبلک کو مطمئن کر کے امن قائم کیا جائے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ آج ہی وزیراعظم پاکستان کی طرف سے اعلان کیا جائے کہ حکومت پبلک کے مطالبات پر گفت و شنید کرنے کے لیے تیار ہے۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ حکومت اپنی طاقت کو استعمال میں لا کر تحریک کو کھل ڈالے ظاہر ہے کہ یہ راستہ طاقت کے غرور کا راستہ ہوگا اور اس سے مسئلہ کا حل نہ ہوگا اور نہ اس سے مفید نتائج پیدا ہوں گے۔ اگر حکومت پبلک کو مطمئن کرنا چاہتی ہے تو وہ پہلا راستہ اختیار کرے۔ گورنر نے مولانا سے اتفاق کیا۔ اور گزارش کی کہ وہ باقاعدہ تجویز مرتب کر دیں۔ مولانا نے اس وقت تقریر لکھ دی۔ پھر گورنر نے اُس مسئلہ کی تیاری کے لیے کہا جو وزیراعظم کی طرف سے اعلان کی شکل میں جاری کرنا مقصود تھا۔ مولانا نے وہ بھی تحریر کر دیا۔ گورنر کے علاوہ خلیفہ شجاع الدین اسپیکر پنجاب اسمبلی اور علاؤ الدین صدیقی نے قدرے ترمیم و اصلاح کے بعد اس پر صاف کیا۔ اس اعلان میں عوام سے اپیل کی گئی کہ وہ راست اقدام کی تحریک بند کر دیں اور پُر امن رویہ اختیار کریں حکومت جلد سے جلد عوام کے متمتع علیہ نمائندے بلا کر اس مسئلہ پر اُن سے گفتگو کرے گی اور اس گفتگو کا جو بھی نتیجہ ہوگا وہ حکومت اور عوام کے نقطہ نگاہ کی وضاحت کے ساتھ شائع کیا جائیگا۔ گورنر نے مولانا سے وعدہ کیا کہ یہ اعلان ۵ اور ۶ رک درمیان شب کو نشر کر دیا جائے گا، لیکن نشر یہ اس مضمون سے متفق ہوا اور ایسی کوئی سی بات نہ کہی گئی جس کا مقصد پبلک مطالبات پر گفتگو کرنا تھا۔ اس سے اگلی صبح ۶ مارچ کو لاہور میں مارشل لا کا آغاز ہو گیا۔

مولانا ۲۸ مارچ کو شب کو گرفتار کئے گئے جس کی جزوی روداد اوپر آچکی ہیں۔ مولانا نے موت کی منرائیں کر بے تغیر استقامت دکھائی۔ حکومت اس سے لڑ گئی۔ آپ نے پہلے ہی دن پھانسی کی کوٹھڑی میں اپنے لواحقین سے کہا کہ مرے لیے کسی عثمان سے کوئی اپیل نہ کرنا اور نہ حکومت سے کوئی استدعا کرنے کی ضرورت ہے جب مجھے پھانسی دیدی جائے تو مجھے انہی کپڑوں میں دفن دینا اور اپنی زندگی اسی عشق و مقصد کے تحت بسر کرنا جس کے لیے ہم سب کوشاں ہیں اور جو اسلام کو اقتدار میں لانے کا قرآنی نصب العین ہے بزدلان حکومت کو اندازہ ہی

نہ تھا کہ جو لوگ اسلام کے لیے جیتے اور اسلام کے لیے مرتے ہیں ان کی سیرت اس طرز کے سانچے میں ڈھلی جوتی ہے اور انہیں کوئی سی دنیاوی آلائش یا ابتلا زیر نہیں کر سکتے۔ یہ ذکر اچکا ہے کہ حکومت نے تین چار روز ہی میں موت کی سزا منسوخ کر دی پھر اس کے بعد پنجاب ہائی کورٹ کے ایک فیصلے کی بنا پر مولانا ۱۹۵۵ء میں رہا ہو گئے۔ اس کا پس منظر یہ تھا کہ جسٹس منیر نے مولوی تمیز الدین خاں کے مقدمہ میں گورنر جنرل کو شاہی اختیارات کا حامل قرار دیکر فیصلہ کیا کہ مرکزی اسمبلی کے پاس کئے جوتے وہ تمام قوانین غیر آئینی ہیں جو اس نے دستور ساز مجلس کی حیثیت سے وضع کئے اور جن پر گورنر جنرل کے دستخط نہیں ہوئے اسی کا نتیجہ تھا کہ بہت سے قوانین کے ساتھ وہ انڈیمنٹی ایکٹ بھی غیر آئینی قرار پا گیا۔ جس کے تحت مارشل لا رکھنا نہیں بحال رکھی گئی تھیں اس بنا پر پنجاب ہائی کورٹ نے مولانا کی سزا ختم کر دی اور مولانا نے سزائے موت سے ختم نبوت کا مسئلہ نہ صرف عرب ریاستوں میں ایک عالمگیر اسلامی دہن کی شکل اختیار کر گیا بلکہ یورپ کے کئی ایک ملکوں کی علمی اور سیاسی فضا تک پہنچ گیا۔ یعنی ان ملکوں میں مستشرقین کی حد تک یہ بات نمایاں ہو گئی کہ پاکستان میں قادیانی مسئلہ کیا اہمیت رکھتا ہے اور مسلمان اس جماعت کے بارے میں کیا سوچتے اور کیا چاہتے ہیں؟ اگرچہ منیر انکو آئری کمیشن اپنی لمبی افتاد کے باعث ایک غلط نفاذ کا ٹکڑا تھا، لیکن جماعت اسلامی نے اس پر انداز و فکر کے مطابق جسٹس منیر کی اڑان کھائیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ پھر جب منیر رپورٹ چھپ کر سامنے آئی تو اس کا اس طرح پوسٹ مارٹم کیا کہ وہ رپورٹ دینی اور علمی حلقوں میں ایک غش کتاب ہو کر رہ گئی اس کتاب کا بنیادی نقص یہ تھا کہ جسٹس منیر نے پاکستان کے بنیادی صوبے پنجاب کا چیف جسٹس ہونے کی حیثیت میں اپنے قلم کے اتنے تفلوں سے ایک ایسی داستان مرتب کر دی تھی جس کو خلاف اسلام طاقتوں مثلاً امریکہ و یورپ کے عیسائیوں اور یہودیوں ریاست اسرائیل کے دانشوروں اور جاگھوں اور ہندوستان کے سنگٹھنوں اور مباحثاتیوں نے خوب خوب استعمال کیا۔ قادیانی مغربی ممالک کے علاوہ افریقی ریاستوں میں اس کا چرچا کرتے رہے اس رپورٹ میں مسلمان کی تعریف کے تحت اسلام کا مذاق اڑایا گیا اور علماء کے استحقاق کی آڑ میں قادیانیت کا جواز قائم کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جسٹس منیر کسی اختیار سے کبھی راسخ العقیدہ مسلمان نہیں رہے۔ وہ سپریم کورٹ کی چیف جج تک پہنچ گئے لیکن انہوں نے پاکستان میں جمہوریت اور اسلامیت کو سخت نقصان پہنچایا اور یہ ان کا ناقابل معافی جرم تھا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے تبصرے کے زیر عنوان رپورٹ کا تجزیہ کیا کہ اس کے مندرجات کا تو کیا اور بیرونی ممالک کے جن حلقوں میں اس کی مضرتیں پھیل گئی تھیں وہاں ان مضرتوں کو ہمیشہ کے لیے نازل کر دیا۔

پچھلے سال تبصرہ اردو میں نکلا۔ پھر چند ماہ کے وقفے سے عربی میں مودودی نمونیاں مرتب کی گئیں اور اس طرح

ایک کتابچہ مدون ہو گیا۔ اگلے سال تبصرہ کا انگریزی ترجمہ تیار ہو کر امریکہ، افریقہ اور یورپ کے ملکوں میں تقسیم کیا گیا۔ تمام نامور مشرقین اور خاص خاص اساتذہ کے علاوہ انگریزی ترجمے کی بے شمار کاپیاں یورپی و امریکی جرأت و صحافت کو پہنچائی گئیں۔ اس کے علاوہ مغربی ملکوں کی تمام یونیورسٹیوں اور لائبریریوں میں اس کے نسخے ارسال کئے گئے۔ اس کا بنیادی فائدہ یہ ہوا کہ امریکہ، یورپ اور افریقہ میں کسی نامسلمان مصنف و مقرر نے پھر کبھی اس کا حوالہ نہ دیا۔ گویا اس اعتبار سے رپورٹ ساقط الاعتبار ہو گئی۔ جہاں تک مسلمان ممالک کا تعلق تھا وہ اس رپورٹ ہی سے ناواقف تھے اور نہ اسے کسی عنوان سے کوئی سی اہمیت دی گئی۔ پاکستان میں اس رپورٹ کو پائے استعار سے ٹھکرا دیا گیا۔ اس کے رد میں مولانا نے سب سے پہلے قلم اٹھایا۔ ان کے بعد مختلف اہل قلم نے اس پر طبع آزمائی کی اور رپورٹ کو ملک بھر میں اخموک بنا دیا۔ ایک دمپسپ امریہ ہے کہ پنجاب کے جلسہ ہائے عام میں کئی جگہ نوجوانوں نے رپورٹ کو نذر آتش کیا اور لاکھوں عوام نے تالیاں پیٹ پیٹ کر تحسین کی۔

پاکستان میں اس انداز کے سیاسی حالات تھے کہ پرانی نسلیں کے تعلیم یافتہ بھر و جہ اس مسئلہ ہی سے ناواقف تھے۔ یا واقف نہیں ہونا چاہتے تھے، یا پھر دین کے مقنیات کو سیاست کی ضروریات کے تحت دیکھتے تھے اور جو نسلیں تحریک پاکستان میں جہان ہوئی تھیں، ایسی جن کی آنکھیں قومی سیاست کے ہنگاموں میں کھلی تھیں، ان کے ذہنوں میں یہ مسئلہ اتر نہیں رہا تھا مولانا نے "قادیانی مسئلہ" میں تعلیم یافتہ طبقات کو اس سے آگاہ کیا تو خانہ نشین قسم کے عبقری و نابغہ بھی مسئلہ کے اور چھوڑے واقف ہو گئے۔ اس کتابچہ کا ہنگامہ اور انگریزی میں فی الفہ ترجمہ کیا گیا جس سے پورے ملک کو مسئلہ کے تمام پہلو معلوم ہو گئے اور حکومت کا پلو دار پر پا گندہ باطل ہو کر رہ گیا۔ حتیٰ کہ منیر انکوائری رپورٹ بالا خانہ کے قہقہوں سے زیادہ اہمیت حاصل نہ کر سکی، مولانا نے اس مسئلہ کو علماء کی طرح محض مذہبی حیثیت ہی سے پیش نہ کیا بلکہ قادیانیت کے عمرانی، سیاسی اور معاشی پہلو بیان کئے جس سے دینی اور سیاسی دوائر کا ہر گوشہ چونکا ہو گیا۔ جو لوگ اب تک مسئلہ کو ملائیت کی شعبہ بازی گردانتے تھے۔ ان کی اکثریت، چند بیار و فہمنوں کے سوا اس حقیقت سے آگاہ ہو گئی کہ قادیانی پاکستان کے لیے ایک مہیب مسئلہ ہیں اور ان سے ملت اسلامیہ کی وحدت مجروح و سلب ہوتی ہے۔ اب تک علماء قادیانیت کے جواب میں مذہبی نوعیت کے مباحث اٹھاتے تھے اور انکا تمام تر لٹریچر اس طرز پر تھا کہ خاتم کے منہ کیا ہیں، حیات و ممات مسیح کا بحث کیا ہے وغیرہ، خود قادیانی علماء کو حیات و ممات مسیح میں اُبھاتے رہے کہ وہ اصل مسئلہ کی طرف نہ آسکیں۔ یا پھر خاتم النبیین کے معانی میں مسانی اُشقلے چھوڑتے رہے اس میں قادیانی امت کا یہ فائدہ تھا کہ وہ مغربی تعلیم کی پیداوار فلسفوں اور ملک کے سیاسی فرزندوں

کو مخاطب دے سکتے تھے۔ انگریزوں نے ہندوستان میں مذہب کے خلاف، مذہب کی سرفت کچھ اس قسم کے شوبے چھوڑے یا قلم لگاتے تھے کہ تکفیر کا مسئلہ مخصوص دینی فضا سے باہر خواص میں بالخصوص اور عوام میں بالعموم کوئی وزن نہ رکھتا تھا۔ غرض مذہبی فضا کے اس انتشار سے قادیانی اپنے تئیں مسلمانوں میں عمرانی طور پر ملت کا جزو بنکر رہ رہے تھے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے اس کتبچہ نے میرزا ایتھ کی ان بنیادوں کو ہلا ڈالا اور جو لوگ لادینی فضا میں زندگی بسر کر رہے تھے انہوں نے محسوس کیا بلکہ انہیں یقین ہو گیا کہ میرزا ایتھ نظر انداز کرنے کی چیز نہیں۔ اس زمانہ میں مولانا کا تذکرہ پمفلٹ تقریباً ہر فوجی افسر نے مطالعہ کیا کیونکہ حکومت نے مولانا کو مرزا دیکر اس خواہش کو پیدا کر دیا تھا کہ آخر یہ مسئلہ کیا ہے ؟ علامہ اقبال

نے اس مسئلہ پر ایک مفکر کی حیثیت سے قلم سے اٹھایا اور عالمانہ سطح سے فلسفہ کی زبان میں گفتگو کی تھی علامہ کی مرث کے بعد ان کے سجادہ نشینوں اور ان کی تعلیمات پر قلم اٹھانے والوں نے علامہ کی ان تحریروں سے اقتبا ہی نہ کیا۔ بلکہ خلیفہ عبدالکیم جیسے بزرگوں نے حکومت کی فشار کے مطابق اقبال اور علامہ کو مرزا مرثی کی جو لوگ ان تحریروں کی اشاعت کے وقت عالم طفلی میں تھے اور نہ اس مسئلہ کا شعور رکھتے تھے، ان کے لیے علامہ اقبال کی حوالہ تحریریں بے وجود تھیں اور وہ نہیں جانتے تھے کہ مصر پاکستان نے قادیانیت کے بارے میں کیا کہا ہے ؟ اور اس سلسلہ میں علامہ کیا چاہتے تھے۔ اور صحرارہ کرام قادیانیت کے جواب میں جو زبان استعمال کرتے تھے وہ عوام کی زبان نہ تھی، ان کی تعلیمات و مصلحات عوام کے دماغ سے کہیں بند تھیں۔ مولانا نے قادیانی پمفلٹ میں سلیس و شگفتہ اور سہل و شستہ زبان استعمال کر کے نہ صرف وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا بلکہ ان دماغوں میں یہ مسئلہ اتار دیا جن دماغوں کے دروازے اس مسئلہ کی طرف سے بند تھے۔ بلاشبہ صحرارہ نے اس سلسلہ میں حیرت انگیز کام کیا اور ضرر و عراب نے میرزا ایتھ کو عوام کے اذہان میں شمر آدہ نہ ہونے دیا، لیکن پاکستان میں اس مسئلہ کی پہچان کے لیے مولانا کے قلم نے ایک ایسی خدمت انجام دی کہ قادیانیت کی حیثیت مطلق سازشوں کے استعماری گاشٹ کی رہ گئی، لیکن ملک کی سیاسی و عمرانی فضا میں کبلا گئی۔

حکومت کے جبر و تشدد سے تحریک راست اقدام کا مظاہرہ احتجاج ضرور ختم ہو گیا۔ اور بعض افسردہ کنویریوں اور کئی صحرارہ کی قداریوں سے اس کا رد بھی ٹوٹ گیا اور من حیث الجماعت وہی آثار پیدا ہو گئے جو حکومتوں سے ٹکراتے ہیں عوامی تحریکوں کے ضعف و اختلال کا باعث ہوتے ہیں، لیکن ایک چیز بہر حال قائم رہی کہ مسلمانوں کے اجتماعی معاشرہ میں میرزا ایتھ کے لیے کسی موڑ یا مرحلے میں کوئی سبب پیدا نہ ہو سکے۔ ایک طرف احرار کے رہنماؤں نے

مجلس تحفظ ختم نبوت قائم کر کے اپنے محاذ کو سرزد نہ ہونے دیا، دوسری طرف مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے عالم اسلامی میں میزائیت کے اعمال و افکار پر نگاہ رکھی۔ ادھر پاکستان میں جمہوریت کی دیرانی کا آغاز ہو چکا اور ملک غلام محمد نے جسٹس منیر کی عدالتی تصدیق سے آئینی روایات کو ذبح کر دیا تھا۔ ادھر حکومت بیوروکریسی کی معرفت استعماری طاقتوں کی دست پناہ ہو رہی تھی اور ان طاقتوں کی پاکستان میں آکر سار جاعت کا نام قادیانی امت تھا۔ قادیانی امت نے ملک غلام محمد کے زمانہ ہی سے فوج میں اپنی طاقت پیدا کرنے کا ارادہ کیا۔ اسکندر مرزا کے عہد میں اس ارادے کو بال و پر لگے۔ ایوب خاں کے زمانے میں قادیانیت نے عسکری طاقت کے علاوہ سیاسی رسوم پیدا کیا۔ مرزا غلام احمد کے پوتے اور بشیر الدین مسعود کے چھیرے مٹر ایم۔ ایم احمد نے اولاً سیکرٹری مالیات کا عہدہ سنبھال کر ثانیاً "اقتصادی منصوبہ بندی کا مختار ہو کر میزائیت کے لیے معاشی انتظام کی راہیں پیدا کیں۔ ایوب خاں کے دور میں خلافت منہج نے ملک کی فوجی اور اقتصادی زندگی پر اس طریق سے قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا کہ بالواسطہ سیاسی زندگی اسی کی زندگی ہو اس سے پہلے جب ۱۹۵۶ء میں عرب اسرائیل جنگ ہوئی اور مصر نے ہزیمت اٹھائی تو اس سے عرب ریاستوں کے عسکری ذخائر کو سخت دھکا لگا۔ ان کی پسپائی کو تمام دنیا نے اسلام میں ایک جاگداز المیہ کی طرح محسوس کیا گیا۔ اس جنگ کے فوراً بعد ۱۹۵۶ء اور ۱۹۵۸ء میں عرب ریاستوں نے پاکستان سے فوجی ماہرین طلب کئے۔ پاکستان سے ایک نبرد مت کھیلپ مختلف شعبوں کے بڑے بڑے عہدوں پر روانہ کی گئی۔ اس کھیلپ میں زیادہ تر فوجی ماہرین تھے، لیکن جو لوگ یہاں سے گئے ان میں زیادہ تر قادیانی امت کے افراد تھے انہوں نے سعودی عرب کو ترجیح دی اور وہاں زندگی کے مختلف شعبوں سے وابستہ ہو گئے۔ سب سے خطرناک پہلو یہ تھا کہ سعودی عرب میں قادیانی عقیدہ فوجی افسروں نے اہم جگہیں حاصل کیں۔ اسرائیل کے جارحانہ منصوبوں میں مدینہ منورہ کو فتح کرنے کا پلان بھی تھا اور ہے۔ اس پلان کو پرمان چڑھانے کے لیے قادیانی افسر آلہ کار ہو سکتے تھے۔ سعودی عرب کے حکمران امتہائی پریشان تھے کہ ان کی فوجی خبریں اسرائیل کے ہاتھ کیونکر لگتی ہیں۔ معاملہ بالکل واضح تھا، لیکن سعودی حکومت کا ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوا تھا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے سعودی حکومت کو اس طرف توجہ دلائی تو ان پر اصل راز کھلا اور حجاز و نجد سے قادیانی امت کا اخراج شروع ہو گیا۔ جسی حکومتی شعبوں میں قادیانی گھس آئے تھے انہیں وہاں سے نکال کر پاکستان رخصت کر دیا گیا بعض اہم محکموں میں قادیانی چھپ چھپا کر رہنا چاہتے تھے، لیکن مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی حسب ہدایت و اتقان حال ان سب کے حدود اربعہ کا پتہ لگا کہ سعودی حکومت کو مطلع کیا تو انہیں سبکدوش کر کے پاکستان لوٹا دیا گیا اور اس طرح حرمین شریفین قادیانیوں کے اسرائیلی منصوبے سے محفوظ ہو گئے۔ انہیں دفن سعودی گورنمنٹ نے مولانا سے درخواست

کی کہ وہ قادیانیت پر ایک کتاب لکھیں جس سے عرب دنیا کو معلوم ہو کہ قادیانیت کیا ہے اور اس کا وجود کن عناصر کا مرکب ہے ؟ مولانا نے "ماہق قادیانیۃ" لکھی جو کہ کیت میں چھپی اور تمام عرب ریاستوں میں بڑے پیمانے پر پھیلا دی گئی۔ مولانا نے فروری ۱۹۶۲ء میں ختم نبوت کے نام سے مسئلہ کی دینی بنیادوں پر قلم اٹھایا اور ایک رسالہ لکھا جو عربی میں ترجمہ ہو کر تمام عرب دنیا میں پھیلا دیا گیا۔ ان دونوں رسالوں کا بنیادی فائدہ یہ ہوا کہ عرب ریاستوں میں یہ تصور ختم ہو گیا کہ قادیانی پاکستان کی ملت اسلامیہ کا فرقہ یا گروہ ہیں۔ جب قادیانی فتنہ واضح و آشکار ہو گیا تو سعودی عرب کی حکومت نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریک پر اپنی مملکت میں قادیانیوں کا داخلہ بند کر دیا۔ ان کی آمد و رفت پر پابندی لگا دی اور جس کے متعلق یہ شبہ ہوا کہ وہ قادیانی ہے اس کے بارے میں مقامی شہادت فراہم نہ ہونے کی صورت میں مولانا کے نائبین سے استفسار کیا جاتا تھا کہ وہ اس کے بارے میں حقیقت حال سے مطلع کریں۔ اس صورت حال سے تل ابیب اور ربوہ دونوں پریشان ہو گئے کیونکہ عرب ریاستوں کی اطلاعات حاصل کرنے کے لیے "عجمی اسرائیل" کے جن باشندوں سے کام لیا جا رہا تھا وہ عرب ریاستوں سے نکالے جا رہے تھے، مولانا کے تذکرہ بالا ہوکتا چوں کا عربی کے علاوہ کئی ایک افریقی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ اس طرح قادیانی امت کی حقیقت مختلف افریقی ریاستوں پر آشکار ہو گئی اور اس کا پیدا کردہ طلسم ٹوٹ گیا کہ وہ پاکستان کی نوزائیدہ اسلامی مملکت کے مخالف ہیں امر خیل ہے اور اس کا مذہب پاکستان کی سب سے بڑی دینی طاقت ہے اس کے بعد مئی ۱۹۶۳ء میں جماعت اسلامی نے قادیانی مسئلہ کے نام سے ۴۷۵ صفحے کی ایک کتاب شائع کی جس میں اس مسئلہ کے مذہبی، سیاسی اور معاشرتی پہلوں کا احاطہ کیا گیا۔ اس کتاب کے پانچ باب ہیں اور آخر میں کئی ایک ضمیمے ہیں۔ پہلا باب قادیانی مسئلہ پر ہے، دوسرے باب میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے مقدمے کی روداد ہے، تیسرے باب میں مولانا کے اس بیان کی نقل ہے جو آپ نے جسٹس منیر کی تحقیقات عدالت میں تحریراً پیش کیا۔ چوتھے باب میں تحقیقات عدالت میں داخل شدہ دوسرے بیان کا متن ہے۔ پانچواں باب عدالت میں پیش کردہ تیسرا بیان ہے۔ ان تین بیانات کے بعد ضمیمہ نمبر ۱ میں عیسیٰ ابن مریم کے نزول کی احادیث کا بیان ہے۔ ضمیمہ نمبر ۲ میں حضرت مہدی کے ظہور سے متعلق احادیث ہیں۔ ضمیمہ نمبر ۳ میں فقہاء، محدثین اور مفسرین کی نزول عیسیٰ سے متعلق ان تصدیقات کا ذکر ہے جو ان کے قلم سے مختلف کتابوں میں نکل چکی ہیں۔ ضمیمہ نمبر ۴ ختم نبوت سے متعلق احادیث کا مجموعہ ہے ضمیمہ نمبر ۵ میں میری مدی، ہجری سے تیرہویں صدی ہجری تک کے اکابر مفسرین کے خاتم النبیین سے

متعلق اقوال ہیں۔ ضمیمہ نمبر ۶ میں عقیدہ ختم نبوت کی اہمیت اور حضور کے بعد دعویٰ داران نبوت کی تکفیر پر علمائے امت کے اقوال ہیں۔ ضمیمہ نمبر ۷ میں میرزا غلام محمد کی تحریک کے مختلف مراحل اور مختلف دعاوی کا تذکرہ ہے۔ اس کے ضمیمہ الف میں بنیادی اصولوں سے متعلق علماء کی پیش کردہ تراجم کا خاکہ ہے ضمیمہ میں قادیانیت سے متعلق علامہ انبال کی تحریر کے اقتباس ہیں۔ ضمیمہ نمبر ۸ میں روزنامہ اسٹیٹسمن کے نام اسی سند سے متعلق علامہ کا خط نقل کیا گیا ہے۔ ضمیمہ نمبر ۹ میں پنڈت نرو کے سوالات کا جواب ہے۔ ضمیمہ نمبر ۱۰ میں ڈسٹرکٹ جج بہاول نگر اور ایڈیشنل سیشن جج راولپنڈی کے دو فیصلوں کی تلخیصات ہیں جن میں قادیانی امت کو دائرہ اسلام سے خارج کیا گیا ہے۔

المختصر مولانا مردوی نے قادیانی امت کے متعلق اس حقیقت ثابتہ کو تمام دنیا نے اسلام کے ذہنوں میں راسخ کر دیا کہ مرزا غلام احمد کی استعاری نبوت کے پیروکار مسلمانوں سے الگ ایک دوسری امت ہیں اور ان کا وجود پاکستان ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا سے اسلام کے لیے موجب خسران ہے۔

تحریک راست اقدام کے بعد

تحریک راست اقدام ۱۹۵۳ء حکومت کے وحشیانہ تشدد کی بدولت اس اعتبار سے ناکام ہو گئی کہ مجلس مل کا ایک مطالبہ بھی تسلیم نہ کیا گیا، لیکن جہاں تک عام انتظامیہ اور پنجاب پولیس کا تعلق تھا، انہیں عامۃ المسلمین کی اجتماعی قوت نے بے بس کر دیا۔ کئی شہروں میں ڈپٹی کمشنروں کا منہ کالا کیا گیا اور پولیس تھانوں میں چھپ کے بیٹھ گئی، لیکن لاہور میں مارشل لار کے نفاذ سے فوج نے عوام کو اس قدر ہراساں کیا کہ گویا اُس کے سامنے کسی دشمن ملک کے شہری ہیں پاکستان کی نوجوان نسلوں کے لیے یہ ایک نیا تجربہ تھا اور ایک آزاد ملک کے شہری اس کا تصور ہی نہ کر سکتے تھے جسٹس منیر نے لاہور ہائی کورٹ میں تحقیقاتی عدالت کی مسند پر فوکش ہو کر مذہبیانہ ختم نبوت کی اس طرح تحقیر کی کہ اس کے اثرات عام مسلمانوں کی ذہنی فضا کے لیے انتہائی ناخوشگوار تھے۔ غرض حکومت کی بے رحمی کو فوج نے سارا دیا اور عدالت نے توثیق کی، لیکن تحریک کی ناکامی حکومت کے دوائر میں ضرور ہوئی اور اس سے لادین عناصر کا مختصر گروہ بھی خوش ہوا۔ یا پھر قادیانیت نے خانہ ساز فتح ماسل کی، لیکن عامۃ المسلمین کے ذہنوں میں قادیانیت کے لیے کوئی سی جگہ نہ رہی۔ ایک مستقل بیزاری اور ہمیشہ کی نفرت پیدا ہو گئی۔ اس صورت حال نے جو نتائج پیدا کئے ان کا خلاصہ یہ تھا کہ:-

۱۔ سیاستدان، بیوروکریسی کے محتاج ہو کر رہ گئے۔ پاکستان نوکر شاہی کے تصرفات کا شکار ہو گیا۔

۲۔ فوج نے سول اقتدار کا ذائقہ چکھ کر سارے ملک پر حکمرانی کا خواب دیکھنا شروع کیا۔ اسی کا نتیجہ خواجہ ناظم الدین کی برطانی کے بعد مشر محمد علی بوگرہ کی وزارت میں جنرل محمد ایوب خاں کا شمول تھا۔ اس چیز کا اندازہ ایوب خاں کی سوانحی سے کیا جاسکتا ہے کہ ان کا ذہن اس سانچے میں کیونکر ڈھلا اور وہ تین سال ہی میں سارے ملک پر کس طرح حکمران ہو گئے ان کے دس سالہ مذاقہ ارا کا خمیر کیا تھا؟

۳۔ ملک میں جمہوریت اور اسلامیت کو رفتہ رفتہ شدید نقصان پہنچا۔ ایک طرف مسلم لیگ بازی پر لطفیل ہو کر رہ گئی۔ اس کا تاریخی وقار مسلمانوں میں زائل ہو گیا۔ دوسری طرف اسلامی نظام کے طرفداروں کو آزمائش و ابتلا کے ہاتھوں انتہائی ضعیف پہنچا۔

۴۔ پاکستان کی سیاسی مرکزیت اس سانحہ کے بعد کمزور ہونے لگی۔ ان وجوہ کو زیر بحث لانے کا یہ عمل نہیں لیکن مشرق پاکستان میں مغربی پاکستان کے خلاف جولوہ میں اٹھیں وہ اس صورت حال کا قدرتی رد عمل تھیں۔ مشرقی پاکستان کی سیاسی لیڈر شپ کو مغربی پاکستان کی بیوروکریسی سے شدید شکایات پیدا ہوتی گئیں۔ پہلا صدمہ یہ تھا کہ خواجہ ناظم الدین کو ملک غلام محمد نے بلا استحقاق اور بلا جواز برخاست کیا۔ دوسرا رنج یہ تھا کہ مولوی تمیز الدین سپیکر قومی اسمبلی کی رٹ جسٹس منیر نے خارج کر کے آئین کی آبرورباب کی تفسیر حلال یہ تھا کہ مشر محمد علی بوگرہ کو پہلے امریکہ سے ورامد کیا۔ پھر اس سے کام لے کر سبکدوش کر دیا۔ چوتھا حادثہ مشر حسین شہید سہروردی سے مغربی پاکستان کی ری پبلیکن پارٹی کا اہم قائد سلوک تھا۔ ان سے استعفیائے کہ اسکندر مرزا نے مشرقی پاکستان کو براؤنختہ کیا۔ مغربی پاکستان کی بیوروکریٹ لیڈر شپ نے پے درپے مشرقی پاکستان کے زخموں پر نیک چھڑکا۔ مثلاً مولوی اے۔ کے فضل الحق کو صوبائی گورنر بنایا۔ پھر موقوف کر دیا، ان کی جگہ اسکندر مرزا کو بھیجا۔ مولوی صاحب پر سیاسی گالیوں کی جھاڑ باندھی۔ ضرورت پڑی تو مرکزی وزارت میں لے لیا۔ ضرورت نہ رہی تو رخصت کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی سیاست مغربی پاکستان کے جن بیوروکریٹس کے ہاتھ میں رہی وہ سیاسی اعتبار سے کوئی سی حوامی خصوصیت نہ رکھتے تھے۔ انہیں اپنے ملک کے عوام کی بہ نسبت استعماری طاقتوں کی پشت پناہی پر بھروسہ تھا اسی زمانے میں پاکستان کی سیاسی ابتری شروع ہوئی اور حالات بگڑتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ عالمی طاقتوں نے پاکستان کو اپنی مصلحت کا مہرہ بنایا۔

۵۔ قادیانی بزرگچہروں نے اسکندر مرزا کے عہد میں اپنے سیاسی مقاصد کی مہم شروع کی۔ اور استعماری طاقتوں سے گتھ بندھن کے بعد اسرائیل سے معاہدہ کیا کہ وہ ان کے لیے عرب ریاستوں میں خفیہ خدمات انجام دیں گے

اور پاکستان کی سیاسی فضا کو اُسی بیج پرے آئیں گے جو استعماری طاقتوں کی سیاسی خواہشوں کا منصوبہ ہے۔ چوہدری سرفراز احمد خاں کا پاکستان کی وزارت خارجہ سے سبکدوش ہو کر انٹرنیشنل کورٹ کانج ہونا، اسی سلسلے کا ایک شگوفہ تھا۔ اور پاکستان میں قادیانیوں نے فوج کے تینوں شعبوں میں پاؤں جمانا شروع کئے۔ مشریم۔ ایم۔ احمد مرکزی حکومت میں مالیات کے سیکرٹری ہو کر براہِ جان ہو گئے۔ آخر کار اقتصادی منصوبہ بندی اُن کے ہاتھ میں چلی گئی۔ انہوں نے مشرقی پاکستان کو استعماری پلان کے مطابق اقتصادی ترقی سے محروم رکھا جس سے اُس کی ناراضی کو شہ ملی اور مغربی پاکستان سے علیحدگی کا ذہن نشوونما ہانے لگا۔ پاکستان کی اٹانک انرجی کا چتر تین پروفیسر عبدالسلام قادیانی کو مقرر کیا گیا وہ انگلستان میں کیمبرج یونیورسٹی کا پروفیسر لیکن در پردہ سی۔ آئی۔ اے کا آلہ کار تھا۔ اور اب تک استعماری خدمات پر مامور ہے۔

غرض تحریکِ راست اقدام کے بعد پاکستان سیاسی طور پر ایک کٹے ہوئے پتنگ کی طرح ہو گیا۔ اس کے بعد شاید ہی کوئی سال جمعیتِ خاطر کا ہو۔ ہر روز سیاسی شرارتیں جنم لیتیں اور مقتدرین قوی استقامت کو دباؤ پر لگا کر قمار بازی کے شغل میں منہمک ہوتے۔ خواجہ ناظم الدین کی وزارت عظمیٰ تحریکِ ختمِ نبوت کے خون سے گل گئی ہوئی تو یہاں متنازعہ دولتِ مذکِ وزارت کا صفایا کیا گیا۔ اس کے بعد ملک غلام محمد نے بطور گورنر جنرل، ۱۷ اپریل ۱۹۵۳ء کو خواجہ ناظم الدین کی وزارت عظمیٰ کا پتا کاٹ دیا۔ اُدھر اگلے سال ۱۹۵۴ء کے موسمِ بہار میں مسلم لیگ کو مشرقی پاکستان میں شکستِ فاش ہوئی۔ اس سے ملکی معاملات کا نقشہ بدل گیا۔ ملک غلام محمد نے، ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو مجلسِ دستور ساز ترقی جیسٹس منیر نے اس اقدام کی عدالتی توثیق کی۔ مشر محمد علی بوگرہ نے جنرل ایوب خاں کو کاہنہ میں شریک کیا۔ وہ کمانڈر انچیف بھی رہے اور وزیرِ دفاع بھی! اس کشاکش میں ملکی حالات کا سفینہ منہدم صار میں گھرا رہا۔ اُدھر جون ۱۹۵۵ء میں نئی دستور ساز اسمبلی کے انتخابات مکمل ہوئے، اسی دوران میں ملک غلام محمد کی بیماری بے قابو ہو گئی۔ ان کی جگہ اسکندر مرزا نے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا۔ چوہدری محمد علی نے ۱۹۵۶ء کا آئین تیار کیا۔ مشر محمد علی بوگرہ کے بعد انہیں وزیرِ اعظم بنایا گیا، لیکن آئین بنانے کے بعد وہ زیادہ عرصہ وزارت عظمیٰ کی مسند پر متمکن نہ رہے۔ کوئی مرکزی شخصیت نہ تھی دوسرے درجے کے سیاستدان آپس میں اس طرح لڑ رہے تھے، جس طرح اوڈنگ زیب کے بعد فتح میں منغل شہزادوں کی آپادھانی کا دور دورہ تھا۔ چوہدری محمد علی نے استعفیٰ دیا تو ان کی جگہ شہید سہروردی وزیرِ اعظم ہوئے۔ اسکندر مرزا نے پٹے ان سے نواب مشتاق احمد گورانی کو پنجاب کی گورنری سے سبکدوش کرایا پھر ری پبلکن پارٹی سے ساز باز کر کے انہیں نکال دیا۔ ان کی جگہ چندر پیکر آئے، لیکن کچھ عرصہ بعد وہ بھی چلے

گئے۔ ملک فیروز خان نون وزیر اعظم ہوئے، لیکن ان کا چراغ اسکندر مرزا نے مارشل لارہ کی ضرورت سے گل کر دیا اسکندر مرزا سازشی طبیعت کے سیاسی انسان تھے۔ انھیں کسی سپلو جین نہ تھا۔ انھوں نے ایوب خاں کی ملی جھگت سے مارشل لارہ نافذ کیا۔ پھر چند دن میں اپنی کے خلاف گٹھ جوڑ کرنے لگے۔ ابھی مارشل لارہ کا چوتھا ہفتہ شروع نہ ہوا تھا کہ ایوب خاں نے اسکندر مرزا کو جلا وطن کر دیا اور وہ زحمت سفر باندھ کر لندن روانہ ہو گئے، اُس کے بعد ملک پر جو بیہوشی وہ سب کے سامنے ہے۔ ایک طویل عرصے کے لیے مارشل لارہ نافذ ہو گیا۔ اس سے پہلے تقریباً ساڑھے پانچ سال کی مدت میں پانچ وزرائے اعظم مقرر ہو چکے تھے۔ ایوب خاں نے اپنی سوانحی کے چھٹے باب میں لکھا ہے کہ ایک لمبے عرصے سے کراچی میں سیاسی سوانگ کھیلا جا رہا تھا اور یہ قول اسکندر میرزا صورت حال ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔ ملک غلام محمد اس سے پہلے ۱۹۵۴ء ہی میں ایوب خاں کو ملک کی عثمان سوئٹزرلینڈ کے لیے تیار تھے اور وہ راضی نہ ہوتے تھے آخر ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو آٹھ بجے شب اسکندر مرزا نے ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کا آئین منسوخ کر ڈالا اور ملک کو مارشل لارہ کے حوالے کر دیا۔ یہ پاکستان کی تاریخ میں ایک دردناک المیہ کا آغاز تھا۔ اسکندر میرزا خود تو صدر ہی رہا، ایوب خاں کو مارشل لارہ کا چیف ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا، لیکن جیل منڈے نہ چڑھی۔ ابھی تین ہفتے نہ ہوئے تھے کہ اسکندر میرزا اپنے ہی مارشل لارہ کا شکار ہو گیا۔ ۲۷ اکتوبر کی شب کو تین جرنیلوں، جنرل اعظم، جنرل برکی اور جنرل شیخ نے اسکندر میرزا کو آدھی رات کے وقت جگا کر سکدوشی کے کاغذ پر دستخط لیے اور انگلستان روانہ کرنے سے پہلے چار پانچ روز کوٹر میں رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں اُس سے بعض راز ہائے درون پر وہ دریافت کئے گئے اور ان کی دولت کے خفیہ ذخائر سے متعلق پوچھا گیا پھر اس کے بعد لندن بھیج دیا۔

اسکندر مرزا کی صدارت سے علیحدگی اور ملک سے جلا وطنی لازم و ملزوم تھے، ایوب خاں نے اپنی سوانحی میں لکھا ہے کہ میں نے انہیں تنبیہ کی تھی کہ وہ عیاری اور چال بازی ختم کریں اور آگ سے نہ کھیں۔ لیکن میرزا نے مارشل لارہ نافذ کرنے کے فوراً بعد اپنا نامک شروع کیا۔ اس نے ایڈمیرلس کے ایروڈورٹس سے کہا کہ وہ جنرل بیہی، جنرل شیربادر اور جنرل حمید کو گرفتار کرے۔ رتبہ بھجوا۔ اُس نے شیربادر کو مطلع کر دیا اور آخری چریں اس کی عروسی اور جلا وطنی کا باعث بنیں۔ ایوب خاں لکھتے ہیں کہ اسکندر مرزا کی بیوی نامید اس سے لڑتی جھگڑتی اور بار بار کہتی کہ تم نے منت غلطی کی ہے۔ اب تمہیں چاہیے کہ ایوب خاں کو ختم کر دو، لیکن اسکندر مرزا خود غم ہو گیا۔ اس نے زندگی کے باقی دن لندن میں اس طرح گزارے کہ اس کے لیے کسپہری کا عالم تھا، راقم ۱۹۵۹ء کے وسط میں لندن گیا تو شفیق بٹل میں اسکندر مرزا اور ان کی اہلیہ سے ملاقات ہوئی۔ ایک رسمی علیک سلیک کے بعد

راقم نے میرزا سے کہا کہ آپ کو وہ دن یاد ہوگا جب نواب زادہ نصر اللہ خاں سے آپ نے سیاسی حالات پر برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس ملک کا علاج مارشل لا رہے اور جب تک مارشل لا نہیں لگے گا اس قوم کا فراج کبھی درست نہیں ہوگا۔ نواب زادہ صاحب نے جواباً کہا تھا کہ آپ غلط فہمی کا فکار ہیں۔ مارشل لا دو تین ہفتے ہی میں سب سے پہلے آپ کو شکار کریگا اور آپ کسی طرح بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکیں گے۔ اسکندر میرزا نے انکھوں میں چمک پیدا کرتے ہوئے کہا مجھے یاد ہے! وہ ہی ہوا جنہو نصر اللہ خاں نے کہا تھا۔

ایوب خاں نے مارشل لا کے بل پر پہلے نو ۱۹۵۹ء کے اواخر میں بنیادی جمہوریتوں کا تجربہ کیا اور ۱۱ جنوری ۱۹۶۰ء کو اس کے نتائج کا اعلان کر دیا کہ ۹ ہزار جمہور منتخب ہوتے ہیں ایوب خاں نے ان سے صدارتی ووٹ حاصل کیا۔ پھر اپنی صدارت کو قانونی شکل دیکر، ۱۲ فروری ۱۹۶۰ء کو رسمی حلف اٹھا یا، لیکن نظم و نسق مارشل لا ہی کا رہا۔ آخر آئینی کمیٹی کی رپورٹ پر یکم مارچ ۱۹۶۲ء کو نئے آئین کا اعلان کر دیا گیا جس میں ہر اختیار صدارت کی مرضی و منشاء کے تابع تھا اس آئین کے مطابق اپریل میں قومی اسمبلی اور مئی میں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے اس طرح اسمبلیوں کا ایک سانچہ ضرورہ بن گیا، لیکن اختیارات نہ ہونے کے برابر تھے اہم چیز پتی کہ ملک کی سیاسی پارٹیوں کو بحال نہ کیا گیا تھا۔ ایوب خاں نے ۱۰ مئی ۱۹۶۲ء کو اعلان کیا کہ نیشنل اسمبلی منسلک اور عمومی بحث کے بعد سیاسی پارٹیوں کے سارے مسئلہ پر نئے سرے سے غور کریگی۔ چنانچہ ۸ جون ۱۹۶۲ء کو راولپنڈی میں نو منتخب اسمبلی کا پہلا اجلاس ہوا تو اسی روز دو سال اٹھ ماہ کے بعد مارشل لا اٹھا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سیاسی پارٹیاں بحال ہو گئیں، لیکن ملک کے سیاسی حالات ہمہ وجہ اس حد تک قومی استحکام کے منافی تھے کہ ایوب خاں اپنی تمام تر مساعی کے باوجود ان پر قابو پانے سے معذور تھے۔ پاکستان کے عوام کا سیاسی شعور خلقی طور پر فوجی آمریت اور فوجی اقتدار کے خلاف تھا۔

عوام بنیادی طور پر شہری آزادیوں کے رسیا تھے۔ ایوب خاں نے مارشل لا کی طویل رات میں انہیں سلب رکھا۔ اسی کے بعد جو آئین دیا وہ بھی حقوق شہریت کے اعتبار سے مفلوج تھا اور لوگ اس سے ناخوش تھے، ایوب خاں خود بیوروکریٹ تھے انہوں نے بیوروکریسی کے ایک طائفہ پر عبور سے کیا اور ان کے مشوروں سے پوری قوم پر حکمرانی کرنے لگے۔ پاکستان سے عوام کا عشق ابھی قائم تھا۔ اس لیے ایسا کبھی کسی حادثے کا رونما ہونا ممکن نہ تھا، لیکن ایک طرف سی۔ آئی۔ اے نے اپنا جہنگ بزمین وام بچھنا شروع کیا۔ دوسری طرف پاکستان میں اجیر سرکاری انسر اور اُدھورے سیاستدان اس کی مٹھی میں آتے گئے، بالفاظ دیگر ملک اندرونی سیاست کی علی حرات سے محروم

ہو گیا اور عالمی طاقتوں کی استعماری شہ پر تو می سیاست کے روز و شب طلوع و غروب ہوتے۔ اس فضا ہی میں ۶ جنوری ۱۹۶۵ء کو صدارتی انتخاب ہوا اور ایوب خاں، اس جناح کے مقابلہ میں ۶۴ فیصد ووٹ لے کر کامیاب ہو گئے۔ لیکن ملکی عوام ایوب خاں کے ساتھ بالکل نہ تھے۔ ملک کے ۸ ہزار بی۔ ڈی ممبروں کے اس تناسب کو اقتدار کی ٹکسال میں خرید گیا تھا۔

اس پُر اسرار کہانی کی تفصیلات کا تذکرہ ایک دوسری کتاب کا موضوع ہے، لیکن ایوب خاں نے جب امریکہ کی عالمی سیاست کے مشوروں سے اختلاف کیا تو سی۔ آئی۔ اے کے ہاتھ لیے ہو گئے۔ اس نے ایکا کو سیاست دانوں کے علاوہ انتظامیہ میں سے کچھ لوگ تلاش کئے۔ انہیں ڈھب پر لا کر سائش کی چوسڑ بچائی۔ صوبے زیادہ اعتماد دیا بیانی امت پر کیا گیا۔ سر فخر اللہ خاں کی معرفت ربوہ کے عمرو عیار میرزا بشیر الدین کو ہاتھ میں لیکر قادیانی امت کو استمال کرنے کا فیصلہ ہو گیا۔ راقم کو یہ شرف حاصل ہے کہ قادیانی ادکاروں کا نام لے کر راقم نے سب سے پہلے سنگین حفاظتی کیچرہ کشائی کی، اور اس انکشاف کو ایک تحریک بنادیا کہ پاکستان میں قادیانی آفیسر مختلف کیدی آسامیوں تکمبہ پہنچ کر عالمی استعمار کے لیے کیا فرائض انجام دیتے ہیں؟ ایوب خاں کا صدارتی انتخاب ختم ہوا تو اس کے چند ماہ بعد کشمیر کی جنگ، اور اس کے جواب میں ہندوستان کی پاکستان پر بھڑکائی، استعماری سیاست کا کرشمہ تھا۔ راقم نے اپنے ایک پمفلٹ ”عجمی اسرائیل“ میں اس کا انکشاف کیا۔ اپنی بہت سی تقریروں میں ذکر کیا کہ سر فخر اللہ خاں نے امریکہ سے ڈاکٹر جاوید اتبال کی معرفت، صدر ایوب کے نام کیا پیغام بھیجا تھا، جنرل اختر حسین قادیانی نے کشمیر میں جنگ کا محاذ کھولنے کے لیے کیا کیا جتن کئے، اس کی روداد نواب کالا باغ نے خود راقم سے بیان کی نواب صاحب نے راقم کو وہ دستی اشتہار بھی دکھایا جو قادیانی امت نے ربوہ کے حسب ہدایت کشمیر میں تقسیم کیا تھا کہ ”مسیح موعود“ کی پیشگوئی کے مطابق وادی کشمیر کی فتح بائی اس کی جماعت کے ہاتھوں ہوگی۔ وہ ایک مسیح کا مدفن ہے اور دوسرے مسیح کی صدارت کا نشان ہوگا۔ نواب کالا باغ رادی تھے کہ قادیانی امت نے ۱۹۶۵ء کی جنگ کا ڈول استعماری ہدایت پر ڈالا تھا۔ خداوند تبارک و تعالیٰ نے ہمیں مستون و محفوظ رکھا۔

اس جنگ کے بعد قادیانی امت نے استعماری معاہدوں کے تحت پاکستان میں اپنے منصوبوں کو پروان چڑھانے کی مہم نیز کردی اور کھل کے حکومت کی شہ رگ کے شعبوں پر قبضہ کرنے کا آغاز کیا۔ مسٹر ایم۔ ایم احمد نے اپنے واداکے بیرونی کی اقتصادی ساکھ کو مضبوط کرنے کے لیے قادیانیوں صنعت کار بنانا شروع کیا۔ میرزا بشیر الدین محمود نے جماعتی روپے کے بل پر ملکی بنکوں میں اپنے مریدیوں کے لیے بڑی بڑی ملازمتوں کا انتظام کر

بعض انشورنس کمپنیوں میں امت کے افراد کو بگڑا دلائی۔ ملک کے اکثر روزناموں کو بے لطافت ایل میل مرعوب کیا کیونکہ قادیانی امت کے متعلق کوئی سی منفی خبر نہ دیں اور اگر ایسی کوئی خبر ملے تو اس کو مکمل استحکام کے خلاف قرار دیکر مسترد کر دیا جائے ان لوگوں کے خلاف پراپیگنڈا کی نیور کھوائی جو قادیانیت کے حریف اور اسلام کے مخلص تھے۔ انسروں کے دیندار عناصر کو ایوب خاں سے قریب نہ ہونے دیا اور ان لوگوں کو ان سے قریب رکھا جو قادیانیت کے احتساب کو ملک و قوم کی سالمیت کے خلاف سمجھتے اور اسی مفروضہ پر زندگی گزارتے تھے۔ میرزا بشیر الدین نے ان انسروں کے لیے کئی طرح کی رشوتوں کا انتظام کیا جس میں حیم کالس اور زر دہال کا نذرانہ شامل تھے۔ اسی دوران میرزا قادیانی امت نے عرب ریاستوں کی مختلف ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اپنے آدمی بھجوانا شروع کئے جو میرزا بشیر الدین مسعود اور مرظفر اللہ خاں کی ہدایت کے مطابق اسرائیل کو خفیہ معلومات ہم پہنچاتے اور عالمی استعمار کے فرائض سے عہدہ برآ ہوتے تھے۔

میرزا قادیانیوں نے ملکی نشر و اشاعت کے ذرائع کو بھی اپنے تصرفات میں ڈھال لیا۔ سب سے خطرناک چیز ملکی فوج میں میرزا قادیانی امت کا جوق در جوق بھرتی ہونا اور بڑے بڑے عسکری عہدے حاصل کرنا تھا۔ روزنامہ "الفضل" فوجی بھرتی کے وہ تمام اشتہارات چھاپتا جس بھرتی کے انپارچ قادیانی انسر ہوتے اور وہ انگوٹھی کے نشان پر قادیانی عقیدہ نوجوانوں کا انتخاب کرتے۔ غرض قادیانی امت بڑی فوج میں لگتا رہتا بھرتی ہوتی گئی اور اس طرح ایک ایسا CELL قائم کیا جو میرزا قادیانی جرنیوں کی معرفت ریلوے کے ماتحت تھا اور استعماری ضرورت کے وقت نفقہ کالم کا کام دے سکتا تھا، لیکن جو چیز انتہائی خطرناک تھی وہ فوج کے بنیادی عہدوں اور جنگ کے اہم محاذوں پر قادیانی جرنیوں کا تقرر تھا۔ اسی طرح بحریہ میں ریلوے کو ضروری کوائف سے مطلع رکھنے کے لیے قادیانی موجود تھے لیکن اصل خطرہ فضائیہ سے تھا کہ اس پر قادیانیوں نے بھرپور قبضہ کیا اور پاکستانی فضائیہ کے تقریباً سبھی اسٹیشنوں کے انپارچ ہو گئے۔ یہ ایک خطرناک چیز تھی اس کا تجربہ سعودی عرب کے کوہ چکا تھا کہ اسرائیل سے جنگ کے دوران اس کے جہاز کیونکر ناکارہ ہو گئے اور جب کرنل ناصر نے دس دس سے دس گنا آغاز کیا تو سعودی عرب کے طیاروں کی ایک ٹکڑی اڑ کے قاہرہ پہنچ گئی۔ ایر مارشل نور خاں اور ایر مارشل اصغر خاں کے بعد قادیانی ہوابازوں اور مختلف زنجیر کے میرزا قادیانی افسروں کی طاقت کو اور وسعت ہوئی۔ عجب نہ تھا کہ ایوب خاں کے زمانہ ہی میں مارشل ایس۔ ایم۔ اختر جو ایک مشہور قادیانی تھے۔ ایر فورس کے سربراہ ہو جاتے لیکن ان کی خدمات پی۔ آئی۔ اے کو منتقل کر دی گئیں۔ انہوں نے وہاں چیف کی حیثیت میں قادیانی امت کی اس طسرح سرپرستی کی کہ اندر خانہ

ایک پل شروع ہو گئی۔ راقم نے صدر ایوب کو ذاتی خط لکھا چٹان میں مقام تحریر کیا، بعض علماء کو متوجہ کیا، ہمیں تحفظ ختم نہوت کو آگاہ کیا۔ اس اجتماعی تنگ و دو کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایوب خاں نے اپنے صدارتی وجود کو قائم رکھنے کے لیے مارشل ایس۔ ایم۔ اختر کو سبکدوش کر دیا، لیکن ایئر فورس کی اختیاری اکثریت پر تاویانی امت ہی کا تصرف رہا۔ اس کا سب سے افسوسناک پہلو یہ تھا کہ اسرائیل سے شکست کھانے کے بعد عرب ریاستوں نے پاکستان سے فضائیہ کا عملہ طلب کیا تو سرکاری طور پر جوگ ایئر فورس کی طرف سے بھیجے گئے وہ زیادہ تر تاویانی تھے یا پھر وہ مسلمان تھے جو تاویانی محرکات کو چکے تھے اور فوج کے غیر تاویانی افسروں کو شکاریارام کرنے کے لیے میرزائی امت نے اپنی دوشیزاؤں کو ان نکاح میں دیکر حسب مطلب نتائج پیدا کر لئے تھے۔ ان ناموافق حالات میں بھی تاویانیت کا ماسک ہمیشہ جاری رہا۔ علماء نے منبر و محراب پر اپنے دغظ جاری رکھے اور مختلف دینی احزاب کے مجتہدوں نے اپنے احتسابی قلم کو رواں دواں رکھا۔ سب سے بڑا فائدہ جو اس تحریک راست اقدام سے پہنچا، وہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کا باہمی اتحاد تھا۔ قبیلہ جوہریوں و دیوبندی نزاع کے نام سے لایحل تھا اس تحریک کی بدولت مرد ہو گیا۔ اس طرح اہل حدیث و غیر اہل حدیث، شیعہ و سنی اور دیوبندی و بریلوی کے تنازعوں کی چنگاریاں بجھ گئیں اس کے حقیقی محرک سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھے۔ آپ نے مولانا سید ابوالحسنات قادری کو ساتھ لے کر مجلس عمل کی قیادت سونپ کر ایک تنگنہ زمین نیار کی، سید مظفر علی شمس شیعہ نوجوانوں کے لیڈر تھے اور سن شور سے احرار کا ذہن رکھتے تھے۔ شاہ جی نے ان کی وساطت سے مشہور شیعہ عالم حافظ کفایت حسین کو ساتھ لے کر تاویانیت کے حصار پر وہ ضربیں لگائیں کہ وحدت اسلامی کی بنیاد کا نقشہ کھنچ گیا۔ جب ۱۹۵۳ء میں تحریک راست اقدام چلی تو راقم نے حسین شہید سہروردی کو مسئلہ کے سرچو سے آگاہ کیا۔ میرزا غلام احمد کے دعاوی کی روداد سنائی۔ راقم نے مرزا غلام احمد اور مرزا بشیر الدین کی تحریروں کا ہارمیش کیا۔ سہروردی نے ایک ایک چیز کا مطالعہ کیا اور کہا کہ اس قسم کا شخص اگر مشرق پاکستان میں ہوتا تو بنگال کا مسلمان پہلے ہی دن اس کو ہمیشہ کی نیند سلا دیتا اور اس کے پیروکار مرجعائی ہوتے شاخوں کی طرح کاٹ دیئے جاتے۔ ہجرت ہے کہ پنجاب نے اس کو قبول کیا اور مسلمانوں نے اپنی زمین میں اس کو پیچھے دیا اس طائفہ کا وجود مسلمانوں کے لیے ناسور ہے۔ مشر سہروردی نے اس سلسلہ میں خواجہ ناظم الدین کو نل سکیپ سائز کے تیس صفحوں کا ایک طویل خط لکھا جس میں تحریک راست اقدام کی حمایت کے علاوہ میرزا غلام احمد کی امت کو خارج اسلام قرار دینے کے مطالبہ کی پرزور حمایت کی، اس خوبصورت اور مدلل خط کی ایک نقل اختر کو عنایت کی۔ وہ خط راقم کے پاس منیر انکوائری کمیٹی کے آغاز تک محفوظ رہا۔ پھر مولانا سید محمد داؤد غزنوی

کیٹس کو دکھانے کے لیے لے گئے۔ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ خط کہاں رو گیا۔ کیونکہ وہ خط کسی مرحلے میں منیر انکوائری کمیٹی کے سامنے پیش نہ کیا گیا۔ کئی سال ہوئے راقم کو اس خط کی ایک دوسری نقل خواجہ عبدالرحیم سے ملی، لیکن اس کے ابتدائی تین صفحے اور آخری دو صفحے غائب تھے۔ شہید سہروردی نے عوامی لیگ کی طرف سے تحریک راست اقدام پر صاف کیا۔ اور لاہور سے باہر جہاں کہیں جلسوں کا انعقاد ممکن تھا، اس دینی مسئلہ کی حمایت اور سرکاری تشدد کی مذمت میں زبردست تقریریں کیں۔ راجہ حسن اختر عوامی لیگ کے نمائندہ کی حیثیت سے مسبد وزیر خاں کے جلسہ میں شامل ہونے کے لیے جا رہے تھے کہ سید فردوس شاہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس مشتعل ہجوم کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔ راجہ صاحب کو پولیس نے روک کر واپس کر دیا۔ ادھر مارشل لا نافذ ہو گیا۔ واضح رہے کہ مسبد وزیر خاں کے مورچہ کی پاداش میں مولانا عبدالستار خاں نیازی، جو بریلوی مکتب فکر کے جید و متبحر نوجوان تھے، مارشل لا رک عدالت سے پھانسی کے مستحق گردانے گئے انہیں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے ساتھ ہی سزائے موت سنائی گئی۔ پھر انہی کے ساتھ عسقرئید میں تبدیل کر دی گئی۔ انہوں نے اپنی رہائی کے بعد ختم نبوت کے تقریری محاذ کو ٹھنڈا نہ ہونے دیا۔ اس سلسلہ میں تحریک مسند سے متعلق دو باتیں کہانیے لکھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا عبدالستار نیازی عشق رسالت میں قرن اول کے مسلمانوں کا مزاج رکھتے ہیں۔ انہوں نے باہر آتے ہی میرزائی امت کو دیکارنا شروع کیا۔ ایوب خاں کے دور میں اس کی حکومت کو اڑے ہاتھوں لیا، ان مسلمانوں کو انیکلو مسلمان کا لقب دیا جو قادیانی امت کو مسلمانوں میں شمار کرتے اور عقیدہ ختم نبوت کی اساس سے ناواقف تھے۔ مولانا عبدالستار نیازی اس دوران میں دو چار دفعہ پکڑے گئے۔ حتیٰ کہ ایوبی غنڈوں اور قادیانی اجیروں نے تنہا پاکران پر حملہ بھی کیا۔ میرزائیوں کے حوصلے اتنے بڑھ چکے تھے کہ انہوں نے علامہ کا استغاثہ اپنا شعار بنالیا۔ اور ایوب خاں کو بھی اسی راستہ پر لگالیا۔ روزنامہ الفضل کے ایک ہم زلف ہفتہ وار نے علامہ اقبال کے خلاف ناز خانی سلسلہ شروع کیا۔ میرزائی امت کا حوصلہ تھا کہ اس نے پاکستان میں علامہ کے خلاف بدزبانی کا آغاز کیا اور اقبال سے اس مقابلے یا مقابلوں کا انتقام لینا چاہا جو ان کے قلم سے قادیانیت کے تابوت کی میخ تھے، علامہ اقبال کی فکر کے نمک خواروں میں سے کسی کو جواب دینے یا احتجاج کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ تب قادیانی روح کا یہ حال تھا کہ پروفیسر حمید احمد خاں داتس چانسلر جناب یونیورسٹی نے منہ اقبال کا بیڈ گورنمنٹ کالج کے مشہور قادیانی پروفیسر قاضی محمد اسلم کو مقرر کیا اور کسی احتجاج کی پروا نہ کی۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے مجلس احرار اسلام کے شعبہ تبلیغ کو مجلس تحفظ ختم نبوت کی شکل دیکر مولانا محمد علی جالندھری کو پھاناظم اعلیٰ مقرر کیا اور حسب ذیل علماء اس کے بنیادی ارکان تھے۔

(۱) قاضی احسان احمد شجاع آبادی (۲) مولانا لال حسین اختر (۳) مولانا محمد حیات فاتح قادیاں (۴) شریف محمد جہانگیری (۵) مولانا تاج محمد (۶) مولانا عبدالرحمن میانوی (۷) مولانا شیخ احمد بوریوالہ (۸) مولانا سعید احمد مظفر گڑھ (۹) مولانا محمد شریف بہاولپوری (۱۰) مولانا نذیر حسین پٹنہ قائل سندھ (۱۱) مولانا علاء الدین ڈیرہ اسماعیل خاں۔

ان علماء نے قادیانیت کو مذہبی اقتدار سے کیسے نکلنے نہ دیا۔ اپنا تور روشن رکھا۔ تحریک راست اقدام کے بعد مجلس تحفظ ختم نبوت کا وجود انعام الہی تھا۔ شاہ جی کی رحلت کے بعد کچھ عرصہ کے لیے مولانا محمد علی جانگیری امیر ہو گئے۔ پھر کام کی وسعت کے پیش نظر مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی کو امیر مقرر کیا گیا۔ قاضی صاحب، حضرت شاہ صاحب کے شاگرد خاص اور قادیانی مسئلہ میں پیشبر بہنہ تھے۔ آپ نے زندگی بھر قادیانیت کا مقابلہ کیا اور اس طرح شکستیں دیں کہ میرزا غلام احمد کے جانشین ان کے نام سے کانپتے تھے۔ قاضی صاحب قادیانیت کے سلسلہ میں انسائیکلو پیڈیا تھے۔ اپنے ساتھ قادیانی لٹریچر کا بستہ رکھتے، وزیر اعظم، وزیروں، گورنروں اور گورنروں کے ہاں پہنچ جاتے۔ انہیں میرزا غلام احمد کی تعنیفات میں سے پوچھ تحریریں اور بے نقط گایاں دکھاتے، وہ کانوں پر ہاتھ رکھتے اور کہتے کہ اس فاجر احمق نے اپنے نبی ہونے کا اعلان کیا تھا۔ قاضی صاحب بحر طراز خطیب تھے۔ آپ کا ۱۹۶۷ء میں انتقال ہو گیا۔ مولانا محمد علی شروع دن سے ناظم اعلیٰ تھے۔ قاضی صاحب کی موت کے بعد امیر مقرر کیے گئے۔ مولانا لال حسین اختر ناظم اعلیٰ بنے۔ مولانا محمد علی ایک متدین عالم دین اور ایک معتدل خطیب تھے۔ ہر بات تول ناپ کر کرتے۔ آپ نے دار البتغین قائم کر کے قادیانیت کے لیے ایک ایسا شیکھ تیار کیا کہ تمام اضلاع میں مجلس تحفظ ختم نبوت کے دفتر قائم ہو گئے۔ کوئی پچاس سے زائد کل وقتی مقرر کیے جو مرکزی دفتر سے معمولی مشاہرہ لے کر اپنے فرائض انجام دیتے۔ اس نظام نے قادیانیت کی سرکوبی نہایت احسن طریق پر کی۔ دار البتغین نے سینکڑوں مبلغ و مناظر تیار کیے، انہوں نے پاکستان ہی میں قادیانیت کا گھراؤ نہ کیا بلکہ ملک سے باہر افریقی ممالک اور عرب ریاستوں میں جلتے رہے۔ دار البتغین میں ہندوستان، برما، بھارت، بنگلہ دیش، فیلیپائن، آسٹریلیا اور افریقی ممالک کے علماء نے اگر ردِ میرزاہیت کی تعلیم حاصل کی۔ پھر اپنے ممالک میں واپس جا کر قادیانیت کا تعاقب کیا۔ یہ سب مولانا محمد علی جانگیری کی شبانہ روز ساعی کا اعجاز تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ سائیدایزدی کے بل پر آپ نے مجلس تحفظ ختم نبوت کو ایک طاقتور تنظیم بنا دیا۔ اس کا مرکزی دفتر لندن میں خرید لیا گیا۔ جوابی لٹریچر تیار کرتے رہے اور ان تمام مقدمات کے اخراجات مجلس کے ذمہ ہوتے جو بتغین کے

عبد الرشید (۱۸)، مولانا بشیر احمد مظفر گڑھ (۱۹)، مولانا صوفی اللہ وسایا، ڈیرہ غازی خان (۲۰)، مولانا محمد علی سمندری (۲۱)، مولانا سید مختار الحسن (۲۲)، مولانا عبدالرؤف (۲۳)، مولانا کریم بخش، لاہور (۲۴)، مولانا فیضان الدین آزاد، گوجرانوالہ (۲۵)، مولانا محمد یوسف لدھیانوی (۲۶)، مولانا سید حبیب اللہ (۲۷)، مولانا محمد خاں سیالکوٹ (۲۸)، مولانا خدا بخش، رتھہ (۲۹)، مولانا محمد شریف احرار، جینیوٹ (۳۰)، مولانا عبدالرحمن یعقوب دادا، کراچی (۳۱)، مولانا غلام حیدر اسلام آباد (۳۲)، حافظ غلام حبیب (۳۳)، حافظ عزیز الرحمن خورشید، سرگودھا۔

جیسا کہ عرض کیا مجلس تحفظ ختم نبوت و راسل برصغیر کی آزادی سے پہلے مجلس احرار اسلام کا شعبہ تبلیغ تھا۔ اُس وقت کے تمام جید علماء قادیانی فتنے کے تعاقب کی مہم میں اس کے مہنوا تھے۔ تیسرے عطاء اللہ شاہ بخاری کی ہدایت کے مطابق علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ نے احرار کو مشورہ دیا تھا کہ اپنی جماعت میں ایک غیر سیاسی شعبہ تبلیغ اس غرض سے قائم کریں اچھا بیچ چوہدری افضل حق، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، مولانا مظفر علی اظہر، ماسٹر تاج الدین انصاری اور مولانا محمد حیات اس شعبے کی فائدہ کے ارکان مقرر ہوئے۔ میاں قمر الدین رئیس اچھرہ سرپرست قرار پائے۔ انہوں نے اس غرض سے بے شمار روپیہ صرف کیا۔ سید چراغ شاہ قادیانی میں معاون خصوصی رہے۔ مرزا بشیر الدین محمود نے احرار کے خلاف کئی دفعہ دائرے سے دائرہ لایا۔ سر مظفر اللہ خاں اپنی والدہ کو لے کر دائرے کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُن سے فریاد کی، لیکن قادیانی میں احرار کے پاؤں اس مضبوطی سے جم چکے تھے کہ محض قادیانی امت کی خوشنودی کے لیے کوئی جواز پیدا کیے بغیر احرار کو وہاں سے نکالنا آسان نہ تھا۔ احرار نے قادیانی میں شعبہ تبلیغ کے لیے زرعی جائیداد خرید کی۔ جماعت کا عیلتی دفتر بنایا۔ اس کے علاوہ جامع مسجد، مدرسہ اور دارالتبلیغ قائم کیے۔ اس شعبے ہی کے زیر انتظام قادیانی میں وہ تاریخی کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں ملک کے نامور علماء شریک ہوئے اور پنجاب کے لاکھوں فذیان رسالت نے کانفرنس میں شامل ہو کر مزائیت کو اس طرح ہر سال کیا کہ کئی ماہ تک مرزا بشیر الدین محمود اپنے مختلف بیانون میں ٹوسے بہاتے رہے۔ حقیقت یہ ہے مجلس تحفظ ختم نبوت کے عیلتی القدر زعماء نے پاکستان بن جانے کے بعد من حیث الجماعت قادیانیت کے عوام کا نوٹس لیا۔ سر مظفر اللہ کی وزارت خارجہ کے دوائر میں میرزا زیت نواز سرگرمیوں کا تعاقب کیا۔ غیر ملکی سفارت خانوں میں میرزا بشیر الدین کے استعماری ایجنٹوں کی نشاندہی کی اور جس عیاری سے پاکستان میں متروکہ جائیداد پر قادیانی قبضہ جاری ہے تھے۔ اس کا محاسبہ کیا۔ اگر احرار زعماء اس وقت آواز نہ اٹھاتے، تو مظفر اللہ خاں کے بھائی عبداللہ خاں جو وزارت بحالیات میں ایک برسے عہدے پر فائز تھے، اپنے ہم عقیدہ قادیانیوں کو میرزا بشیر الدین محمود کی ہدایت پر کروڑ ہا روپے کا

کو تحریک کا دوسرا مرکز بنادیا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور مولانا محمد علیؒ جانِ ہری کے بعد ان کی روایتوں اور حکایتوں کے وارث ہو گئے۔ وہ قادیانیت کے سلسلے میں کسی عنوان سے کوئی سامنا ہمارا تصور نہیں رکھتے۔ اس کا اعتراف نہ کرنا ظلم ہوگا کہ آپؒ نے ختم نبوت کی تحریک کو پروان چڑھانے میں اپنی تمام زندگی صرف کی ہے۔ اس سلسلہ میں آپ کا وجود نقطہ اتحاد ہے۔ آپ کے علاوہ جن لوگوں نے تحریک کا چراغ مدہم نہ ہونے دیا اور سلسلے کو آبِ دوانہ متیا کرتے، ان میں سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے تین بیٹے سید ابوذر بخاری، سید عطاء الرحمن اور سید عطاء المبینؒ جتھک نوجوان ہیں۔ انہوں نے کڑے سے کڑے وقت میں اپنے باپ کی معجز بیانیوں کو زندہ رکھا۔ مولانا ابوالحسنات قادریؒ کی بدولت بریلوی علماء کا طبقہ قادیانیت کے محاذ پر ڈٹ گیا اور اپنے مسلسل غفلتوں میں غامتِ اسیلین کے ذہنی احتساب کو مستحکم کیا۔ آپ کے فرزند سید غیث احمد قادریؒ نے ۱۹۵۳ء کی تحریک میں عرقید کی مزا پائی۔ پھر جب رہا ہوئے تو اس دن سے قادیانیت کا احتساب اپنے بیان و قلم میں شامل کر لیا۔ آپ کے پیچھے علامہ سید محمد احمد رضوی خلیفۃ الرشید مولانا ابوالبرکات قادریؒ نے بھی قادیانیت کے خلاف اپنی قلم و زبان کی روانی و جولانی قائم رکھی۔ آپ اس سلسلے کی آخری تحریک میں مجلسِ عمل کے جنرل سیکرٹری رہے۔ ایک ادیب و خطیب ہی نہیں بلکہ عالم و محدث بھی ہیں۔ مولانا عبید اللہ انور نے اپنے مایہ ناز والدہ حضرت مولینا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصیت کو ”خدام الدین“ میں برقرار رکھا۔ اور ان کی بے مثال بلہاکی ہی سے قادیانیت کا محاسبہ کرتے رہے۔ سید مظفر علی شمس نے اپنے ہفتہ وار ”شہید“ میں اپنے قلم سے ذوالفقار کا کام لیا۔ ادھر کوئٹہ سے نلئے بلوچستان، شائع ہوتا تھا۔ اس کے نوجوان ایڈیٹر سید اقبال نے پورے صوبے میں قادیانیت کو تہ دلا کر دیا۔ جب بلوچستان کے عوام کو معلوم ہوا کہ میرزا غلام احمد کے پیروں کی دینی ساخت اور سیاسی فطرت ہر رعایت سے محروم ہے تو انہوں نے میرزا نیت کو فرٹ سنڈمین اور قلات ڈویژن سے نکال دیا۔ اس احتساب و انجام سے گھبرا کر میرزا قیوں نے کوئٹہ میں پناہ لی، لیکن ان میں کوئی بلوچ نہ تھا۔ اکثر پنجاب سے جا کر آباد ہوئے تھے، جن میں دو چار وکلاء تھے اور چند ایک کاروباری۔ باقی چار پانچ درجن مختلف شعبوں کے سرکاری ملازم۔ کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں کی اندر خانہ سازش کے باعث مولوی شمس الدین ڈپٹی سیکر بلوچستان اسمبلی شہید کیے گئے اور یہ فورٹ سنڈمین سے قادیانیت کے اخراج کا انتقام تھا۔ مولوی شمس الدین کے خونِ ناحق کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرزا نیت کے لیے بلوچستان میں رہنا ناممکن ہو گیا۔

جن ماہناموں نے میرزا نیت کے خلاف مسلسل جہاد کیا، ان کا ذکر اوپر آچکا ہے، ان سب کی ادارت بڑے بڑے فضلا کے ہاتھ میں رہی۔ ان کے مضامین علمی اعتبار سے اس پائے کے تھے کہ میرزا نیت کے پاس کوئی

جواب نہ تھا۔

علامہ احسان المظاہر مدینہ یونیورسٹی سے فراغت پا کر لاہور آ گئے، تو آپ کے پیر و جماعت اہل حدیث نے اپنی مہربانی مسجد چنیا نوالی لاہور کی امامت کی۔ علامہ صاحب ایک فاضل اہل نوجوان ہیں۔ انہیں عربی زبان میں قدرت نامہ حاصل ہے۔ آپ نے جماعت اہل حدیث کے ہفتہ دار اخبار کی ایڈیٹری کے فرائض انجام دینا شروع کیے۔ اس کے بعد اپنا ماہنامہ ترجمان الحدیث نکالا۔ اور اس بڑی طرح قادیانیت کی خبر لی کہ اس کے ایوانوں میں کھلبلی مچ گئی۔ علامہ صاحب ایک شعلہ بیان خطیب، معجز رقم ادیب، بالغ نظر صفا اور بہت سی زبانوں میں اتار دہونے کے علاوہ دُور رس نگاہ کے عالم تھے۔ آپ نے قادیانیت کے متعلق پہلے اردو میں ایک مبسوط کتاب لکھی، پھر اس کا انگریزی ایڈیشن شائع کیا۔ آخر رابطہ اسلامی کی خواہش پر عربی زبان میں ایک ضخیم کتاب تیار کی، جس کو شاہ فیصل شہید نے عید پسند فرمایا اور تمام عرب ریاستوں میں اس کے بے شمار نسخے تقسیم کرائے۔ علامہ صاحب فن خطابت کی نزاکتوں سے کما حقہ واقف ہیں اور ایک بلند پایہ خطیب ہیں۔ اس سلسلے میں ایک چیز کا ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا۔ کہ بعض ملائق نے میرزا نیت کے سلسلہ میں اس قسم کے مدلل فیصلے کیے کہ میرزا نیت مسلمانوں کے دینی حصار میں پناہ لینے کے قابل نہ رہی۔ مثلاً مقدمہ بہاولپور میں جس محمد اکبر کا فیصلہ تاریخی سچائی کی علامت ہو گیا۔ اس مقدمے میں علامہ نور شاہ مسلمانوں کی طرف سے پیش ہوتے رہے۔ جب تک مقدمہ زیر سماعت رہا حضرت قبلہ غلام محمد دین پوری قدس سرہ ہر پیشی پر خانپور سے بہاولپور آتے۔ دوسرا فیصلہ جس نے میرزا نیت کے مابوت میں آخری کیل ٹھونکی اور تمام میرزائی بدلاؤ ٹھے وہ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے مراجعہ میں مسٹر جی۔ ڈی کھوسلہ سیشن جج گورداسپور کا فیصلہ تھا۔ تیسرا فیصلہ ایک سیشن جج مسٹر محمد اکبر فاروقی نے کیا، جس میں ایک مسلمان عورت کے رشتہ دار نکاح کی درخواست منظور کرتے ہوئے قادیانیوں کو دائرۃ اسلام سے خارج قرار دیا۔ چوتھا فیصلہ ایک سینئر سول جج مسٹر محمد رفیق گریج جیس آباد کا تھا۔ آخری دو فیصلے قیام پاکستان کے بعد ہوئے اور گریج کا فیصلہ ان دنوں صادر ہوا، جب میرزائی پیملز پارٹی کے دامن میں پناہ لیکر بزمِ خوشیش ملک میں حکمرانی کے خواب دیکھ رہے تھے۔

میرزائیوں نے ملک غلام محمد کے زمانہ سے لے کر یہی خاں کے دور تک اپنی فصل کو خراہ کرنے کے لیے جو کچھ کیا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ :

(۱) حکومت کے بنیادی محکموں مثلاً فوج، مالیات، نشریات وغیرہ میں یہ لطافت الحیل قدم جمانا شروع کیے۔

(۲) استعماری سیاست کی ہر نوعی خدمات بجالانے کا عمل تیز کیا۔

(۳) عرب ریاستوں میں اسرائیل کے معتمد اہلکار ہو کر خفیہ خدمات کا بیڑا اٹھایا۔

(۴) پاکستان کے علاقائی بٹوارے کی آپہنشی میں، ہر دور کی حکمرانوں کے منفی کردار کو بالا کیا۔

(۵) سرحد، بلوچستان، سندھ اور مشرقی پاکستان کی پنجاب سے ناراضی کو آب و دانہ مٹیا کیا۔

(۶) جن محبوبوں کو مرکزی حکومت سے شکایتیں رہیں، ان محبوبوں میں فوجی کارروائی کا جزو دلائل تک ہو کر انہیں

پاکستان کی تقسیم کے لیے تیار کیا۔

(۷) میرزا بشیر الدین کی ہدایت کے مطابق قادیانی دہشتیزاؤں نے بڑے بڑے مسلمان افسروں کی زوجیت

میں آکر جماعت کے خلافتی منصوبوں کی نگہداشت کی۔

(۸) اسٹس روپیہ کا ایک حصہ، پاکستان کے غیر قادیانی حکام، سیکسٹن اور جرائد کے عملہ میں تقسیم کیا جو خلیفہ

ربوہ اور اس کے یاران شاطر کو سی۔ آئی۔ اے اور اسرائیل سے ملا۔

(۹) مشرقی پاکستان کے تقسیمی ذہن کو جوان کیا۔

(۱۰) اپنے نوجوانوں کو اسلامی تحریکوں اور اسلامی تنظیموں کے برعکس لادین تحریکوں اور مادی تنظیموں میں داخل

کیا۔ ان نوجوانوں نے ایشیا پر مشتمل رہنماؤں کے خلاف عوام کو گمراہ کیا اور مظاہرے و مجاہدے برپا کرائے۔

(۱۱) ہر اقتدار کی پرستش کی، لیکن جب اسپر عالم نزع طاری ہوا تو اس کو دغا دیکر آئندہ اقتدار کی چوکت

پر چلے گئے اور خود سپردگی کا انداز اختیار کیا۔

(۱۲) جنرل انتخابات ۱۹۷۱ء میں تمام اسلامی جماعتوں کے خلاف لادین عناصر کا ہاتھ بٹایا۔ اور

بیلینڈ پارٹی کی پناہ لے کر مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کا دامن ہتھاما۔ پاکستان میں شوکت اسلام کے جلسوں سے خوفزدہ

ہو کر اسرائیل سے روپیہ حاصل کیا اور اس روپیہ سے اسلام دوستوں کے خلاف ہنگامے برپا کرانے۔ اس زمانہ

میں عزت دشمن اور اسلام کش مظاہروں کی دشنام طرازی کا طائفہ، قادیانی نوجوانوں پر مشتمل تھا۔ اس کی

قیادت ربوہ کے فرستادہ افراد کرتے تھے۔

(۱۳) جب بنگلہ دیش بن گیا، تو اپنے مکانوں پر چیراغاں کیا، شیرینی باٹی اور لاہور و ربوہ میں

رقص کیا۔

(۱۴) مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے برسر اقتدار آتے ہی دو کام شروع کیے۔ اول ان کی فراست کو قریب

دیکر اپنا راستہ ہموار کرنا چاہا، تاکہ استعماری طاقتیں انہیں پاکستان کا دماغ سمجھیں اور ان کی قیمت

بڑھتی رہی اور اس سلسلہ میں ان کے لیے عجمی اسرائیل قائم ہو جائے۔ دوم جس کے لیے وہ کوشاں تھے، وہ پیلنچ پاپٹی کے ہاتھوں وایاں بازو کی اسلامی شخصیتوں اور فکری تحریکیں کا استیصال تھا، لیکن صورتِ حال اس طرح پیلٹی کہ میرزا نیت کا ”مسیحونی چراغ“ جو اسلام کے طاق پر ”روشن“ تھا، ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا۔



چٹان نے تحریک پیدا کی

تحریک راست اقدام ۱۹۵۳ء کے اختتام سے یکسر مارشل لا ۱۹۵۸ء کے آغاز تک میرزائی اپنے سیاسی خاکوں میں رنگ بھرتے اور معاشی منصوبوں کو پروان چڑھاتے رہے۔ اس سلسلہ میں حکومت کی ادنیٰ بدلتی صورت حال کا نقشہ آچکا ہے۔ میرزائیوں نے ہر دور کے مطابق اپنی چال قائم رکھی، ایوب خاں کا طویل دور ان کے لئے تحفظ کا موجب ہو گیا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں حوام کا پانسہ ٹٹ کر ہندوستان کی طرف ہو گیا۔ وہ اندرونی دشمن کو بھول گئے۔ ان کی نگاہیں بیرون دشمن پر جم گئیں۔ میرزائی مطمئن تھے کہ ایوب خاں کا دور ان کا معاون و مددگار ہے اور حکومت کی شطرنج پر انہی کے مہرے چل رہے ہیں۔ انہوں نے خواص کی اکثریت میں پھسے سے ایک ایسا ذہن پیدا کیا کہ ان کے خلاف جو کچھ کہا جاتا وہ ملاؤں کا روایتی خروش ہے۔ میرزائی خود چاہتے تھے کہ علماء ان پر مذہبی تنقید کرتے رہیں اور وہ حکومت سے ہم آغوش ہو کر اپنے متین منظم کرتے جائیں۔ مولانا تاج محمد نے لولاک میں ربوہ کی سیاست کاری پر نقد و نظر کو ملحوظ و مقدم رکھا، لیکن میرزائی ایوب خاں کی فضا میں اس قدر مستحکم ہو چکے تھے کہ ایسی ہر تنقید سے خود کو بالا سمجھ کر ڈیفنس آف پاکستان رو لے کر انہیں تحفظ دے رکھا تھا۔ نواب کالا باغ نے راقم کو بتایا تھا کہ ڈیپنس آف پاکستان کو داؤں پر لگا دیا تھا۔ راقم نے میرزائی کی ہر جتنی سیاسی

مطالعہ کیا۔ اس کے سوانح 'انکار' پوری روداد معلوم کی۔ پھر ۳۰ اپریل ۱۹۶۷ء کو جینیٹ رحب سے ربوہ منسک ہے، میں ایک عظیم الشان جلسہ کو خطاب کیا اور ان تمام حقائق کی چہرہ کشائی کی جو اب تک مضمرہ راز میں تھے راقم نے ایوب خاں سے عرض کیا کہ "میرزا بیت کی تاریخ سیاسی دینیات کی تاریخ ہے۔ میں ہر چیز پوری ذمہ داری سے عرض کروں گا اور اگر کوئی بات غلط ہو تو اس کی تصحیح کے لیے بر غلطہ حاضر ہوں۔ اس جلسہ کے سرکاری رپورٹر کی معرفت گورنر پنجاب اور گورنر پنجاب کی رسالت سے صدر مملکت تک اپنی معروضات پہنچانے کا متمنی ہوں۔ میرزا قی پاکستان میں اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے اور اپنے لیے محلی اسرائیل بنانے کے لیے مغرب کی استعماری طاقتوں کے آلہ کار ہیں۔ میرزا قی نہ صرف یہ کہ پیغمبر استعمار کی سیاسی امت ہیں بلکہ یہ قول اقبال، احمدیت، یہودیت کے قریب تر ہے۔ راقم نے انہی دنوں لکھا کہ سرفراز شاہ خاں انگریز کی شخصی یادگار ہیں۔ یہ اس خبر کے تبصرہ کا عنوان تھا۔ جو ۶ نومبر ۱۹۶۷ء کے مشرق میں شائع ہوئی کہ افریقہ میں کیپ ٹاؤن کے ۳۶ ہزار مسلمانوں نے سرفراز شاہ خاں کا بایکٹ کر دیا ہے۔

راقم کی اس تقریر اور چٹان میں مطابقت و اتفاق اشعار سے میرزا قی امت بوکھلا گئی۔ روزنامہ الفضل کے ایڈیٹر روشن دین تنویر نے راقم کو زخم زد کیا۔ اس پر راقم نے میرزا بشیر الدین محمود سے سوال کیا آپ بزم خویش "مبصر موعود" کے "مصلح موعود" صاحبزادے ہیں۔ آپ کے یار روشن دین تنویر کے پاس کوئی شہادت یا دستاویز ہے تو سامنے لائیے اور ثابت کیجئے کہ آپ سچے ہیں۔ ارشاد ربانی یہ ہے کہ کسی پر اتہام نہ لگاؤ اور نہ ایسا الزام گھڑو جس کا تمہارے پاس ثبوت نہیں۔ میرزا بشیر الدین محمود نے چٹان کے جواب میں الفضل کے صفحہ اول پر اپنے قلم سے مضمون لکھا اور راقم سے مصافحہ مانگی کہ الفضل کے ایڈیٹر نے بلا ثبوت الزام عائد کیا ہے۔ راقم نے اس کے فوراً بعد ربوہ کا "لا سپونین" کے عنوان سے ادارہ لکھا جس میں میرزا بشیر الدین محمود کی تصویر کھینچی کہ وہ کن معصیتوں کا مجموعہ ہے۔ ربوہ تو مہربلب ہو گیا، لیکن لاہور میں اپنے ایک ہفتہ وار کو میرزا غلام احمد کی سنت کے مطابق گایاں بگنے پر مامور کر دیا۔ پاکستان میں بیسیوں ہفتہ وار اور ماہنامے قادیانیت پر تبراتی قسم اٹھاتے اور جید علماء کی ایک ڈار اس کی چھتاڑ کرتی، لیکن ان سے متعلق قادیانی کسی شس سے مس نہیں ہوتے۔ بلکہ منہ میں گھنگھنیاں ڈال کے تماشہ دیکھتے، لیکن چٹان کی ہر تقریر اور راقم کی ہر تقریر سے قادیانی امت پر رشتہ طاری

برجاء اور ہڈیان کے ڈھیر لگا دیتی۔ راقم نے علامہ اقبال کے افکار کے اساس پر میرزا بیت کی سیاسی تاریخ کا
استمرار کر دیا۔ پیش کیا اور اس سلسلہ کے ان تمام حقائق کو بے نقاب کیا جو عوام کے سامنے نہیں تھے مثلاً اسرائیل
میں قادیانی مشن اور اس کے اعمال۔ کیا بیر (اسرائیل) میں قادیانی مکانات پر عربوں کی شکست پر چراغاں، انگلستان
کے میرزائی مشن کا جاسوسی چہرہ، مرزا ناصر احمد کے سفر یورپ کی حقیقی غامت۔

علامہ اقبال نے میرزا میوں کے متعلق اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ میں نے انہیں حضورِ مرد کا منات
کے متعلق بے ادب پایا اور آنحضرتؐ کے بارے میں ان کی زبان سے گستاخانہ کلمات سنے ہیں۔ راقم نے
خدا م الامجدیہ ربوہ کے ماہنامہ خالد (جولائی ۱۹۶۶ء) سے میرزا غلام احمد کے چشم و چراغ مرزا رفیع احمد
کی تقریر نقل کی۔ اس کا عنوان تھا تمہارا مقصد یہ ہے کہ بہت سے چھوٹے چھوٹے محمد پیدا کریں۔

حکومت چونکہ ہوتی، لیکن اس کا حال سیاسی ضرورتوں کے تحت جاتے رفتے نہ پاتے ماڈن کا متغ۔
اس کے سیکورڈ ذہن نے یہ بھی ہضم کیا کہ اس وقت سیکورڈ ذہن ہی حکومت کا ہالہ کتے جوتے تھا۔ راقم حکومت کی
پیدا کی ہوئی سیاسی گھٹن اور اس کے حواریوں کی بے ضمیری پر ادبی نوک جھونک کرتا تو قادیانی گشتے ایوب خاں
کو انگیزتے اور کسی نہ کسی کارروائی پر گامادہ کرتے۔ چٹان کے سرکاری اشتہارات تو شروع سے بند تھے جن صنعتی
و تجارتی اداروں سے کوئی اشتہار مل رہا تھا، وہ بھی بند کر دیتے گئے حتیٰ کہ ادارہ چٹان میں ایک مستقل انفارمر
پیدا کیا گیا۔ اس کا مشاہرہ دوسروں سے پانچ سو روپے تک پہنچا۔ اُس نے حکومت کو چٹان پرنٹنگ پریس کے
مستقل کارکنوں کی ایک فہرست مہیا کی۔ ایوب خاں کے وزیر خزانہ نے انہیں پیغام دیا کہ چٹان سے ہاتھ
اٹھالیں۔ جس کسی اخبار یا رسالے نے چٹان پریس میں چھپائی کے لیے درخواست کی، وہ نامنظر کی گئی۔ اس سے
کہا گیا کہ دوسرے کسی پریس میں انتظام کر لو، لیکن سرکاری دانشوروں کو اندازہ ہی نہ تھا کہ خط
یوں جنونِ عشق کے انداز چھٹ جاتیں گے کیا

یا پھر ملانا لطاف حسین حالی کے الفاظ میں ۷

تقریر جرمِ عشق ہے بے صرفہ مقسب

بڑھتا ہے ذوقِ جرم، یہاں ہر مزا کے بعد

ایوب خاں اپنی دھن کے انسان تھے، انہیں بلاشبہ قادیانی عقائد سے کوئی واسطہ نہ تھا، لیکن وہ سیاست
کے ایسے نرغ میں تھے کہ میرزائی نراز ہوتے گئے۔ ان کا طرزی سیکرٹری جبران کے ساتھ رہا وہ بعض روایتوں کے

مطابق قادیانی تھا۔ ایم۔ ایم احمد نے ایوب کی بعض خواہشوں اور چاہتوں کے ارد گرد خود سپردگی کا حلقہ باندھ رکھا تھا۔ وہ اقتصادي منصوبہ بندی کا واٹس چیرمین ہونے کی حیثیت میں ان کے بیٹوں کی مدد کرتا اور اس طرح اپنی جماعت کے لیے تنفعات حاصل کرتا۔ مختصر یہ کہ میرزا غلام احمد کے اُمّی، ایوب خاں کی سیاسی ضرورت تھی۔ نواب کالا باغ قادیانیت کو تجربہ جان چکے تھے۔ ان کے متعلق نجی محفلوں میں سنت سے سخت تنقید کرتے اور سیاسی و مذہبی اعتبار سے انہیں ملک و ملت کے لیے خطرناک سمجھتے تھے، ان کے زمانہ میں مرکز کی ہدایت پر چٹان کو بسند قادیانیت، کئی دفعہ دارنگ دی گئی، لیکن چٹان ڈسٹرکٹ میجرٹریٹ کو ہمیشہ ددلوک جواب لکھوا دینا کہ سب کچھ گوارا ہے، لیکن میرزا نیت سے قطع نظر نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ وہ اسلام و پاکستان ددلوک کے خدار ہیں۔ نواب کالا باغ سبکدوش ہو گئے تو جنرل موسیٰ گورنر ہوتے وہ اس مسئلہ کو بالکل نہ سمجھتے تھے۔ میرزا بیوں نے افسران ہماز سے ملی بھگت کر کے چٹان کے خلاف سرکاری تنبیہوں کا تانا بگوانا لگوا دیا لیکن راقم ہر ڈسٹرکٹ میجرٹریٹ یا ہوم سیکرٹری کو ٹکاسا جواب دیتا رہا۔ کہ وہ ایک کافر امت کے لیے کسی دارنگ کی زحمت نہ کریں۔ ایڈیٹر چٹان کافر ہے کہ اس امت کے اعمال و انکار پر نگاہ رکھے۔ انکی حرکات تنبیہ سے حکومت کو مطلع کرے اور مسلمانوں کو بتاتا رہے کہ میرزا نیت کیا ہیں اور کیا نہیں؟ ایک دفعہ ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر لاہور نے اس سلسلہ میں راقم کو بلوایا تو اتفاق سے مولانا کوثر نیازی بھی کسی سلسلہ میں وہاں تھے۔ ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر گنڈاپور کے عہد کی یادگار تھا۔ راقم نے اس درشتی سے جواب دیا کہ وہ راقم کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ راقم نے کہا، گورنمنٹ اس قسم کی تنبیہوں سے کیا چاہتی ہے؟ راقم ان تنبیہوں کو پیکار و قوت نہیں دیتا۔ حکومت بزدل نہ بنے۔ مقدمہ چلائے تاکہ انسانہ و حقیقت کھل جائیں۔ راقم سے مولانا کوثر نیازی نے کہا کہ اس جرات کے نونے قرن اول کے مسلمانوں میں تھے۔ ہم اسی لہجہ میں حکومت کو مسئلہ کی اہمیت کا احساس دلا سکتے ہیں۔

راقم نے محسوس کیا اور بھانپ لیا کہ میرزا نیت بے قابو ہو چکا ہے اور ایوب خاں کو سیاسی مخاطب دے کر ان تمام عناصر کو مروانا چاہتا ہے جو اس کے متعلق عوام میں احتساب قائم کئے ہوئے ہیں۔ مرزا بیوں نے صدر ایوب اور گورنر موسیٰ سے ملی بھگت کر کے یکم اپریل ۱۹۷۱ء کو ہوم سیکرٹری پنجاب کے دستخطوں سے ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت تمام ایڈیٹروں، پرنٹروں اور مبشرین کے نام اس امر کا حکم جاری کر دیا کہ آئندہ کوئی ایسی تحریر نہ چھاپی جائے جو کسی فرقے کے عقائد و افکار اور الام و اعمال سے متعلق ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ قادیانی اُمت کی حمایت و حفاظت کے لیے اہلخانہ اقدام تھا اور الہام و پیش گوئی ... (Dedication) کا نظم پہل دفعہ، ممکنہ میں شامل کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے انگریزوں نے بھی اپنے کسی دور میں کبھی اس قسم کی حماقت نہ کی تھی، لیکن ایوب خاں کے عہد میں اس حماقت کا آغاز ہوا حتیٰ کہ اس زمانہ کے انسپکٹر جنرل پولیس کو بھی تقریریں کرنے کا شوق چرایا۔ اُس نے کئی اضلاع میں علماء کو اپنے مخصوص لب و لہجہ میں دھمکانا شروع کیا۔ راقم نے ۲۱ اپریل ۱۹۶۵ء کے شمارے میں "الہمد للہ" کے زیر عنوان ایک مختصر شدہ لکھا۔ جو نوائے دلت کے ایک مکتوب کی بنا پر تھا کہ اُس فرقہ کے متعلق حکومت کو غور کرنا چاہیے۔ جو عرب ممالک میں ہمارے خلاف بدگمانی پیدا کرنے کا باعث ہو رہا ہے۔ ان چند الفاظ کے سوا اس شذرہ میں اور کچھ نہ تھا حکومت جوش میں آگئی۔ اس نے ایک آدھ دن ہی میں قانون کے بل نکال کر ۲۵ اپریل کو نہ صرف پرچہ ضبط کیا، بلکہ "چٹان" کا ڈیکلریشن منسوخ کر ڈالا اور چٹان پر بیس بھی ضبط کر لیا۔ اس سلسلہ کا یہ پہلا اقدام تھا۔ راقم نے انتہائی حقارت سے احکام وصول کئے اور پوری جرأت سے حکومت کے ساتھ لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ راقم نے ان احکامات پر جو فرقے لکھے وہ حکومت کے رخسار نازک پر زناٹے کا طمانچہ تھے۔

راقم نے ۶ مئی کی شب کو جمعیتہ العلماء اسلام کانفرنس میں میرزا بیت کے خلاف محرکہ آراء تقریر کی، جو سواتین بجے شب تک جاری رہی۔ اگلے روز، ۷ مئی کو حکومت نے آغاز شب کے تھوڑی دیر بعد راقم کو ۲۷ ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار کر لیا۔ سنٹرل جیل ڈیرہ اسماعیل خاں بھجوا دیا اور سی کلاس میں رکے جانے کا حکم دیا۔ یہ تمام کہانی راقم کی کتاب موت سے واپسی میں دیکھیے۔ اس کا مختصر سا ذکر پہلے بھی آچکا ہے خلاصہ یہ ہے کہ:

۱۔ گورنر موسیٰ اٹنائے سفر ہی میں راقم کو مردا دینا چاہتے تھے۔

۲۔ ڈیرہ اسماعیل خاں سنٹرل جیل میں راقم کو بھانسی کے دہرے سیل (Cell) میں رکھا گیا۔ جہاں ساتھ کے (Cell) میں ایک مغلوب الغضب قبائلی تھا۔ اُس کی تمام اپیلیں خارج ہو چکی تھیں اور تقریباً ۱۰ سال کے بعد بھانسی پانے والا تھا۔ ایوب خاں نام کا ایک بے ضمیر شخص جیل کا سپرنٹنڈنٹ تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ گورنر کے اشارے پر راقم کو مردا دینا چاہتا ہے۔ اُس مغلوب الغضب قبائلی کو اس نے یقین دلایا کہ وہ رہا کر دیا جائیگا اگر اپنے ساتھ لے بیڑی (تم کو رست کے گھاٹ اتار دے۔ بیل بٹھے نہ چڑھی۔ ایک تو ڈیرہ اسماعیل خاں کے زندہ دل لوگوں نے مقامی عناصر کی زبردستی کر دوگی اعلان کر دیا کہ شورش ہمارا مہمان ہے

اگر اسے کوئی ضعف پہنچا تو وہ سپرنٹنڈنٹ کی جان لے کر حکومت کی اینٹ سے اینٹ بھلے گی۔ دوسرے جیل خانہ کے میڈیکل انسپٹر اکثر نیازی مسلمان طبیعت کے انسان تھے۔ انہیں راقم سے رسالتناب کے مدد میں بھی اطلاع تھا۔ قیصرے راقم نے ہائی کورٹ کو تار بھجوا دیئے کہ راقم کی زندگی سخت خطرہ میں ہے اور حکومت راقم کو مروانا چاہتی ہے۔ اس پر ہائی کورٹ کے ڈویژن پنچ مشعل برحبش خان بشیر الدین خاں اور حبش شیخ شوکت علی نے سختی سے نوٹس لیا۔

مولانا صلاح الدین ایڈیٹر ”ادبی دنیا“ کے فرزند مٹرو جید الدین ڈیرہ اسماعیل خاں میں کمشنر تھے۔ انہوں نے ایوب خاں سپرنٹنڈنٹ جیل کو ڈانٹا کہ پچھلے حدود میں رہو۔

۳۔ جب ہائی کورٹ کے حکم پر راقم کو سنٹرل جیل کراچی منتقل کیا جانے لگا تو سپرنٹنڈنٹ جیل نے گورنر کے فرستادوں سے علی جگت کر کے بنوں اور کالا باغ کے راستہ میں راقم کو گولی سے اڑا دینے کا فیصلہ کیا۔ اس سپرنٹنڈنٹ جیل کا گھس بنوں ہی میں تھا۔ سڑک کے لیے آدھی رات کا وقت طے کیا گیا اور اس غرض سے ایک قادیانی انسپٹر یا سب انسپٹر مقرر ہوا۔ گورنر موسیٰ فوجی ہونے کے باعث حوصلہ مند انسان تھے ان کے زمانہ میں پولیس نے بعض معروف بد معاشوں کو گولیوں سے بھجوا دیا اور بیان یہ کیا تھا کہ وہ فساد ہونے کے لیے پولیس مقابلہ پر اتر آتے تھے۔ راقم کے متعلق یہی پلان تھا کہ نصف شب کو پولیس دین میں سوار کر کے بنوں کی طرف کے ویرانہ میں گولی مار دی جاتے۔ اور اعلان کیا جائے کہ قیدیوں کی گناہ فائرنگ سے نظر بند ہلاک ہو گیا ہے۔ راقم کو اس راز سے جیل کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے آگاہ کیا۔ وہ قاضی عطاء اللہ جان شہید (خان وزارت کے وزیر مالیات) کا رشتہ دار تھا۔ اس کا ایک بھائی منحوش تحریک میں رہا اور اسی جیل میں بھوک ہڑتال سے شہید ہوا تھا۔ اس نے سیاسی پس منظر کی شرافت کے تحت راقم کو سپرنٹنڈنٹ کی ہدایت سے آگاہ کیا۔ راقم چونکہ ہو گیا۔ جب پولیس نصف شب کے لگ بھگ راقم کو لینے آئی تو راقم نے انکار کر دیا۔ سپرنٹنڈنٹ کی بے عزتی کی اور اس کو دھمکا یا کہ اس کے خفیہ ارادوں کی اطلاع میں اپنے دوستوں اور عزیزوں کو دسے چکا ہوں۔ نتیجہً بلا ٹل گئی۔

۴۔ راقم کو اگلے روز صبح کے وقت ہوائی جہاز کے ذریعہ ڈیرہ اسماعیل خاں سے کراچی بھیجا گیا۔ کراچی میں جیل کا عملہ اخلاق و شرافت کی قدروں سے واقف تھا اور سپرنٹنڈنٹ جیل ایک پڑھا لکھا خاندانی شخص تھا۔ اس نے ہر چیز قانون کے مطابق کی۔

راقم نے اس جیل میں مختلف مطالبات کے لیے جھوک ہڑتال کر کے حکومت کو اس طرح زچ کیا۔ کہ ایوب خاں اور گورنر موسیٰ اندر خان ہل گئے، لیکن کچھ دیر اپنی اُنا کو پاتے رہے۔

۵۔ گورنر موسیٰ راقم کو ہمیشہ کی نیند سلا دینا چاہتا تھا۔ راقم سول ہسپتال کراچی میں تھا تو اس نے ڈاکٹر امیر مستند خاں ہیلتھ سیکرٹری کی معرفت راقم کے معالج پر ونیسر ڈاکٹر افتخار احمد سے کہا کہ شورش کشمیری کو چلتا کر گورنر آپ کی ترقی کا خواہاں ہے ڈاکٹر نے جواب دیا میں ڈاکٹر ہوں ہم لوگ خدا سے عہد کرتے ہیں۔ ہمارا کام جان بچانا ہے جان لینا نہیں، میں اللہ تعالیٰ کے عذاب کو خریدنے کی جرات نہیں کر سکتا۔

مسٹر ایس۔ آئی۔ حق، ایس۔ ایس۔ پی، سابق چیف سیکرٹری، مغربی پاکستان کے اس بیان کا اقتباس مع ترجمہ ”موت سے واپس میں“ درج ہے (صفحہ ۲۹) جس میں انہوں نے گورنر موسیٰ کے اس ارادہ کا ذکر کیا ہے اس کے علاوہ جسٹس شوکت علی کی ایک دستاویز بھی مع ترجمہ نکل کی گئی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اور ان کے فاضل ساتھی کو راقم کے مقدمہ میں کیونکر تنگ کیا گیا اور کس دباؤ کے تحت صوبہ کی سب سے بڑی عدالت کے دو فاضل جموں سے کہا جاتا رہا کہ وہ شورش کشمیری کے مقدمہ کو خارج کر دیں۔ جسٹس بشیر الدین نے بھی نوائے وقت میں راقم کی تصنیف ”موت سے واپسی پر ایک مضمون لکھ کر گورنر کے اسی دباؤ کا ذکر کیا۔

۶۔ ایک دوسرے پہنچنے چٹان کے ڈیکلریشن کی بحالی کا فیصلہ صادر کرتے ہوئے قادیانیت کے مسئلہ پر میرزائی امت کو انسانی اقدار کے مفروضہ پر جو سہارا دیا، وہ قادیانیت نے اپنی حیات مستعار کے لیے استعمال کیا، لیکن اس فیصلہ سے عامۃ المسلمین پر اتنا اثر بھی نہ ہوا، جتنا ماش کے دانے پر سفیدی ہوتی ہے۔

۷۔ حکومت نے میرزائیت کی حوصلہ افزائی کے لیے نہ صرف یہ کہہ کر قانون و عدالت کے مسلمات سے رُگردانی کی، بلکہ اس کی ڈھٹائی کا یہ عالم تھا کہ جب کسی ماہ کی طویل اڑچنوں کے بعد کراچی میں راقم کا مقدمہ شروع ہوا تو راجہ سید اکبر ایڈووکیٹ جنرل نے پنچ کے رُوبرو بیان دیتے ہوئے کہا کہ میرزائی مسلمانوں میں سے ہیں۔ جسٹس بشیر الدین خاں نے پوچھا۔ کون کتنا ہے؟ ایڈووکیٹ جنرل نے کہا: ہائی کورٹ کا فیصلہ ہے۔

ناضل جج نے پوچھا: کس ہائی کورٹ کا؟

ایڈووکیٹ جنرل نے کہا: اسی ہائی کورٹ کا۔ چٹان کے ڈیکلریشن کی اپیل میں۔

جسٹس بشیر الدین نے ماتھے پر ایک معنی خیز ہنسن ڈالی اور فرمایا ہم اس فیصلہ کے پابند نہیں۔

ایڈووکیٹ جنرل نے حکومت کو مطلع کیا کہ جج صاحبان کو اپنے ڈھب پر لانا مشکل ہے۔ حکومت نے

اس کو عدالت کی توہین کر دینے کے لیے کہا۔ اُس نے اگلے روز ۱۸ دسمبر کو سرکاری نمائندے کی حیثیت

میں توہین عدالت کا ارتکاب کیا۔ پنج دسمبر وار ہو گیا۔ یہ ایڈووکیٹ جنرل کا ایک ایسا گھناونا جرم تھا

کہ برطانوی عہد سے لے کر اس دن تک اس کا تصور ہی ناممکن تھا۔ تمام عدالت میں سناٹا مچا گیا

اگلے روز ملک کے اخباروں نے (سرکاری اجیروں کو چھوڑ کر) اس واقعہ کا نوٹس لیا۔ کئی ایک نے

اداریے لکھے، لیکن حکومت کی آنکھ کا پانی مرجھا تھا۔ اس کے کانوں پہ جوں تک نہ رنگی۔ راقم نے

ایڈووکیٹ جنرل کا اس شدت سے محاسبہ کیا کہ فخر ہو گیا۔ حکومت نے شاید اتنی ملاحیاں کبھی نہ سنی

ہوں۔ جتنی اُس دن ہائی کورٹ کے احاطہ میں گونج رہی تھیں۔

راقم سول ہسپتال کراچی میں زیر علاج تھا۔ عدالت سے لوٹتے ہی احتجاجاً بھوک ہڑتال کر دی۔

افسروں کا تانا باندھا کہ بھوک ہڑتال چھوڑ دو حکومت رہا کرنے کو تیار ہے۔ راقم نے کہا حکومت چھوڑ

دے، بھوک ہڑتال خود بخود ختم ہو جائے گی۔ آخر آٹھویں دن ۲۵ دسمبر کو حالات کی نزاکت دیکھ کر

اور عوامی تحریک کی پروانوں سے سرا سیم ہو کر حکومت سپر انداز ہو گئی۔ راقم کو ۲۵ دسمبر کو گیارہ بجے

صبح رہا کر دیا۔ میرزا تیت کا چہرہ اتر گیا۔ ملک کے تمام علماء مشائخ اور راہنما اس سلسلہ میں احتجاج کر

رہے تھے۔ راقم کئی روز بعد کراچی سے لاہور روانہ ہوا تو ہر اسٹیشن پر عوام کے بے پناہ استقبال، ہجوم سے

اندازہ ہوا کہ لوگوں کے جذبات کیا تھے اور کیا ہیں؟ راقم کی بھوک ہڑتال نے تمام اضلاع کو سگایا تھا

اور قادیانیت کے بارے میں ان کے دیرینہ جذبات جاگ اٹھے تھے۔ ہر اسٹیشن پر راقم کا محض استقبال

ہی نہیں ہو رہا تھا، بلکہ اس جذبہ و تحریک پر صادر کیا جا رہا تھا جو مسلمانوں کے دل میں اجتماعی طور پر نقش تھا

اور قادیانی جماعت کو مسلمانوں سے الگ اقلیت قرار دینے کے لیے متداول تھے یہی خال اقدار میں آتے

تو اپنی روایت کے مطابق میرزائی ان کے ساتھ ہو گئے، لیکن میرزائی پسے کی طرح ان کے تابع مہل نہ تھے بلکہ

عالمی استعمار اور صیہونی اقدار کے بل پر ہاتھ پاؤں پھیلا رہے تھے۔ یہی خال بھی عالمی استعمار کا اینٹ تھا

اور قادیانی بھی! دونوں ایک دوسرے سے واقف تھے کیونکہ دونوں کو ایک ہی مشن سونپا گیا تھا کہ مشرق پاکستان کو مغربی پاکستان سے کٹوا دیں۔ دونوں نے یہی فرض انجام دیا، لیکن دونوں میں اندر خانہ جلا پابھی تھا، یہی خاں سمجھنا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی جماعت نہیں اور قادیانی بجائے خود ایک جماعت ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ انتخاب کے دوران یہی خاں نے سی۔ آئی۔ ڈی کی معرفت میرزائیوں کے خلاف ہینڈ بل چھپواتے، لیکن جن لوگوں کے سپرد کئے انہوں نے راقم کی اطلاع کے مطابق تقسیم کرنے کی بجائے قادیانی بزدلوں کے ہاتھ فروخت کر دیے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ میرزائی اپنے خلیفہ کے ساتھ پیپلز پارٹی کی داشتہ ہو گئے۔ اس سے اعزازی عقد باندھ لیا۔ انہیں یقین تھا کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق پیپلز پارٹی کو استعمال کر کے اپنا راستہ صاف کر سکیں گے اور اس کی طاقت کے بل پر اپنے مخالفوں کو ٹھکانے لگا دیں گے۔

وائس ایر مارشل ایم۔ اختر نے جو ایک مشہور قادیانی تھا۔ تمام پاکستان کو اپنے اس اعلان سے داخلہ حیرت میں ڈال دیا کہ اس نے پاکستان ایر سروسز کے نام پر ایک نجی ادارہ قائم کیا ہے جو پاکستان کے تمام دوست ممالک کو جوا بازی کے تربیتی ادارے قائم کرنے میں مدد دیگا۔ وائس ایر مارشل اختر نے ٹانڈگانہ پریس کو بتایا کہ اس ادارے کی معرفت افرادی قوت کے علاوہ تربیت یافتہ ماہرین بھی مہیا کئے جائیں گے۔ مذکورہ جنگ کراچی نے ۱۹۷۱ء کو یہ خبر شائع کی۔ راقم نے ۱۶ مارچ ۱۹۷۱ء کے چٹان میں اس پر ایک طویل اداریہ لکھا، جس میں حکومت کو توجہ دلائی کہ اس ادارہ کو روک دیا جائے، کیونکہ اس قسم کی فوجی تربیت عسکری مفاد کے منافی ہے۔ اس کھڑاگ کا اس کے سوا اور کوئی مقصد نہیں کہ وائس ایر مارشل ایم اختر عرب ممالک میں قادیانی فوجوانوں کو بھیج کر اسرائیل کی اغراض کے مددگار ہونا چاہتے ہیں۔ اس ادارہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ ادارہ پیدا ہونے کے ساتھ ہی مرگیا اور عرب ممالک اپنے سفارت خانوں کی معرفت اس سے چوکتا ہو گئے۔

مستر بھٹو نے ۲ ستمبر ۱۹۷۱ء کو عزیز بھٹی کے مقام شہادت پر ۱۹۷۱ء کی جنگ کے شہداء کو خراج ادا کرتے ہوئے مشاعرہ ترنگ میں فرمایا کہ لفٹیننٹ جنرل اختر ملک کی یادگار بنی چاہیے۔ اگر یہ اب نہ ہوا تو جب پیپلز پارٹی برسرِ اقتدار آئیگی، ان کی یادگار ضرور قائم کرے گی۔

(پاکستان ٹائمز ۷ ستمبر ۱۹۷۱ء کالم ۵)

راقم نے ۱۹ ستمبر کے چٹان میں طویل اداریہ لکھا کہ جنرل اختر حسین ملک ایک میرزائی تھے وہ جنگ

میں کام نہیں آتے، بلکہ ترکی میں شاہراہ کے حادثہ سے مرے تھے۔ ان کی نعش کو ترکی سے ربوہ پہنچایا گیا، لیکن مرزا ناصر احمد نے ہمشقی مقبرہ "میں دفن نہ ہونے دیا اور ان کے اعزاء منہ تکتے رہ گئے۔ مسلمان اپنے ملک میں ایک میرزائی کی یادگار قائم نہ ہونے دیں گے۔ آفرانیں یہ اعزاز کیوں بخشا جا رہا ہے۔

اس ادارہ سے بعض میرزائی انسر بگڑے اور فون پر اپنے بے قابو غصہ کا اظہار کیا۔ پاکستان ٹائمز نے خطوط کے کالموں میں اس قسم کے غلط شائع کئے جن میں راقم کو بڑا بھلا لگا گیا اور جنرل اختر حسین ملک کی شان میں نصیب دے کیے گئے۔ پھر جب ستمبر ۱۹۹۱ء میں برسرِ اقتدار آتے تو میرزائیوں نے پیپلز پارٹی کی سیاسی ناراحتوں کو استعمال کیا، بعض وزراء کے اشتراکِ ذہن سے فائدہ اٹھایا، کئی فوائد حاصل کئے۔ جس بہتات سے سرکاری انسر کالے گئے اس سے قطع نظر کہ وہ عطا کار تھے یا نہیں، لیکن سبکدوش ہونے والوں میں ایک بھی انسر قادیانی نہ تھا۔ راجہ ایک بڑا ستم یہ ہوا کہ بعض بڑے فوجی عہدوں پر قادیانی پہنچ گئے انہوں نے اپنے ہم عقیدہ افراد کی بھرتی جزو ایمان بنائی۔ اس طرح سیکرٹریٹ کے اعلیٰ اہل ذمہ خزانہ کے علاوہ کئی ایک خود مختار سرکاری اداروں میں ان کا طوطی بولنے لگا۔ نویت برائیاں رسید کہ اہم سے اہم حکم ان کے تصرف میں آگیا۔ میرزائی اپنے متوقع اقتدار کا چرچا کرنے لگے۔ چٹان نے اپنی مہم تیز کر دی۔ میرزائیت کی سازشی حرکتوں اور اندرونی تیاریوں کا گھونگھٹ اُلٹا شروع کیا۔ اپنی آواز کو ہر ہفتہ تیز کیا۔ نتیجہً ایک زبردست ذہنی تحریک پیدا ہو گئی۔

راقم کا عقیدہ ہے کہ جب قادیان عشقِ رسالت کی صفیں کزدر پڑ جاتی ہیں تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی دھکیلی کرتے اور اپنی ختم المرسلین کا تحفظ فرماتے ہیں۔ پاکستانی فضائیہ کے سربراہ ایئر مارشل ظفر چوہدری سنت گیر طبیعت کے متعصب قادیانی تھے۔ انہوں نے فضائیہ کو اپنے ہم عقیدہ اشراف کی ملک بنانے کا عزم کر رکھا تھا۔ اس غرض سے وہ سبھی کچھ کرتے۔ مثلاً امریکہ وغیرہ تربیت کے لیے کسی فضائی نوجوان یا انسر کے بھیجنے کا سوال پیدا ہوتا تو قادیانی کا چناؤ کرتے۔ انہی کو فضائیہ کے اہم شعبوں میں لگاتے، عرب بیاستوں میں بھجواتے۔ ایئر مارشل ظفر چوہدری نے میرزائی انسروں کی ترقی کا راستہ ہموار کرنے کے لیے بہت سے مسلمان فضائی انسروں کو نام نہاد سازش کے مقدمہ میں چھساکر کورٹ مارشل کی بھیمنٹ چڑھا دیا۔ ان میں وہ نوجوان بھی تھے جنہوں نے ہوا بازی کے بہت سے معرکے سرکے تھے۔ ان نوجوانوں کو طویل ساحت کے بعد لمبی لمبی سزائیں دی گئیں۔ انہوں نے سماعت کے دوران عدالت میں

قادیانیت کا پردہ چاک کیا اور ظفر چوہدری کے مذہبم راہوں سے نقاب اٹھائی۔ ایک فضا کی افسر نے مشرذوالفقار علی بھٹو تک رسائی حاصل کی اور انہیں ظفر چوہدری کے اغراض مشنزم سے آگاہ کیا۔ اس کی نذرہ خیز روداد سن کر مشر بھٹو حیران رہ گئے۔ اسی دوران ظفر چوہدری یا ان کے کسی ہم عقیدہ نائب نے یمنطلی کی کر بلوہ کے سالانہ جلسہ پر لیا روں کی ایک ٹکڑی کو سلامی دینے کے لیے مسجد یا اس ٹکڑی نے میراجا ناصر احمد کو اپنے عسکری انداز میں سلام کیا۔ مولانا تاج محمد کے پاس خبر پہنچی۔ انہوں نے فون پر راقم کو مطلع کیا۔ راقم نے چٹان میں قلم اٹھایا۔ انکا ترمی ہوئی تو خبر صحیح نکلی۔ حکومت نے ضابطہ کی مرز تشریح کی۔ ظفر چوہدری ۱۹۶۵ء کی جنگ کے فضا کی ہیرو مشر ایم۔ ایم عالم کو ملک سے نکال دینا چاہتے تھے تاکہ ان کے بعد قادیانی افسروں کی زنجیر ہیوست رہے اور اس کے مطابق قادیانی افسیر کیجے بعد دیگے ترقی پاتے رہیں۔ جب مشر بھٹو ان حقائق سے آگاہ ہو گئے تو ان کی شخصیت متحرک ہو گئی۔ انہوں نے ایئر مارشل ظفر چوہدری کو رخصت کر دینا قادیانی امت کے لیے ایک ایسا صدمہ تھا کہ اس کے اوسان خطا ہو گئے اور بلوہ میں تفرزول پیدا ہو گیا۔ ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ حتیٰ کہ فضا کیجے کے ہراسٹیشن میں شیرینی تقسیم کی گئی۔ اُدھر بڑی و بھری فوج میں بھی قادیانی افسروں کے خواب پر آگندہ ہو گئے اور وہ قادیانی جرنیل جو جنرل ملکا خاں کے بعد اپنی سربراہی کا خواب دیکھ رہے تھے اپنی ٹوٹتی ہوئی سوچ کے خلاؤں میں چلے گئے۔ قادیانی امت کی پریشانی کا یہ حال تھا کہ اوسان بحال نہیں ہو رہے تھے اور یہ پہلا موقع تھا کہ ان کے بزر چہر مشرذوالفقار علی بھٹو کے خلاف زبان درازی پر اُتر آتے۔ انہوں نے عالمی استعمار سے رجوع کیا اور اس دوطرہ صوب میں لگ گئے کہ ملک کے اندر آئندہ کس جماعت یا شخصیت کے ساتھ وہ نفاستوار کر سکتے ہیں۔ انہوں نے کئی ایک سیاسی راہنماؤں کو اپنے تعاون کی پیشکش کی، لیکن کسی جماعت یا شخصیت کے پاس ایسی زمین نہ تھی جس پر ان کے پاؤں جم سکیں۔ میرزا یوں نے بیرون گتھ جوٹے اپنے حوصلہ کو برقرار رکھنے کے لیے کئی ایک جتن کئے۔ بعض سبکدوش جرنیلوں کے ساتھ رلوہ میں انتہائی خفیہ پکوان تیار کیا کہ مشرذوالفقار علی بھٹو کو قتل کرایا جاتے۔ مشر بھٹو کو بھی اطلاع ہو گئی اور ان پر یہ چیز کھلتی گئی کہ میرزائی اور ان کا پاپا (ناصر احمد) کس داؤں پر ہیں۔ راقم نے چٹان کے صفحات ان کی سرکوبی کے لیے وقف کر دیئے اور ان تمام رازدہاتے سرپرست کو چاک کرنا شروع کیا۔ جو قادیانی امت کے نال خانہ و ماغ میں استعماری و صیہونی طاقتوں کی معرفت پرورش پا رہے تھے۔ راقم نے میرزا ناصر احمد کے مفرا فریقہ اور سفر انگلستان کے احوال کا

افشا کیا۔ ان کے اندرونی اسرار کو تسلسل سے بیان کیا۔ ربوہ سے اس قسم کے لوگ حاصل کئے جو قادیانی امت، قصرِ خلافت اور ربوہ کے ہائی کمانڈر کی سرگرمیوں سے بلا ناغہ مطلع کرتے۔ اور ان کی نکتہ و نیند کے منتفک گوشوں کی خبر دیتے۔ راقم نے ان احوال و حقائق کا اپنے ایک تجزیاتی پمفلٹ ”عمی اسراتیل“ میں کچا چٹھا پیش کیا۔ جو ڈیڑھ ماہ میں دوحاتی لاکھ فروخت ہو گیا۔ حتیٰ کہ فوج کے بعض افسروں نے خرید کے عسکری نوجوانوں میں تقسیم کیا۔ اس پمفلٹ کا پورا متن ایک انڈر گراؤنڈ خطرے کے تجزیہ کے زیر عنوان اپنی طرز کا واحد پمفلٹ تھا ملاحظہ ہو۔

پاکستان خطرے میں ہے داخلی اعتبار سے بھی اور خارجی اعتبار سے بھی، یہ اس تاثر کا خلاصہ ہے جو پاکستان میں ہر کردار کی زبان پر ہے۔ حزب اقتدار اور حزب اختلاف یہ اختلاف الفاظ دونوں ہی اس کی نشاندہی کرتی ہیں، خود صدر مملکت نے بعض غیر ملکی جرائد کے وقائع نگاروں کو معنی خیز اشارات میں ان خطرات کا ذکر کیا اور ملک میں جننی بھی سیاسی جماعتیں اپوزیشن سے منسوب ہیں وہ کھلم کھلا ان خطرات کو بیان کرتی ہیں۔ ان میں اختلاف ہے تو خطرے کی نوعیت اور اس کے تعین کا، لیکن خطرے کے وجود اور امکان پر سب کو اتفاق ہے اور سبھی اس کوششت سے محسوس کرتے ہیں۔

بظاہر داخلی اور خارجی دونوں خطرات ایک دوسرے سے الگ الگ اور آپس میں کٹے چٹے ہوتے ہیں، لیکن صورت حال کی اندرونی نفاذ خارجی اثرات کے تحت اتنی مربوط ہے کہ الگ الگ مہرے بھی ایک ہی شطرنج کے مہرے نظر آ رہے ہیں۔

خطرات کا یہ احساس جواب عوام کے دلوں میں اتر چکا ہے اور لا معاہدہ تاشقند (۱۹۶۵ء) کے فوراً بعد ملک کے خواص کو غلط فہمیاں راز کی معرفت معلوم ہوا تھا اور لوگ محسوس کرنے لگے تھے کہ پاکستان عالمی طاقتوں کی سیاسی خواہشوں کے زلف میں ہے۔ آخر مشرقی پاکستان کے (۱۹۷۱ء) الگ ہو کر بنگلہ دیش بن جانے سے سارا ملک بلکہ ساری دنیا باخبر ہو گئی کہ پاکستان عالمی طاقتوں کی سیاسی خواہشوں کا ”محور“ ہو چکا ہے اور اب پاکستان میں اضطراب و تشویش اور تششت و انتشار کی جہلریں دوڑ رہی ہیں وہ تمام نزع عالمی طاقتوں کے اسی طرز عمل اور پاکستان کی اندرونی سیاست کے اسی اتار چڑھاؤ کا نتیجہ ہے۔

داخلی طور پر خطرہ کی نوعیت یہ ہے کہ برسرِ اقتدار پارٹی (پیپلز پارٹی) جو سرحد و بوجہستان میں صوبائی نمائندگی سے محسوس ہے اپنی بد مقابل سیاسی جماعت نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) کو پاکستان کی مزید تقسیم کے

عالمی پس منظر میں آلہ کار شہزادہ اور اُس کی طاقت کو سبوتاژ کر کے سیاسی تصادم کے پہلو دار اسکانات پیدا کر رہی ہے۔ اور اس الزام کی نیپ کے حلقے تردید کرتے ہیں، لیکن پروپیگنڈا مشینری ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبارات وغیرہ پیپلز پارٹی کے ہاتھ میں ہیں۔ اس لیے سندھ ایک حد تک اور پنجاب بڑی حد تک نیپ کو پیپلز پارٹی کے الفاظ میں پاکستان دشمن کہتے ہوئے جھجکتا نہیں، بلکہ ایسا کہتا اپنی حب الوطنی کا رذوہ خیال کرتا ہے۔ پیپلز پارٹی کے شہ دماغوں کا اصل نزلہ خان عبدالولی خاں پر گرتا ہے۔ جن کا جرم تو یہ ہے کہ وہ صدر بھٹو کی مخالفت میں شروع دن سے ثابت قدم ہیں، لیکن ان کے خلاف فرد جرم یہ ہے کہ وہ خان عبدالغفار خان کے فرزند ہیں اور خاں عبدالغفار خان سرحدی گاندھی ہیں اور آزادی کے آخری لمحہ تک انڈین نیشنل کانگریس کے رہنما رہیں سے تھے، وغیرہ۔

پاکستان پیپلز پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی کی خاموشی کا نقطہ عروج یہ ہے کہ اول الذکر نے مرکزی اقتدار کے بل پر مورخہ الذکر کی سرحد و بومچستان میں وزارتیں برخواست کر کے سرحد کو طاع آزمائوں کے سپرد کر دیا اور بومچستان جو اُس وقت عالمی سیاست کے نزدیک اپنے معدنی خزانوں اور جغرافیائی سواحل کی وجہ سے غایت درجہ اہمیت کا علاقہ ہے۔ نواب محمد اکبر بگٹی کی گورنری کو سوئپ دیا ہے بگٹی پنجاب سے اس حد تک بیزار تھے کہ ان کے نزدیک بھارت کے ہاتھوں پنجاب کی شکست ہی میں مغربی پاکستان یا موجودہ پاکستان کی آزادی کا انحصار تھا اور وہ اپنے ان خیالات کو کسی چھپاتے نہیں تھے۔

پنجاب دوسرے سرحد میں بہرہ و جوہ پیپلز پارٹی کی عوامی طاقت میں حیرت انگیز کمی ہو گئی ہے۔ اب اس کی طاقت کا نام صرف حکومت ہے۔ ایک دوسری حقیقت جو اس بحث میں قابل ذکر ہے وہ پڑے کیے جیتے بالخصوص اسلامی ذہن پر پیپلز پارٹی کے مخالف عناصر کا مروج ہے اور یہ مروج شروع دن سے ہے۔ صدر بھٹو کسی وجہ سے بھی اس ذہن اور اس طبقے کو کسی متاثر نہیں کر سکے، یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ پیپلز پارٹی اقتدار کے بدلنے سیاسی، قانون اور واضح غلطیوں کے باعث مقبولیت عامہ کے اعتبار سے روز بروز ماند پڑ رہی ہے۔

ملک کی عمومی فطرت کے مطابق بعض خاص عناصر جو صرف اقتدار کے لیے جیتے اور اقتدار ہی کے رہتے ہیں صدر بھٹو کو مختلف واسطوں سے شکست دینے کے خواہاں ہیں۔ ان کے سامنے حصول اقتدار کے لیے ہر نفسیہ، جسمانی، سیاسی، مذہبی، اور دیگر ممکنہ حربے ہیں۔ ان کا نظریہ اُن کی اپنی ذات ہے۔ اس تو علموں نے ملک میں عجیب و غریب صورت حالات پیدا کر دی ہے۔ ایک لحاظ سے ہم اس صورت حال کو ذوق خاندان سے تعبیر کرسکتے ہیں بالفاظ دیگر اس

صدر محال کو ہم ان الفاظ میں متفق کر سکتے ہیں کہ جاہلین اپنے اپنے دائرہ میں ملک کے تشکیلات پر دیکھ کر بغیر (غیر ملادی طور پر ہی) پاکستان کو ایک ایسے موڑ پر لے آئے ہیں جہاں پاکستان کی نظریاتی بنیادیں ٹوٹ رہیں اور اس کا سیاسی استحکام روز بروز کمزور پڑ رہا ہے، جس سے عالمی طاقتوں کی سیاسی خواہشوں کو آب و دانہ مل رہا ہے۔

خارجی خطوط عوام محسوس کر رہے اور خواہش کو معلوم ہو چکا ہے اس کا پس منظر مختصر یہ ہے کہ:

۱۔ بھارت نے برطانوی اقتدار کی رخصتی کے وقت پاکستان کو سیاست قبول کیا تھا، لیکن وہ نہایت کمبخت قبول نہیں کیا۔

۲۔ پاکستان کو ٹھانے اور جھکانے کا خیال بھارت نے شروع دن سے ترک نہیں کیا۔ ابتداً پاکستان کے روپے کی روک، مہاجرین کا بے تماشا بوجھ، حیدر آباد کا سقوط، کشمیر پر قبضہ، بیانتہ نرو معاہدے سے انحراف، بیانتہ علی کا قتل، ناظم الدین کی سبکدوشی، محمد علی بوگرہ کی دلدل، سکندر میرزا کی آئین کشی، ایوب خاں کا مارشل لا، ۱۹۶۵ء کی جنگ، ایوب خاں کے اقتدار کا خاتمہ، مشرق پاکستان کی برہمی، یمنی کا اقتدار اور ڈھاکہ کا سقوط۔

ان سب چیزوں میں بھارت برابر کا شریک رہا۔ کسی میں بالواسطہ اور کسی میں بلا واسطہ۔ مثلاً بیانتہ علی کے سانحہ قتل میں ہندوستان شریک نہیں تھا، مگر عالمی طاقتیں پاکستان کو جس نیچ پر لانا چاہتی تھیں فی الجملہ ہندوستان کسی نہ کسی طرح ان منفی خواہشوں میں شریک تھا، بالفاظ دیگر پاکستان کے معاملہ میں عالمی طاقتوں کے سیاسی نفع ہندوستان کی مشاورت سے نیا رہتے رہے اور اب بھی ہندوستان ان نقشوں کے خاکے تیار کرنے میں جزو یا سالما حصہ دار ہے۔

۳۔ عالم اشتراکیت میں روس اور چین کی آویزش سے امریکہ اور روس میں خود بخود ایک ذہنی کھجورہ (گواس) کی بنیادیں دوستانہ ذخیرہ خواہی نہ تھی، ہو گی۔ امریکہ کے لیے اطمینان کا پہلو یہ تھا کہ روس اور چین میں ٹھن جانے سے اشتراکیت مغرب سے عملاً دستکش ہو جاتی اور اپنی ایک ہم عقیدہ ریاست (چین) سے متصادم ہو کر نہ صرف متحدہ طاقت کی حیثیت سے تقسیم ہو جائے گی بلکہ عالمی سیاست کا نقشہ بھی پٹ جاتے گا۔ روس نے غنیمت سمجھا کہ اس طرح وہ ایشیا اور افریقہ میں اپنا اثر بڑھائے گا۔ عرب دنیا اس کی مٹھی میں ہوگی اور گرم پانی کے جن بندروں اور کنالوں کی اس کو تلاش ہے ان کا راستہ مل جائیگا (روس کی حد) سے لے کر بلوچستان میں جیونی تک ایران و افغانستان کی سرحدوں کے یچوں نیچ زمین کی ایک پٹی اس کے ہاتھ آجائے گی جو

اقتصادی اعتبار سے ایک عالمی طاقت بننے کے لیے اشد ضروری ہے۔

چین اور ہندوستان کی آؤیزش جو اس عالمی تصادم ہی کا ایک پارٹ ہے روس اور امریکہ کی ان خواہشوں کے عین مطابق ہے۔ ہندوستان اشتراکی ہو جائے تو ہر کوڑ چینیوں کے بعد، ہر کوڑ کا ملک ٹونسٹنم کی گود میں چلا جاتا ہے۔ پھر سامراج کے لیے افریشیا میں کوئی جگہ نہیں رہتی۔ چین کا طوفان اسی طرح روکا جاسکتا ہے کہ ہندوستان — اشتراکی نہ ہو اور چین سے اس کی ٹھنی رہے تاکہ محاذ سیدھا عالمی طاقتوں کی طرف منتقل نہ ہو۔ ہندوستان نے روس اور امریکہ سے ہمیشہ ہی کہا کہ مضبوط ہندوستان چین کا مقابلہ اُسی صورت میں کر سکتا ہے جب اس کے دو شانوں پر موجود پاکستان اس کے لیے خطرہ نہ ہو یا نہ رہے۔

یہ تھا پاکستان سے امریکہ کی دغا اور روس کی دخل اندازی کا نقطہ آغاز، امریکہ نے فیلڈ مارشل ایوب خان کے ساتھ مشترکہ دفاع پر زور دیا۔ لیکن تب عوام کی ذہنی نفا اور بھارت سے مسلسل آؤیزش کے باعث ممکن نہ تھا فیلڈ مارشل ایوب خان کے اس پر راضی نہ ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ:

۱۔ امریکہ کے رسوائے عالم ادارہ سی آئی اے نے پاکستان میں تدم جمانے شروع کئے۔ (اس کی میراثقول تفصیلات ہیں، انوس کہ اس مقالہ کا موضوع نہیں اور یوں بھی وہ تفصیلات ایک جامع کتاب کا مضمون ہیں)

ب۔ سی آئی اے کے ایک سفارتی اہلکار نے سب سے پہلے فوج میں نقب لگانی چاہی، لیکن ایک

بریگیڈیر سے جو اس اہلکار کا جگری دوست تھا۔ جب ٹکسا سا جواب پایا رراسم کی مصدقہ معلومات کے مطابق اُس نے پنیٹ کھول کر جواب عرض کیا تو سی آئی اے نے سی ایس پی کے انسرز کو اپنے منصوبوں کی تکمیل کے لیے تلاش کیا۔

ج۔ مرکزی انٹیلی جنس بورڈ کے ڈائریکٹر جنرل کو سی آئی اے کے اس اہلکار سے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ مغربی پاکستان کے تمام تھانوں کی عوامی طاقت بندو قوں کی تعداد اور ان کے ساختہ سینیں سے واقف تھا اور اُسے ایک عوامی انقلاب کی شکل میں ان کی اجتماعی کارکردگی کا اندازہ تھا۔

د۔ مرکزی انٹیلی جنس بیورو نے صدر ایوب کو پشاور میں ہاشم کی فائرنگ سے قبل از وقت آگاہ کر دیا تھا کہ صورت حال اس طرح بنائی جا رہی ہے (ضروری نہیں کہ ہاشم بھی اس سے آگاہ ہو، راقم)

د۔ اس فائرنگ کے بعد راولپنڈی چھاؤنی سے دس پندرہ میل آگے (قصبہ کا نام یاد نہیں) آ رہا سرکاری رپورٹوں میں محفوظ ہوگا، پشاور تک مختلف دیات کے لوگ بنادت کے انگلذ میں سڑکوں پر آگئے، لیکن مسٹر الطاف گوہر یا مسٹر این اے رضوی کی کارروائی کے سوا کوئی اجتماعی مظاہرہ کسی نتیجہ کے ساتھ نہ ہو سکا۔ خبر نذر احتساب ہو گئی۔

۳۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں بھارت کی عوامی نے عالمی طاقتوں کو پاکستان سے متعلق ایک دوسری سوچ اور اس کے عمل میں ڈال دیا، وہ سوچ اور عمل تھا۔

۱۔ اگر تلہ سازش

ب۔ چھ نکات

۶۔ مشرقی پاکستان کی مغربی پاکستان سے علیحدگی کا منصوبہ اور تحریک

۴۔ ۱۹۶۹ء کی عوامی تحریک صدر ایوب کی گول میز کانفرنس پر ختم ہو گئی اور ملک اس انقلاب کے ہاتھوں نکل گیا جو عالمی طاقتوں کی اسکیم کے مطابق تھا، لیکن یحییٰ خان نے جو اس وقت کمانڈر انچیف تھا اپنے سیاسی رفقار کی معرفت اس کانفرنس کے نتائج کا ٹھکر نکال دیا، نتیجہ مارشل لا آگیا۔

۵۔ یحییٰ خان کیا تھا؟ یہ راز ابھی تک مرہم ہے لیکن اُس کے برسرِ اقتدار آنے سے سی آئی اے سرگرم ہو گئی۔ مشرقی پاکستان کی سیاست تین حصوں میں بٹ گئی اور تین طاقتوں نے اپنی سیاست کی بساط وہاں بچھا دی۔ روس۔ امریکہ۔ چین۔ مولانا بھاشانی چین کے لیے مفید نہ ہو سکے، جمیہ ابتداً امریکہ کے بال و پر لے کر چلا تھا اب روس کی سیاست بھی اس کے ساتھ ہو گئی کہ وہ چین کا حریف تھا۔

مشرقی پاکستان کا مغربی پاکستان سے کنٹ کے بگم دلش ہونا مضیج جمیہ الرحمن کے چھ نکات کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ مغربی پاکستان کے حکمران اور اُن کے دست پناہ سیاست دان اس نتیجہ کے لیے خود زمین تیار کر رہے تھے اور وہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی ہی سے اپنے مقتدر اعلیٰ ہونے کے خواب کی تعبیر دے سکتے تھے اور وہی ہوا۔

جس نقاب پوش جماعت نے اس مہم میں عالمی استعمار کے بلا واسطہ قہرے کی حیثیت سے حصہ لیا اُس کی تفصیلات

دراختیں ہیں اور آگے چل کر ان کا بڑا حصہ بیلن ہوگا۔ یاد رکھنے کی چیز یہ ہے کہ مشرقی پاکستان صرف اس لیے پاکستان سے الگ کرایا گیا اور علیحدہ کیا گیا کہ عالمی طاقتیں ہندوستان کی خواہش کو پروان چڑھ کر اپنا راستہ بنا رہی تھیں اور مغربی پاکستان کے حکمران سیاست دان (جو بھی تھے یا ہیں) اپنے اقتدار کا راسخاں کر رہے تھے۔

۷۔ سی آئی اے کسی ملک یا قوم میں اپنے مقاصد کے لیے کسی ایک کو آلہ کار یا گامشتہ نہیں بتاتی، وہ بیک وقت کئی افراد سے کام لیتی اور وہ افراد ایک دوسرے سے متصادم ہوتے ہیں۔ انہیں بسا اوقات یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ ایک ہی ایجنسی کے فرستادہ ہیں۔

۸۔ مغربی پاکستان — صرف پاکستان ہو کر رہ گیا۔ تو معلوم ہوا کہ بیاں ایک جماعت یا ایک فرد کا مالک و منتظر ہونا مشکل ہے کئی چیزیں اور بھی ہیں۔ اسی بڑے نمونے کا نتیجہ ہے کہ:

د۔ مغربی پاکستان عالمی طاقتوں کی متضارب خواہشوں کے نرغہ میں ہے۔

ب۔ پنجتہ نشین، بوجہ پستان اور کسی پیمانہ پر سندھ و دیش کا تصور آب و دانہ حاصل کرنے کی فکر میں ہیں۔

یہ وہ چیزیں ہیں جو حکمرانوں سے لے کر سیاست دانوں کے حلقے میں ہر روز گفت گو کے بیچ و خم میں زیر بحث آتی ہیں۔ "ایسا ہو سکتا ہے یا ایسا کبھی ہوگا" کی بحث سے قطع نظر جو چیز بھی ہے وہی خارجی خطرہ ہے اور اسی کے بال و پر ملک کی سیاسی فضا میں توانائی حاصل کر رہے ہیں۔

اس داخلی و خارجی خطرے نے پاکستان کے لیے موت و حیات کا سوال پیدا کر دیا ہے۔ حزب اقتدار + حزب اختلاف کے پیچھے پڑی ہوئی ہے کہ وہ اس کی طاقت چھیننا یا بانٹنا چاہتی ہے۔ رادھر حزب اختلاف نے حزب اقتدار کو چھٹاڑنا یا بچھاڑنا اپنا ملحقہ نظر بنالیا ہے، لیکن اصل خطرہ اور اس کے پس منظر پر کسی کی نگاہ نہیں اور اگر کسی کی نگاہ اس طرف جاتی ہے تو محاسبہ نہیں ہو رہا اور نہ کوئی اس خطرہ کے تعاقب کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔

اس معلوم حقیقت کے بعد کہ عالمی استعمار باقی ماندہ پاکستان کے حصے بخرے کرنے پر تڑپا ہوا ہے۔ سوال ہے وہ کونسی جماعت ہے جو اس سطح پر عالمی استعمار کی آلہ کار ہے۔ ظاہر ہے وہ کوئی ایسی جماعت ہی ہو سکتی ہے، جس کی تاریخی خصوصیت پر عالمی استعمار کو بھروسہ ہو۔ اور وہ ہیں احمدی — قادیانی۔

جب کبھی قادیانی اُمت کا احتساب کیا گیا گو اس احتساب کی عمر بہت تھوڑی ہے لیکن خود قادیانی مذہب کی عمر بھی زیادہ نہیں۔ میرزا صاحب نے ۱۸۵۷ء میں مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا پھر ۱۸۵۸ء میں اپنے نبی ہونے کا اعلان فرمایا گیا ۱۸۵۹ء میں ان کی نبوت کے ۳ سال ہوتے ہیں تو اس اُمت نے اپنے اقلیت ہونے کی پناہ لی اور دایلا کیا کہ اسے سوادِ عظیم ہلاک کرنا چاہتا ہے۔ ہندوستان میں برطانوی عہداری تک تو قادیانی اپنے لیے کوئی خطرہ محسوس نہ کرتے تھے۔ انہیں میرزا صاحب کے اہام کی رو سے اپنے خود کا شتمہ پودا ہونے کا احساس تھا اور وہ جانتے تھے کہ جس استعمار نے انہیں پیدا کیا وہی ان کا محافظ و پشتیبان ہے۔ پاکستان بنا تو وہ کوئی اہم اقلیت نہ تھے اہم مضر ضرور تھے۔ انہوں نے اولاً ہندوستان میں رہنے کی بہتری کو ششش کی ریڈ کلف کو اپنا الگ میوزنڈم دیا۔ سر فخر اللہ خاں نے پاکستان کی سرحدی ترجمانی کے علاوہ اس یادداشت کی ترجمانی کی۔ جب اس طسرح بات نہ بنی تو وہ قادیان میں تین سو تیرہ درویشوں کو چھوڑ کر پاکستان آگئے۔ پاکستان میں سر فخر اللہ خاں کی وزارت خارجہ ان کے لیے ایک سہارا ہو گئی۔ جن لوگوں کو سیاسی اقتدار منتقل ہوا تھا وہ قادیانیت کے مذہبی پہلو سے ناواقف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ قادیانی ان کے لیے کسی خطرے کا باعث نہیں ہو سکتے بلکہ حکومت سے وفاداری ان کی گنتی میں پڑی ہوئی ہے۔ جب پاکستان کی سیاست خواجہ ناظم الدین جیسے بزرگوں کے ہاتھ میں آگئی اور ان کی کابینہ میں وہ لوگ شامل ہو گئے جو سیاسی نہ تھے بلکہ برطانوی عہداری کے دنوں سے ملازم چلے آ رہے تھے تو قادیانیت اور محفوظ ہو گئی۔ ملک غلام محمد اور اسکند میرزا نے اس کو مزید محفوظ دیا وہ سب تھے کہ قادیانی پاکستان جیسے مذہبی ملک میں ایک ایسی اقلیت ہیں کہ ان کے خلاف کسی سازش یا منصوبہ میں شریک نہیں ہو سکتے بلکہ ان پر مقتدرین کے شخصی و حزبی تحفظ کا بار ڈالا جاسکتا اور سیاست و اعتماد کی جاسکتا ہے اس کے برعکس عام مسلمانوں کا اجتماعی مزاج یہ تھا کہ وہ کسی حالت میں بھی میرزا اُمت کے ساتھ مصالحت کے لیے تیار نہ تھے۔ غرض پانچ سال کے اندر اندر ۱۹۵۳ء کی تحریک نے قادیانیت کو ممنوعی اعتبار سے طہیٹ کر دیا۔ میرزائی تبلیغ کے دروازے بند ہو گئے۔ وہ نقاب اُتر گئی جو ان کے سیاسی منصوبوں پر مذہب کا پردہ بنی ہوئی تھی بظاہر میرزا ناصر احمد نے ابھی (الفضل ۱۳۱، ۱۴، ۱۵) دعویٰ کیا ہے کہ وہ دنیا میں ایک کروڑ ہیں اور پاکستان میں چالیس لاکھ، لیکن واقعہ یہ ہے کہ میرزائی نہ ایک کروڑ ہیں نہ ۴۰ لاکھ۔ اگر وہ پاکستان میں اس قدر ہیں تو حکومت سے اپنی گنتی کرا لینے کا مطالبہ کیوں نہیں کرتے؟ اور مردم شماری سے گریزاں کیوں ہیں؟

قادیانی اُمت کا تعاقب پہلی جنگ ۱۸۵۸ء کے اختتام تک مذہبی محاذ پر محدود رہا۔

پھر ۱۹۳۲ء تک محاسبہ مذہبی حدود میں پھیلتا گیا۔ چودھری افضل حق علی الرحمۃ نے سب سے پہلے ان کی سیاسی روح کا جائزہ لیا۔ علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے (۱۹۳۵ء) پنڈت جواہر لال نہرو کے جواب میں مضمون لکھ کر میرزا بنیت کو اس طرح بے نقاب کیا کہ مسلمانوں میں سیاسی طور پر یہ ذہنی فضا پیدا ہو گئی کہ میرزائیتوں سے دوستانہ یا تنہا بڑھانے والا اونچا طبقہ جس کی ذہنیت مغربی افکار کی آزادی سے مرعوب تھی، میرزا بنیت سے چونکا ہو گیا اور مسلمانوں کے عمرانی، سیاسی، تہذیبی، تعلیمی اور بڑی حد تک ان کے لیے بند ہو گئے۔ اس کے بعد وہ مسلمانوں سے مخالفت کا حوصلہ نہ رکھتے تھے۔ سر فخر اللہ خاں نے پاکستان بن جانے کے بعد خواجہ ناظم الدین کی مرضی کے خلاف کراچی میں اپنے جلسہ عام کو خطاب کرنا چاہا، لیکن عوامی احتجاج کی تاب نہ لا کر نوک دُم بھاگ گئے۔

قادیانی بحیثیت جماعت پاکستان اگر اپنے مستقبل کے بارے میں متذنب تھے، لیکن میرزا بشیر الدین محمود (خلیفہ ثانی) اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے کہ جو ناصر قادیانیت کے مخالف تھے۔ وہ تمام تحریک پاکستان میں شامل نہیں تھے، لہذا وہ پاکستان کے عوام میں متروک ہو چکے ہیں۔ اب اگر قادیانی اقتدار کی طرف قدم اٹھائیں یا تبلیغ کے لیے بڑھیں تو انہیں روکنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ بلوچستان کو احمدی صوبہ بنانے کا اعلان میرزا محمود کی اس غلط فہمی ہی کا نتیجہ تھا، لیکن مجلس تحفظ ختم نبوت کا مشترکہ محاذ کہہ لیجئے یا احرار ہی کے ذمہ لگا دیجیئے۔ بہر حال ۱۹۵۳ء میں میرزائی چاروں شانے چٹ ہو کر رہ گئے تب سے ان کی حیثیت ایک ایسے طائفہ کی ہو گئی جو بین الاقوامی بساط پر استعماری مہرے کی حیثیت سے کام کرتا اور پاکستان میں عالمی طاقتوں کے سامراجی مقاصد کی آبیاری کرتا ہے۔

قادیانی ہمیشہ سے یہ تاثر دیتے چلے آ رہے ہیں کہ انہیں ملائیم کے لوگ مذہب کے واسطے سے مارنا چاہتے اور ان کی گٹھنیں ہمزائیت کی جان، بال اور آبرو کے دشمن ہیں۔ اس تاثر کے عام دنیا با لصوص مغربی دنیا میں پھیل جانے کی واحد وجہ یہ ہے کہ پاکستان میں جو لوگ ان کا محاسبہ کر رہے اور ان کے خطرہ کی گھنٹی بجاتے ہیں وہ اکثر و بیشتر ترویپ کی زبانوں سے واقف ہیں نہ ان ممالک میں ان کے تبلیغی مشن ہیں اور نہ ان کے پاس مغربی دنیا سے بات چیت کرنے کے لیے طفرائندہ خاں جیسی کوئی استعماری شخصیت ہے اور نہ انہوں نے کبھی مغرب کے لوگوں کو قادیانی مسئلہ سمجھانے کا سوچا ہے۔

پاکستان میں مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ جب تک کوئی خطرہ ان کے سر پہ اگر مسط نہ ہو جائے تو وہ اس

کانوٹس نہیں بچتے۔ پھر اسلام کے نام پر جتنی عربی گالی سیاسی حریف کو دی جاتی ہے خود اسلام کے حریف کو اس طرح چتھاڑا نہیں جاتا بلکہ سرے سے باز پُرس ہی نہیں کی جاتی، الٹا یہ کہہ کر خاموشی اختیار کر لی جاتی اور خاموشی اختیار کرنے پر زور دیا جاتا ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلہ ہے۔

میرزائی اُمت کے شاطرین حد درجہ عیار ہیں۔ کوئی شخص اس پر غور نہیں کرتا کہ جب قادیانی ایک مذہبی اُمت بن کر اپنے سیاسی اقتدار کے لیے سعی و سازش کرتے ہیں تو وہ انہی بنیادوں پر اُس اُمت کے افراد کو اپنے محاسبہ کا حق کیوں نہیں دیتے؟ جس اُمت میں نقب لگا کر انہوں نے اپنی جماعت بنائی ہے عجیب بات ہے کہ قادیانی اُمت کا مذہبی محاسبہ کیا جاتے تو وہ سیاسی پناہ تلاش کرتے ہیں۔ سیاسی محاسبہ کریں تو وہ مذہبی اقلیت ہونے کا تحفظ چاہتے ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ یہ مذاق ناروا ہے کہ ایک ایسی جماعت جو اس کے وجود کو قطع کر کے تیار ہوئی ہے وہ اصل وجود کو اپنے اعضاء و جوارح کی حفاظت کا حق دینا نہیں چاہتی اور جو عارضہ اُن کو قادیانی میرطان کی شکل میں مار دینا چاہتا ہے اس کے علاج سے روکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں سے اپنے الگ ہونے کا اعلان سب سے پہلے خود قادیانیوں نے کیا۔ میرزا غلام احمد کو نہ مانتے والے کا فر قرار دیتے گئے۔ ان کے بچوں، عورتوں، معصوموں اور بوڑھوں کا جنازہ پڑھنے سے روک دیا گیا۔ انہیں زانیہ عورتوں کی اولاد، اکتیوں کے بچے اور ولدان نامک کہا گیا۔ مسلمانوں نے تو اس سے بہت دیر بعد محاسبہ شروع کیا اور انہیں اپنے سے خارج قرار دیا۔ جب میرزائی خود مسلمانوں سے الگ اُمت کہلاتے ہیں تو پھر انہیں مسلمانوں میں شامل رہنے پر اس وقت اصرار کیوں ہوتا ہے جب مسلمان ان کے الگ کر دینے کا مطالبہ کرتے اور انہیں اقلیت قرار دیتے ہیں، آخر کیا وجہ ہے کہ قادیانی مذہبی اور معاشرتی طور پر حقیدہ مسلمانوں سے الگ رہتے لیکن سیاست اُن کا پنڈ نہیں چھوڑتے۔ اس کے علاوہ جو اس کے سوا کچھ نہیں اس طرح وہ مسلمانوں کے حقوق و مناصب پر ہاتھ صاف کرتے اور اسی کی ریاست پر حکمران ہونا چاہتے ہیں یا پھر انہیں شاہکار اپنا سیاسی نقشہ مرتب کرنے کی جدوجہد میں ہیں۔

ایک خطرناک صورت حال جو ہمارے ہاں پیدا ہو چکی ہے یہ ہے کہ ہمارے مغرب زدہ طبقے نے جس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے سید سلیمان ندوی کو لکھا تھا کہ میں ڈکٹیٹر بن جاؤں تو سب سے پہلے اس طبقہ کو ہلاک کر دوں۔ ابھی تک نہ قادیانی مذہب کو سمجھنے کی ضرورت محسوس کی ہے کہ وہ خود مذہب سے بیگانہ ہو رہا ہے

اور نہ وہ قادیانی امت کے سیاسی عزائم کی مضرتوں سے آگاہ ہے وہ یہی سمجھتا ہے کہ ایک چھوٹی سی اقلیت کو مسلمانوں کے کٹ ٹاٹنگ کر رہے ہیں۔ وہ ان کی ہنگامی ڈاڑھی دیکھ کر اور ان کے تبلیغی اداروں کی روداد دیکھ کر انہیں مسلمان سمجھتا ہے، کیونکہ اُس کے اپنے ظاہری و باطنی وجود سے اسلام خارج ہو چکا ہے۔

ان لوگوں سے بجا طور پر سوال کیا جاسکتا ہے کہ مسلمان ایک وحدت کا نام ہیں اور یہ وحدت ختم نبوت کے تصور سے استوار ہوتی ہے۔ اگر کوئی اس وحدت کو توڑتا ہے اور ختم نبوت کی مرکزیت کو غلطی و بربادی کی آڑ میں اپنی طرف منتقل کرنا چاہتا ہے تو کیا اُس کا وجود خطرناک نہیں؟ باغی کون ہے؟ وہ یا محاسب؟ کیا اپنی قومی سرحدوں کی حفاظت کرنا مجرم ہے یا مذہبی جارحیت؟ بعض لوگ رواداری کا سبق دیتے ہیں لیکن وہ رواداری کے معنی نہیں جانتے اگر رواداری کے معنی غیرت، حمیت، عقیدے، مسلک اور اپنے شخصی یا اجتماعی وجود سے دستبردار ہو جانے کے ہیں تو یہ معانی کہاں ہیں؟ اور کس تحریک داعی، پیغمبر اور نظام نے بتلائے ہیں۔ قادیانیوں کے باب میں مسلمانوں کا معاملہ ذاتی نہیں اجتماعی ہے اور اس کے عناصر رابعہ میں غیرت، حمیت، عقیدہ و مسلک شامل ہیں۔

مسلمانوں کا مطالبہ کیا ہے؟ صرف اتنا کہ قادیانی جب مسلمانوں سے الگ ہیں تو وہ مسلمانوں میں رہتے کیوں ہیں؟ ہمارا اعراض ان کے پاکستان میں رہنے پر نہیں مسلمانوں میں رہنے پر ہے۔ وہ پاکستان میں رہنا چاہتے ہیں تو شوق سے رہیں۔ پھر اس کا فیصلہ وہ خود ہی کر لیں کہ مسلمانوں کے مسلمات کا استعمال ان کی ظل نبوت اور علیحدہ اقلیت کے حسب حال ہو گیا یا نہیں؟ اس سے مسلمانوں کی دل آزادی تو نہیں ہوتی؟ یہ کتنا کہ پاکستان میں کوئی جماعت یا تشفییت ان کی جان، مال اور آبرو کی دشمن ہے اور انہیں معدوم کرنے کی دہڑ میں لگا ہوتی ہے جیسا کہ آزاد کشمیر آہل کی اس سفارش پر کہ میرزائی خارج از اسلام اور علیحدہ اقلیت ہیں۔ میرزا انصاری نے داویلا کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہم سرترتیل پر لیے پھرتے ہیں اور وقت آنے پر دنیا دیکھ لیں گی کہ جان کیونکر دی جاتی ہے۔ یہ محض ماروں گھٹن پھوٹے آنکھ قسم کی اڑان گھاتی ہے، پاکستان میں کوئی شخص نہ ان کی جان کا دشمن ہے نہ مال کا اور نہ آبرو کا۔ اس قسم کی باتیں صرف کینہ لوگ کرنے اور کینہ لوگ اُچھالتے ہیں۔ ہم جو کچھ کہتے وہ یہ ہے کہ قادیانی امت ہمارے مطالبہ سے قطع نظر خود اپنے پیغمبر اور خلیفہ کی ہدایت و دعایت کے مطابق مسلمانوں سے الگ امت ہے تو پھر وہ سرکاری طور پر الگ کیوں نہیں ہو جاتی؟ اس طرح وہ محمد عربی کی امت میں سے غلام احمد کی امت تیار کرنا چاہتی اور عالمی استعمار کے مہرے کی حیثیت سے مسلمانوں کی وحدت کو پاش پاش

کر کے اپنے بچے ایک جمعی اسرائیل پیدا کرنے کی متنی ہے ۔

یہ غلط ہے کہ قادیانی مسئلہ SECTARIAN ہے جیسا کہ پاکستان کی حکومتیں اس غلط فہمی کا شکار رہی ہیں اور اب تک یہی سمجھتی ہیں ۔ قادیانی مسئلہ اپنی پیدائش سے اب تک پولیٹیکل ہے ۔ افسوس کہ مسلمانوں نے اس کا نوٹس بہت دیر میں لیا اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی سیادت جس مغرب زدہ اور آغوش اسلام سے معریٰ طبقے کے ہاتھ میں رہی ہے اُس نے استعمار کی ہر ضرورت کا ساتھ دیا اور دین سے ہر بغاوت کو نظر انداز کیا ہے اور اس کے ذہن کا پورا کارخانہ ابھی تک اسی نیچ پر قائم ہے ۔ اگر قادیانی مسئلہ صرف مذہب کا ہوتا تو علماء کا تعاقب کافی تھا ۔ قادیانی مسئلہ سیاسی مسئلہ ہے جس نے بتدریج ایک ایسی شکل اختیار کر لی ہے کہ وہ باطنیت ، اخلاقی الصفا اور باتینوں کی طرح اپنی زمین پیدا کرنے میں منہمک ہے ایسے معتزلہ کی تاریخ ہے ۔ قادیانی جانتے ہیں کس طرح معتزلہ نے اقتدار حاصل کیا اور کیونکر باطنیہ نے فاطمیہ سلطنت قائم کی ۔ وہ ان سب کے تاریخی تجربوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے جدید سیاسی نیچ پر اقتدار حاصل کرنا چاہتے اور اس زمانہ میں جب کہ انسان عالمی ہو گیا اور سیاست بین الاقوامی ہو گئی ہے ، ایک دوسرے پر انصار کے تحت مغربی استعمار کی بدولت پاکستان کو جمعی اسرائیل میں منتقل کرنا چاہتے اور افریقہ میں جزیرۃ العرب کے خلاف قادیانی اسلام کا استعماری سیل (CELL) بنانا چاہتے ہیں ۔ قادیانیوں کا سیاسی روپ اُسی صورت میں معلوم ہو سکتا اور سمجھ میں آ سکتا ہے جس صورت میں کہ ہم اس کے تاریخی ماخذ اور اُس کی عمومی رفتار سے واقف ہوں ۔

میرزا غلام احمد نے انگریزوں کی حمایت میں بہ قول خود پچاس الماریاں کھیں اور ان کی وفاداری میں نہ صرف قرآن سے جہاد کو منسوخ کیا ، بلکہ برطانیہ کے ہاتھوں شکست و ریخت پر چراغاں کیا اور یہی قادیانی امت کی تخلیقی غایت تھی ۔ اسس غرض ہی سے قادیانی فرقہ وجود میں لایا گیا اور برطانوی استعمار نے گود میں لیکر جوان کیا ۔

اس وقت میرے سامنے وہ کتاب نہیں ، مصنف اور کتاب کا نام بھی یاد نہیں آ رہا ۔ پاکستان کے ایک بڑے افسر ماریٹالے گئے ۔ پھر اپنی نظربندی کے باعث میں اُن سے کتاب واپس نہ لے سکا ، اس کتاب میں احمدیت کی افریقہ میں تک و پو کا جائزہ دیا گیا اور اس کے خط و خال بیان کئے گئے ہیں ۔ یہ کتاب میری یادداشت کے مطابق کیمبرج کے ایک پروفیسر نے لکھی اور اس میں بعض عجیب و غریب باتیں تحریر کی ہیں ۔ وہ لکھتا ہے کہ

پادریوں کی ایک نمائندہ جماعت نے برطانوی وزارت خارجہ سے شکایت کی کہ افریقہ میں مسیحیت کی تبلیغ کے راستہ میں قانونی مزاحم جوتے ہیں کیا وجہ ہے کہ ان قانونیوں کے تمام مشن برطانوی مقبوضات ہی میں ہیں اور وزارت خارجہ ان کی محافظت کرتی ہے۔ وزارت خارجہ نے جواب دیا سلطنت کے مقاصد تبلیغ کے مقاصد سے الگ ہیں۔ آپ اُن کا مذہب کی صداقت سے متبادل کیجئے، سلطنت کی طاقت سے نہیں۔ امور سلطنت کے مضمرات مختلف ہیں۔ اس راز کی گروہ ایک برطانوی و سناڈ پر دی ارا بتول آف برٹش ایسٹرن انڈیا "دربانوں سلطنت کی ہندوستان میں د" اُسے لکھتی ہے ۱۸۶۹ء میں انگریزوں نے برطانوی مدیروں اور مسیحی راہنماؤں کا ایک وفد اس بات کا جائزہ لینے کے لیے ہندوستان پہنچا کہ ہندوستان باشندوں میں برطانوی سلطنت سے وفاداری کا بیج کیونکر بویا جاسکتا اور مسلمانوں کو رام کرنے کی صحیح ترکیب کیا ہو سکتی ہے؟ اس زمانہ میں جہاد کی درج مسلمانوں میں خون کی طرح دوڑ رہی تھی اور یہی انگریزوں کے لیے پریشانی کا سبب تھا۔ اس وفد نے ۱۸۶۰ء میں دو رپورٹیں پیش کیں، ایک سیاست دانوں اور ایک پادریوں نے وہ مولانا نام کے ساتھ یکجا شائع کی گئیں اس مشترکہ رپورٹ میں درج ہے کہ:-

"ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت اپنے روحانی راہنماؤں کی اندھا دھند پیروی کا رہے۔ اگر اس وقت ہمیں کوئی ایسا آدمی ملتا جو اپنا سناٹا پرانٹ (سوامی نبی) ہونے کا دعویٰ کرے تو بہت سے لوگ اس کے گرد اکٹھے ہو جائیں گے، لیکن مسلمانوں میں سے ایسے کسی شخص کو ترغیب دینا مشکل نظر آتا ہے۔ یہ مسئلہ حل ہو جائے تو پھر ایسے شخص کی نبوت کو حکومت کی سرپرستی میں بہ طریق احسن پروان چڑھایا جاسکتا اور کام کیا جاسکتا ہے۔ اب کہ ہم پورے ہندوستان پر مابض ہیں تو ہمیں ہندوستانی عوام اور مسلمان جمہور کی داخلی۔ یعنی اور باہمی انتشار کو جو دینے کے لیے اسی قسم کے عمل کی ضرورت ہے:-

میرزا غلام احمد اس برطانوی ضرورت ہی کی استعماری پیداوار تھے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اس استعماری پیداوار کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "میرزا غلام احمد نے درحقیقت اسلام کے علمی و دینی ذخیرہ میں کوئی ایسا اضافہ نہیں کیا جس کے لیے اصلاح و تبدیلی کی تاریخ ان کی معرفت اور مسلمانوں کی نسل جدید اُن کی شکر گزار ہو۔ انہوں نے نہ کوئی دینی خدمت انجام دی جس کا نفع دنیا کے سارے مسلمانوں کو پہنچے۔ نہ وقت کے جدید مسائل میں سے کسی مسئلہ کو حل کیا، نہ ان کی تحریک موجودہ انسانی تہذیب کے لیے جو سخت مشکلات اور موت و حیات کی کشمکش سے دوچار ہے، کوئی پیغام

رکھتی ہے نہ اُس نے یورپ اور ہندوستان کے اندر تبلیغ و اشاعت کا کوئی کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس کی جدوجہد کا تمام تر میدان مسلمانوں کے اندر ہے اور اس کا مقصد صرف ذہنی انتشار اور غیر ضروری کشمکش ہے جو اس نے اسلامی معاشرے میں پیدا کر دی ہے۔ اسلام کی صحیح تعلیمات سے انحراف اور ان غلط فہمیوں و مجاہدین کی (جو ماضی قریب میں اس ملک میں پیدا ہوئے اور اسلام کے عروج اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لیے اپنا سب کچھ لٹا کر چلے گئے) ناقدری کی سزا خدا نے یہ دی کہ مسلمانوں پر ایک ذہنی طاعون کو مسلط کر دیا، اور ایک ایسے شخص کو ان کے درمیان کھڑا کر دیا جو اُمت میں فساد کا مستقل بیج بو گیا ہے۔

(تادیانیت از ابوالحسن علی ندوی صفحہ ۱۶۲۳، ۷۲۴)

میرزا غلام احمد کی خصوصیت اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ اُس نے :

- ۱۔ مسلمانوں میں اپنی نبوت و مسیحیت کا ڈھنگ رچا کر انتشار و تقسیم اور فساد پیدا کیا۔
- ۲۔ جہاد کی قرآنی تعلیم کو منسوخ کیا۔

۳۔ ہندوستانی اقوام میں باہمی فساد کی نیراٹھائی۔

۴۔ دینی لٹریچر میں سب و شتم کی بنیاد رکھی۔

۵۔ برطانوی حکومت کی نسبتاً بعد نسل و فساداری کو مذہبی عقیدہ کی الہامی سند مہیا کی۔

۶۔ محمد عربی کی اُمت میں سے اپنی امت پیدا کی جس نے اپنے زمانے والوں کو کافران کر مسلمانانِ عالم کے ابتلا و معائب سے لائق و متعلق اختیار کی حتیٰ کہ اُن کی شکست و ریخت پر خوشیاں منائیں اور برطانوی فتح و نصرت کو انکلماتِ ایزوی قرار دیا۔

ان کے فرزند میرزا محمود احمد (خلیفہ ثانی) نے تادیانی اُمت کو برطانوی خواہشوں کے محور و مرکز پر مسلّم کیا اور اسے ایک ایسی سیاسی تحریک بنا دیا جو برطانوی استعمار کی خدمت گزار اور اپنے حزبی اقتدار کی طلبگار ہو گئی۔ خلیفہ محمود رحلت کر گئے تو ان کے بیٹے خلیفہ ثالث میرزا ناصر نے دادا کے مشن اور باپ کے منصوبے کو ایسی شکل دی کہ آج وہ سب کچھ پاکستان کے لیے ایک سیاسی خطرہ بن چکا ہے۔

خوف طوالت کے پیش نظر ان تفصیلات کا ذکر بے سود ہو گا کہ میرزا غلام احمد کے والد میرزا غلام مرتضیٰ نے ۱۸۵۷ء میں مسلمانانِ پنجاب کے خون سے ہولی کھیل کر انگریزی سرکار کی خوشنودی اور اعتماد حاصل کیا۔ ان کے بڑے بھائی میرزا غلام تادار نے مشہور سفاک جرنل گلشن کی فوج میں شامل ہو کر

۴۔ نیو انٹرنی کے باغیوں کو تریو گھاٹ پر بموں ڈالا۔ ان باغیوں کو صرف گولی ہی سے نہیں اڑایا بلکہ ان کا مُشلہ کیا، انہیں درختوں سے باندھ کر اعصاب قطع کئے، انہیں چٹاؤں میں ڈالا، ان پر ہاتھی پھراتے ان کی ہانگیں چیر کر رقص سہل کا تماشا دکھایا۔

پس منظر کے طور پر یہ جان لینا ضروری ہے کہ میرزا ئی اُمت کا اصل کردار کیا رہا اور اُس نے تبلیغ کی آڑ میں برطانوی ملکیت کے لیے کہاں کہاں جاسوسی کے فرائض انجام دیئے۔ بالخصوص مسلمان ملکوں میں ان کے دُلو کا مقصد کیا تھا؟ کیا وہ مسلمانوں کو مسلمان بنانے کے لیے جزیرۃ العرب، افغانستان اور ترکی میں گئے تھے اور لب تک اسی بے افریقہ اسرائیل میں موجود ہیں۔

اسرائیل مسلمانوں کے قلب میں ناسور ہے۔ تقریباً تمام مسلمان ریاستوں نے اس کا مقاطعہ کر رکھا ہے۔ پاکستان وہاں نہیں، لیکن قادیانی مشن وہاں ہے۔ سوال ہے وہ کس پر تبلیغ کرتا ہے؟ مسلمانوں پر یا یہودیوں پر۔ آج جو چند مسلمان اسرائیل میں رہ گئے ہیں وہ قادیانی مشن کے استحصال کی زد میں ہیں۔ غور کیجیے جس اسرائیل میں مسیحا ئی مشن قائم نہیں ہو سکتا وہاں اسلام کے لیے قادیانی مشن لطیفہ نہیں ترکیب ہے؟ اس مشن سے جو کام لیے جارہے ہیں وہ ڈھکے چھپے نہیں تمام عالم عربی میں اس کے خلات اقتبا ج ہو چکا اور ہو رہا ہے، لیکن مشن جنوں کا توں قائم ہے۔

۱۔ اس مشن کی معرفت عرب ریاستوں کی جاسوسی ہوتی ہے۔ اس مشن کی وساطت سے حجاز و اردن کی نصائیہ کے پاکستان افسروں سے خبن میں کئی قادیانی ہوتے ہیں، وہاں کے راز حاصل کئے جاتے اور اسرائیل کو پہنچاتے جاتے ہیں۔

۲۔ اس مشن کی معرفت اسرائیل کے بچے کچے مسلمان عربوں کو عرب ریاستوں کی جاسوسی کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔

۳۔ اس مشن کی معرفت پاکستان کی اندرونی سیاست کے راز لیے جاتے اور اسلام و دوتنوں سے متعلق مطلوبہ خبریں حاصل کی جاتی ہیں۔

۴۔ اس مشن کی معرفت پاکستان میں عالمی استعمار اور یہودی استحصال کی راہیں قائم کی جاتی ہیں اور سیاسی نقشے در آمد برآمد ہوتے ہیں۔ خود صدر بھٹو پاکستان میں تل ابیب کی سیاسی مداخلت اور صہیونی سرمایہ کی زمانہ انتخاب میں آمد کا انکشاف کر چکے ہیں۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ تل ابیب کا سرمایہ پاکستان کے تمام

انتخابات میں مقامی میرزائیوں کی معرفت اسی مشن کی وساطت سے آیا تھا اور کیمیا کے زمانہ میں اکثر وزراء نے خود راقم الحروف سے اس کی روایت کی تھی۔

۵۔ پاکستان کو اس وقت جو خطرہ درپیش ہے اُس میں قادیانی اُمت اور تل ایب کا گٹھ جوڑ عالمی استعمار کی مخفی خواہشوں کو معرض وجود میں لانے کا ذریعہ (Link) بن چکا ہے۔

پاکستان میں اسلام کے خلاف ۱۹۷۰ء کے جنرل ایکشن میں جو سب سے بڑی ذمہ داری بنادت ہوئی اُس کے منظم قادیانی تھے جو اسرائیل کے حسب ہدایت کام کر رہے تھے۔ یہ کوئی مفروضہ نہیں کھل حقیقت ہے اور پیش آمدہ واقعات کا تسلسل اس کی تصدیق کرتا ہے۔ پھر یہ کوئی نئی چیز نہیں قادیانی اُمت شروع ہی سے اس قسم کے مشن قائم کرنے کی عادی ہے۔ مثلاً میرزا محسود نے شاہ مسود اور شریف مکہ کی آویزش کے زمانہ (۱۹۶۱ء) میں اپنے ایک مرید میر محمد سعید حیدر آبادی کو مکہ بھیجا۔ وہاں اس نے ادنیٰ پونے راز اٹھائے اور آگیا۔ اسی طرح ترکی میں دو قادیانی مصطفیٰ صغیر کی ٹیم کا رکن ہو کر گئے۔ ایک ثقہ روایت کے مطابق مصطفیٰ صغیر خود قادیانی تھا اور مصطفیٰ کمال کو قتل کرنے پر مامور ہوا تھا، لیکن قبل از اقدام پکڑا گیا اور موت کے گھاٹ اُتارا گیا۔

میرزا محمود احمد کے سائے میں جبریل اللہ شاہ فوج میں ڈاکٹر تھے وہ پہلی جنگ عظیم میں بحری ہو کر عراق گئے۔ انگریزوں نے بغداد فتح کیا تو انہیں ابتداً گورنر نامزد کیا۔ ان کے بڑے بھائی دل اللہ زین العابدین جو قادیان میں امور عامہ کے ناظر رہے، عراق میں قادیانی مشن کے انچارج تھے، لیکن فیصل نے ان کی سرگرمیوں سے آگاہ ہوتے ہی نکال دیا۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے وہاں ان کے ٹیکے رہنے پر زور دیا، لیکن عراق گورنمنٹ نے ایک زمانی۔

غالباً ۱۹۲۷ء میں مولوی جلال الدین شمس کو شام بھیجا گیا۔ وہاں کے حریت پسندوں کو پتہ چلا تو قاتلانہ حملہ کیا۔ آخر تاج الدین اسکی کابینہ نے شام بدر کر دیا۔ جلال الدین شمس فلسطین چلا گیا اور ۱۹۳۱ء تک برطانوی انتداب کی حفاظت میں عرب ملکوں میں مالی استعمار کی خدمت بجالاتا رہا۔ جب تک برطانیہ ہندوستان میں حکمران رہا اُس نے روس کو اپنے لیے خطرہ سمجھا۔ اس عنصر سے مختلف بادوں میں مختلف مشن، روس (وسط ایشیا کے اسلامی ممالک) میں بھجوائے۔ بالخصوص اُن علاقوں میں جو ہندوستان کی سرحد کے ساتھ آباد تھے اور روس کو وہاں اقتدار حاصل تھا۔ اس غرض سے پنڈت موہن لال، پنڈت من

پھل، مولوی فیض محمد، بھائی دیوان سنگھ اور مولوی غلام ربانی کے سفر نامہ کی بعض جھلکیاں عام ہو چکی ہیں مگر محمد حسین آزاد کے نواسے آغا محمد باقر نے اپنے نانا کے سفر کو اسی نوعیت کی جا سوسے قرار دیا ہے۔ ادھر ۱۹۱۲ء میں مولوی محمد امین قادیانی ایران کے راستہ روس گئے انہیں روس میں داخل ہوتے ہی پکڑ لیا گیا وہ دو سال جیل میں رہا، لیکن واپس آنے کے کچھ عرصہ بعد میرزا محمود نے ایک اور نوجوان مولوی منظور حسین کے ساتھ انہیں واپس بھجوا دیا چونکہ پاسپورٹ نہیں تھے اس لیے ایران کے راستہ داخل ہوتے، لیکن پکڑ لیے گئے۔ پہلے مولوی محمد امین لٹے پھر مولوی منظور حسین۔ قید و بند کے مرحلے گزار کر برطانوی سبزی کی مداخلت سے رہا ہوئے اور واپس آ گئے۔

افغانستان میں نعمت اللہ قادیانی کو جولائی ۱۹۲۴ء میں پکڑا گیا۔ اس پر جا سوسی امداد و ثبات ہو گیا تو سنگسار کر دیا گیا۔ فروری ۱۹۲۵ء میں دواہ قادیانی ملا عبد الحلیم اور ملا نور علی کو اسی جرم میں موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ افغانستان اور پاکستان میں تعلقات کی کشیدگی کا ایک سبب ابتداً سر فخر اللہ خاں تھے جہان نین قادیانیوں کے قتل پر افغانی سفیر مقیم برطانیہ کو عذاب خداوندی کی وعید دے چکے اور تب سے افغانستان کے خلاف تھے۔ دوسری وجہ میرزا محمود خود تھے کہ وہ افغانستان کے لیے اور افغانستان اٹھکے لیے ناقابل قبول تھا۔ افغانستان کا ہر اہلکار اُن کے نزدیک بددعا کا مظہر تھا۔

برطانوی ہندوستان میں بھی میرزائی امت کا شمار تھا کہ ان کے جو افراد پولیس میں بھرتی ہوتے وہ عموماً سی آئی ڈی میں پے جاتے یا انگریز انہیں چُن چُن کے سی آئی ڈی میں لے لیتا جہاں انہیں ہندو قتل سکھوں اور مسلمانوں پر کوئی سا ظلم توڑتے ہوئے رتی بھر حیا سمیٹ نہ ہوتی بلکہ ہر ظلم کو اپنے زرائع کا حصہ سمجھتے۔ پنجاب میں سی آئی ڈی کا محکمہ برطانوی حکومت کے لیے ریڑھ کی ہڈی رہا، اس محکمہ کے لیے میرزائی افراد نے برطانوی استعمار کی جو خدمات انجام دیں وہ کوئی انگریز افسر بھی انجام نہ دے سکتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ تقریباً ہر اسلامی ملک میں قادیانیوں کے خلاف حکومت اور عوام دونوں سطح پر ذہنی احتساب موجود ہے، لیکن جہاں قومی آزادی طاقتور ہے اور اس کا وجود عالمی استعمار کے زخموں سے محفوظ ہے وہاں قادیانی مشن نہ کبھی تھے نہ اب ہیں۔ مثلاً مصر، ترکی، افغانستان، شام، جہاز، عراق، مشرق وسطیٰ، انڈونیشیا وغیرہ میں قادیانی مشن نہیں، ایران، پاکستان، مصر، ہندوستان کے ساتھ ہمارے روابط یکہائی کے ہیں، لیکن قادیانی ادھر سے کٹے نہیں کرتے۔ کیا وہاں انجام نظر آتا ہے یا عالمی استعمار کے ہتھکنڈے نہیں۔

۱۹۵۳ء کی پاکستان فراغت کے بعد بالعموم اور پہلے تین سالوں میں بالخصوص قادیانی امت نے اپنے سیاسی ہتھکنڈے تبدیل کر لیے ہیں اور اب عالمی استعمار کی جاسوس امت کے طور پر افریشیائی ممالک سے خفیہ معلومات فراہم کر رہے ہیں۔ تل ابیب (حیفا) میں ان کا مشن گروپ پیش کی عرب دنیا کے خلاف جاسوسی کام کر رہے ہیں۔ اس باب میں دمشق کے ایک مطبوعہ رسالہ القادینہ سے ان کے سیاسی خط و خال اور استعماری فرائض و مناصب کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ ”کسی بھی عرب مسلمان ریاست میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں بلکہ ان کے وجود کی بدولت پاکستان کو عربوں میں ہڈت بنایا جاتا ہے۔“ ذیل کا واقعہ رسالہ میں مذکور ہے کہ:

”پہلی جنگ عظیم کے وقت انگریزوں نے ولی اللہ زین العابدین (میرزا مسعود احمد کے سائے) کو سلطنت عثمانیہ میں بھیجا۔ وہاں پانچویں ڈویژن کے کمانڈر جمال پاشا کی معرفت قدس یونیورسٹی (۱۹۱۴ء) میں دینیات کا لیکچرر ہو گیا، لیکن جب انگریزی فوجیں دمشق میں داخل ہوئیں تو یہی ولی اللہ اپنا جامہ اتار کر انگریزی لشکر میں آگیا اور عربوں کو ترکوں سے لڑانے بھڑانے کی مہم کا انچارج رہا۔ عراق اس سے واقف ہو گئے تو بھاگ کر قادیان آگیا اور ناظر امور عامہ بنایا گیا۔“

اب قادیانی امت کی استعماری تکنیک (STRATEGY) یہ ہے کہ وہ استعمار کے حسب مشا پاکستان کی ضرب تقسیم میں حصہ لے کر سکھوں کے ساتھ پنجاب کو ایک علیحدہ قادیانی ریاست بنانا چاہتی ہے اس غرض سے عالمی استعمار اس کی پشت پناہی کر رہا اور وہ اس کے لیے مختلف ملکوں میں جاسوسی کے فرائض انجام دے رہی ہے۔ اس کی جاسوسی کا جال وسیع ہو گیا ہے۔ اس غرض سے اُس نے اسرائیل کے گروپ پیش جوازداروں میں نضائیہ وغیرہ کی تربیت کے لیے صرف قادیانی پائلٹ بھجواتے ہیں بلکہ ان ملکوں میں استعماری کامروار جاری رکھنے کے لیے ہر سال ڈاکڑوں، انجینئروں اور نرسوں کی ایک بڑی کھیپ جارہی ہے۔ پاکستان میں کوشش کر کے ان بڑے ہسپتالوں میں میڈیکل پرسنل قادیانی ٹھکانے جارہے ہیں جہاں ہر سال نرس روٹیاں بھرتی کی جاتی ہیں، چنانچہ لاہور کے میوہسپتال کا میڈیکل پرسنل قادیانی ہی ہے۔ جنہو قادیانی مقرر ہوئے ہیں۔ واضح رہے کہ میوہسپتال لاہور پشاور سے لیکر حیدرآباد تک نرسوں کا سب سے بڑا تربیتی مرکز ہے۔ اس پس منظر میں جمہور کے لیے پوری قادیانی شہینے نے زور دیکر یہ جگہ حاصل کی ہے۔

اُدھر یہ بات ڈھک چھپی نہیں کہ میرزائی پاکستان بننے پر خوش نہ تھے اور نہ پاکستان بننے کے حق میں تھے میرزا محمود نے پاکستان بننے سے تین ماہ پہلے خطبہ دیا تھا ملاحظہ ہو الفضل ۱۶ مئی ۱۹۴۷ء -

"ہندوستان کی تقسیم پر اگر ہم رضامند ہوتے ہیں تو خوشی سے نہیں بلکہ مجبوری سے اور پھر یہ کوشش کریں گے کہ یہ کسی نہ کسی طرح پھر متحد ہو جائے"

۵۔ اگست ۱۹۴۷ء کے الفضل میں خلیفہ ثانی کی ایک دوسری تقریر درج ہے فرماتے ہیں۔

"بہر حال ہم چاہتے ہیں کہ اکھنڈ ہندوستان بنے اور ساری قومیں باہم شیردھنکر

ہو کر رہیں؟

میرزا صاحب نے قادیان میں رہنے کے بہترے جتن کئے۔ کوشش کی کہ پاپائے روم کے مقدس شہر وٹیکن کا مقام قادیان کو مل جائے، لیکن جب کوئی سی بیل منڈے نہ چڑھی تو ایک انگریز کرنل کی رپورٹ پر حواس باختہ ہو کر کیپٹن عطار اللہ کی معیت میں بھاگ کر لاہور آ گئے۔ میر جنرل نذیر احمد آپ کے ہر طرف تھے ان کے ساتھ جیب میں سوار ہو کر نکلنے کا پروگرام تھا، لیکن سکوں کی مار دھاڑ کے خوف سے قبل از وقت نکل آئے اور چوری چھپے جان بچائی۔ یہاں پہنچ کر میرزا صاحب نے قادیان میں مراجعت کے رویہ اور خواب بیان کرنا شروع کئے اور یہ پروگرام بنایا کہ

۱۔ تقسیم کی مخالفت قوتوں سے گٹھ جوڑ کر کے قادیان کسی نہ کسی طرح حاصل کیا جائے۔

۲۔ کشمیر کے کسی حصے پر اقتدار حاصل کیا جائے۔

۳۔ پاکستان کے کسی علاقے کو قادیانی صوبہ میں تبدیل کیا جائے۔

بظاہر تین مختلف اور شاید ایک نازک حد تک متخالف "نماذ" تھے، لیکن اصل حصول اقتدار کا ایک

مربوط سلسلہ تھا جو میرزا محمود احمد کے ننان خانہ دماغ میں پردریش پارہا تھا۔

جسٹس منیر نے ۱۹۵۳ء کے واقعات سے متعلق مسلمانوں سے میرزائیوں کی نزاع پر جو رپورٹ لکھی ہے

اس کے صفحہ ۱۹۶ پر درج ہے کہ:

"۱۹۴۵ء سے لے کر ۱۹۴۷ء کے آغاز تک احمدیوں کی بعض تحریروں سے منکشف

ہوتا ہے کہ وہ برطانیہ کا جانشین بننے کے خواب دیکھ رہے تھے وہ نہ تو ایک ہندو دنیاوی

حکومت یعنی ہندوستان کو اپنے لیے پسند کرتے تھے اور نہ پاکستان کو ممتنع کر

کہتے تھے :

انفصل ۲۵ دسمبر ۱۹۳۲ء ملا خطہ ہو، خلیفہ صاحب فرماتے ہیں :-

"ملکی سیاست میں خلیفہ وقت سے بہتر اور کوئی راہنمائی نہیں کر سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت اس کے شامل حال ہوتی ہے"

۴۔ جون ۱۹۴۰ء کے انفصل میں :

"نہیں معلوم کب خدا کی طرف سے ہیں دنیا کا چارج سپرد کیا جاتا ہے ہیں اپنی طرف سے تیار رہنا چاہیے کہ دنیا کو منبھال سکیں؟

بہر اُس وقت میرزائی امت کے خیالات تھے جب ہٹلر نے برطانیہ کو ہلا ڈالا تھا اور میرزائی دیکھ کر دلوں پر قبضہ کرنے کی تیاری میں تھے۔ اس ضمن میں مائٹر تاراسنگھ کا مضمون ہفتہ وار اکالی سے مختلف جرائد میں نقل ہو چکا ہے۔ مائٹر جی نے لکھا تھا کہ برطانیہ نے ہندوستان چھوڑا تو سکھ ریاستوں بالخصوص مہاراجہ پٹیالہ کی مدد سے پنجاب میں ہم نے اتنی تیاری کر لی ہے کہ اُس کے جانشین ہو سکیں اور سکھوں کا یہ صوبہ سکھوں کی عملداری میں ہو۔

اس سے پہلے ۱۴ فروری ۱۹۲۲ء کے انفصل میں خلیفہ صاحب کی تقریر ہے -

"ہم احمدی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں"

مزید ملاحظہ ہو،

"اُس وقت تک کہ تمہاری بادشاہت قائم نہ ہو جائے تمہارے راستے سے یہ کانٹے ہرگز دُور نہیں ہو سکتے"

(انفصل ۸ جولائی ۱۹۳۵ء)

میرزا یسویں نے اپنی جماعت کے ۸۳ برس میں مسلمانوں کے کسی ابتلا و کسی تحریک، کسی اُفتاد اور کسی مصیبت میں کبھی حصہ نہیں لیا۔ ہمیشہ مسلمانوں سے الگ تھلگ اور انگریزوں کی مرضی کے تابع رہے، لیکن ریاست کشمیر کے مسلمانوں کی ہمدردی کے نام پر انہوں نے جولائی ۱۹۳۱ء میں آل انڈیا کشمیر کمیٹی کا کھڑاگ دھپایا اور آج تک صرف کشمیر ہی کا ذکر چھڑتے ہیں۔ کیا مسلمانوں کے مصائب کشمیر کے سوا اور کسی خطہ میں نہ تھے، کیا صرف کشمیر کے مسلمان ہی مسلمانانِ عالم میں ہمدردی کے مستحق تھے اور کیا ریاست کشمیر کی آزادی ہی عالم اسلام کی

دیپانیوں کا مستند اول ہے؛ اگر قادیانی کشمیر کے معاملہ میں اسلام اور مسلمانوں کی خاطر غلطی جوتے تو اس کا اعتراف نہ کرنا بخل جوتا بلکہ شقاوت کے مصداق، لیکن معاملہ دوسرا تھا۔ میرزائی کشمیری مسلمانوں کی سادہ فطرت سے واقف تھے کہ وہ مذہبی سٹہ بازوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اِدھمہ قادیان اور جموں متصل علاقے تھے۔ اُدھر میرزائی جس قادیانی ریاست کا خواب دیکھتے تھے اس کی تعبیر کے لیے جموں و کشمیر حسب حال تھے۔

پاکستان نے اپنی آزادی کے تیسرے بیسے اکتوبر، ۱۹۴۷ء میں کشمیر کا مطالبہ کیا تو اس جنگ میں قادیانی امت نے انفعول کو دپڑی، اس نے فرقان بٹالین کے نام سے ایک پلاٹن تیار کیا جو سیالکوٹ کے نزدیک جموں کے محاذ پر واقع گاؤں مہرا کے میں متعین کی گئی۔ اس نے وہاں کیا خدمات انجام دیں؟ اس کے تذکرہ و انشاء کا عمل نہیں لیکن اس وقت پاکستان کے کانڈرا انچیف جنرل مرڈگلس گریسی تھے جن کے متعلق معلوم ہو چکا ہے کہ وہ پاکستان کی فوج کو کشمیر میں استعمال کرنے کے خلاف ہیں اور نہ شخصی طور پر کشمیر کی لڑائی کے حق میں تھے بلکہ ان کی معرفت بعض معلومات ہندوستان کے کانڈرا انچیف جنرل مراکن ایک ٹنگ پینٹی گئیں۔ قائد اعظم اس وقت سرطان کے مرض میں مبتلا تھے۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا تو ان کا مرض شدید ہو گیا۔

کسی کانڈرا انچیف نے کسی انزا و ادارے کی ایسی بٹالین پر کبھی صاد نہیں کیا، جیسا کہ فرقان بٹالین تھی، فرقان بٹالین کو یہ شرف بخشا گیا کہ جنرل گریسی نے بطور کانڈرا انچیف تحسین و ستائش کا خط و پیغام لکھا جو تاریخ احمدیت جلد ششم مؤلفہ دوست محمد شاہد کے صفحہ ۴۷ پر موجود ہے۔

بات معمولی ہے لیکن عجیب ہے کہ کشمیر کے محاذوں کی جنگ میں قادیان سے ملحق سرحدات کی کمان ہمیشہ میرزائی جرنیلوں کے ہاتھ میں رہی ہے، چونکہ یہ ایک فوجی عمل ہے لہذا اس کا ذکر مناسب نہیں، لیکن سوال ہے کہ فرقان بٹالین ہوا اس کے بعد ۱۹۴۵ء کی جنگ جو کشمیر سے شروع کی گئی کہ وہاں محصب اور جوڑیاں کا کاماڈ پٹھا ٹھکانٹ اور قادیان کی طرف تھا۔ ابتداً ان محاذوں کی کمان جنرل اختر ملک اور بریگیڈیر عبدالعلی ملک کے ہاتھ میں تھی جو گئے بھائی ہونے کے علاوہ قادیانی العقیدہ تھے۔ جنرل اختر ملک ترکی میں وفات پا گئے۔ ان کی نعش وہاں سے ریلوے لائی گئی جہاں ہشتی مقبرے سے باہر ہمیشہ کی نیند سوس رہے ہیں۔ پنجاب میں پانچویں اور چھٹی جماعت کی تاریخ و جغرافیہ کے نصاب میں ۱۹۴۵ء کی جنگ کا ہیرو جنرل اختر ملک اور بریگیڈیر عبدالعلی کو بتایا گیا اور اول الذکر کی سرنگی تصویر شامل کی گئی ہے۔

ایک دوسری تصویر جنرل ابرار حسین کی بھی ہے، لیکن ۱۹۶۵ء کی جنگ کو اس طرح محدود کرنا اور صرف جنرل اختر حسین ملک یا بریگیڈیئر عبدالملک کا ذکر کرنا میرزائی اُمت کا پنجاب میں نئی پود کو ڈھنسا اپنی طرف منتقل کرنے کا شکستہ ڈھانچہ ہے۔ عزیز بھٹی وغیرہ کو نظر انداز کر کے اور اُس وقت کے آتش بھانوں کے سر سے گزر کر جنرل اختر ملک کو قومی ہیرو بنانا اور پڑھانا قادیانی سیاست کی شرفی ہے جو حصول اقتدار کی آئندہ کوششوں میں رنگ و روغن کا کام دے گی۔

بات سے بات نکلتی ہے۔ جنرل اختر ملک کے تذکرے کی رعایت سے اس ضمن کی دو باتیں ملاحظہ میں اور تازہ ہو گئیں۔

۱۔ نواب کالا باغ نے ۱۹۶۵ء کی جنگ کے واقعات پر گفتگو کرتے ہوئے راقم سے بیان کیا کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں اللہ تعالیٰ نے ہماری محافظت کی ورنہ صورت حال کے پامال ہونے کا احتمال تھا۔

نواب صاحب نے فرمایا، میرزائی پاکستان میں حصول اقتدار سے مایوس ہو کر قادیان پہنچنے کے لیے مضطرب ہیں۔ وہ بھارت سے مل کر یا بھارت سے ہر صورت میں قادیان چاہتے ہیں اور اس غرض سے پاکستان کو بازی پر لگانے سے بھی نہیں چوکتے۔ ایک دن میرے ہاں جنرل اختر حسین ملک آئے اور میرے ملٹری سیکریٹری کرنل محمد شریف سے کہا کہ میں نے جنرل ملک سے اگر ملاقات کی تو صدر ایوب جو مجھ سے پہلے ہی بدظن ہو چکے ہیں اور بدظن ہوں گے اور یہ حسن اتفاق ہے کہ میں بھی اعوان ہوں، جنرل ملک بھی اعوان ہے اور تم (ملٹری سیکریٹری) بھی اعوان ہو، صدر ایوب کے کان میں الطاف حسین (ڈان) نے بات ڈال رکھی ہے اُس سے کسی امریکن نے کہا ہے کہ نواب کالا باغ ایوب خاں کے خلاف اندر خانہ خود صدر بننے کی سازش کر رہا ہے۔

اُس وقت تو جنرل ملک لوٹ گئے، لیکن چند دن بعد تنہیا گل میں ملاقات کا موقع پیدا کر لیا، کئے گئے۔ میں صدر ایوب کو آلودہ کر دیا کہ یہ وقت کشمیر پر چڑھائی کرنے کے لیے بہترین ہے۔ یقین ہے کہ کم کشمیر حاصل کر پائیں گے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ بیٹھے بٹھاتے جنرل کو یہ کیا سر جھی بہر حال میں نے مذکر کر دیا کہ میں نہ تو فوجی ایکسپٹ ہوں نہ مجھے جنگ کے مبادیات کا علم ہے۔ آپ خود ان سے تذکرہ کریں۔ انہوں نے کہا کہ صدر نہیں مانتا۔ وہ کہتا ہے کہ اس لڑائی کے جلد بعد بھارت براہ راست پاکستان کی بین الاقوامی سرحدوں پر حملہ کرے گا۔

میں نے کہا، صدر مجھ سے پہلے ہی بدگمان ہے۔ وہ لازماً خیال کر گیا کہ اعوان اُس کے خلاف کوئی سازش کر رہے ہیں۔

جنرل اختر ملک مجھ سے جواب پا کر چلے گئے۔ اس آٹنا میں سی آئی ڈی کی معرفت مجھے ایک دستی اشتہار ملا جو آزاد کشمیر میں کثرت سے تقسیم کیا گیا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ ریاست جموں و کشمیر انٹرنیشنل آزاد ہوگئی اور اس کی فتح و نصرت احمدیت کے ہاتھوں ہوگی۔

(پیش گوئی مصلح موعود)

اور میرے لیے یہ ناقابل فہم نہ تھا کہ جنرل اختر ملک اس پیش گوئی کو سچا بنانے کے لیے دھڑ دھوپ کر رہے تھے۔

راقم نے نواب کالا باغ کی یہ گفتگو محترم مجید نظامی ایڈیٹر نوائے دقت کو بیان کی تو انہوں نے تائید کی کہ اُن سے بھی نواب صاحب یہی روایت کر چکے ہیں۔

۲۔ ڈاکٹر جاوید اقبال سے ذکر آیا تو حیران ہوتے فرمایا کہ اس جولائی میں سر فخر اللہ خاں نے مجھے امریکہ میں کہا تھا کہ میں صدر ایوب کو پیغام دوں کہ یہ وقت کشمیر پر چڑھائی کے لیے موزوں ہے، پاکستانی فوج فرد کا سیاب ہوگی جہاں تک ہندوستان کے ہاتھوں بین الاقوامی سرحد کے آلودہ ہونے کا تعلق ہے۔ ایسی کوئی چیز نہ ہوگی۔ میں نے صدر ایوب سے ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا، مجھ سے کہہ دیا ہے اور کسی سے نہ کہنا۔

صدر ایوب کو سر فخر اللہ خاں نے پیغام دے کر اور جنرل اختر ملک نے خود حاضر ہو کر علاوہ دوسرے زعماء کے یقین دلایا تھا کہ کشمیر پر حملہ کرنے سے بھارت اور پاکستان میں براہ راست جنگ نہ ہوگی، لیکن پاکستانی فوجیں جب کشمیر کی طرف بڑھنے لگیں تو پاکستان کی بین الاقوامی سرحدیں ایکایک بھارتی فوج کے حملہ کا شکار ہو گئیں۔ واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کو ہندوستان کے تابع کرنے اور اس کی جغرافیائی ہیئت کو نئی صورت دینے کے لیے عالمی اشتہار کا جو منصوبہ تھا اس کو پروان چڑھانے کے لیے پاکستان کے بعض پراسرار لیکن منفی و معلوم ہاتھ بھی تھے۔ قدرت نے اشتہاری منصوبہ خاک میں ملا دیا۔ منصوبہ یہ تھا کہ مغربی پاکستان میں پنجاب کو بالواسطہ یا بلاواسطہ شکست ہو تو پاکستان کا عسکری بازو ٹوٹ جائے گا اور مشرقی پاکستان قیام الگ ہو جائے گا۔ پنجاب کی پسائی کے بعد سرحد، بلوچستان اور سندھ بلاق

ریاستوں یا عرب ریاستوں کی طرح چھوٹی چھوٹی ریاستیں بن جائیں گے۔

کشمیر اور احمدیت کے بارے میں اس سے پہلے یہ بات مسطور بالا میں رہ گئی ہے کہ قادیانی امت نے ترکیب کشمیر (قبل از آزادی) اور جنگ کشمیر (بعد از آزادی) میں صرف اس لیے حصہ لیا کہ میرزا بشیر الدین مسعود جس قادیانی ریاست کا خواب دیکھتے تھے ان کی نگاہ میں کشمیر ہر لحاظ سے موزوں تھا۔ جماعت احمدیہ کی کشمیر سے دلچسپی کا سبب دوست محمد شاہ نے تاریخ احمدیت جلد ششم صفحہ ۴۷۵ تا ۴۹۲ میں میرزا محمود کی روایت سے لکھا ہے کہ:

- ۱- وہاں مسیح اول دفن ہیں اور مسیح ثانی (غلام احمد) کے پیروؤں کی بڑی جماعت آباد ہے۔
 - ۲- وہاں تقریباً اتنی ہزار احمدی ہیں۔
 - ۳- جس ملک میں دو مسیحوں کا دخل ہو اس ملک کی فرمانروائی کا حق احمدیوں کو پہنچتا ہے۔
 - ۴- ہمارا جبر بنیت سنگھ نے نواب امام الدین کو گورنر بنا کر کشمیر بھیجا تھا تو ان کے ساتھ میرزا غلام احمد کے والد بطور مددگار گئے تھے۔
 - ۵- حکیم نور الدین خلیفہ اول میرزا محمود کے استاد اور غمیر شاہی حکیم کے طور پر کشمیر میں ملازم رہے تھے۔
- ان نکات ہی کو ملحوظ رکھا جائے تو ظاہر ہے کہ قادیانی امت کی کشمیر سے ہمدردی کسی عام انسانی مسئلہ یا عام مسلمانوں کی ہمدردی کے جذبہ سے نہیں تھی نہ ہے بلکہ وہ اپنے شخصی تعلق اور حزبی مفاد کے لیے پورے پاکستان اور تمام مسلمانوں کو استعمال کرتے رہے ہیں۔

بلوچستان کو احمدی ریاست بنانے کا خواب پراگندہ ہو گیا۔ (اس کے لیے ہم شاہ ایران کے بھی نمبر گزار ہیں) ادھر کشمیر سے متعلق ۱۹۴۸ء اور ۱۹۶۵ء کی دونوں مہمیں بے نتیجہ رہیں۔ ادھر ۱۹۶۵ء کے بعد بڑے عظیم سے متعلق عالمی استعمار نے کاٹا بدلا۔ قادیانی امت کا اس کے ساتھ بدلتا ایسا ہی تھا جیسے انجن مڑتے ہی گاڑی مڑ جاتی ہے۔ اب پاکستان کو دنیا میں ترقی کی استعماری کوششوں میں سے ایک کوشش یہ تھی کہ:

- ۱- مشرقی پاکستان کو الگ کیا جائے۔ قادیانی عقائد نے وہ سب کچھ کیا جو اس کے لیے ضروری تھا۔ انہوں نے مشرقی پاکستان کے لیے شکایات کو جنم دیا۔ پھر پروان چڑھایا۔ ایم ایم احمد نے حکومت پاکستان کے ننانس سیکرٹری ہالی شیر اور منصوبہ بندی کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین کی حیثیت سے بنگالیوں کو اتنا بے بس

اور بیزار کر دیا کہ وہ علیحدگی کی تحریک میں ڈھل گئے۔ مشرقی پاکستان کے مصیبت زدگان کو سرکاری امداد سے محروم رکھا گیا اور اس کے مسئول ایم ایم احمد تھے۔

۷۔ جب تک مشرقی پاکستان صیحدہ نہ ہوا قادیانیوں کے لیے پاکستان میں اقتدار کا سوال خارج از بحث تھا۔ کیونکہ اکثریت مشرقی پاکستان کی تھی اور شیخ مجیب الرحمن قادیانی امت کی ان حرکات کو بجا نہ سمجھتا تھا۔ وہ باخبر ہو گئے تھے وہ ایم ایم احمد کی حرکات پر پبلک میں بیان دے چکے اور ان کی فوری صیحدگی کے خواہاں تھے۔ اس بیان کے فوراً بعد چودھری ظفر اللہ خان ان سے ملنے ڈھاکہ گئے۔ دوسرے یا تیسرے دن تھلیہ میں ملاقات ہوئی اور آخر وہی ہوا جو میرزائی امت کے ظفر اللہ خان یا ایم ایم احمد سے ملکر آؤ کا نتیجہ ہو سکتا تھا کہ ایم ایم احمد کو علیحدہ کرنے سے پہلے مجیب الرحمن پاکستان سے ہمیشہ کے لیے علیحدہ ہو گئے۔

۸۔ اب میرزائی تمام تجربوں کو حسبِ مراد نہ پا کر پاکستان میں عالمی استعمار کا آخری ٹانگ کھیل رہے ہیں۔ انہوں نے امریکہ کے یودیوں کی طرح ملک کی مالیات (بینکنگ، انشورنس اور انڈسٹری) میں اس قسم کا اقتدار حاصل کر لیا ہے کہ انہیں ان کے پس منظر، پیش منظر اور تہ منظر سے خارج نہیں کیا جاسکتا اب ان کے اقتدار کی راہ میں یہ چیزیں معاون ہو سکتی ہیں اور یہ کنا جرم نہ ہو گا کہ پاکستان کی نفاذیہ اپنے چیف سے لے کر آئندہ جانشینوں کی ایک کڑی تک ان کے ہاتھ میں ہے۔ اسی طرح بڑی فوج کے دولکڑ کمانڈر (جنرل عبدالعلی اور جنرل عبدالحمید) ان کے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک ڈار بندھی ہوئی ہے۔

۹۔ ملک کی بعض اہم آسامیاں قادیانی لے رہے ہیں۔ مثلاً پنجاب میں ٹیکسٹ بک بورڈ کا چیئرمین غالب احمد قادیانی ہے۔ پنجاب اور بہاولپور کے علاقہ کی انشورنس کارپوریشن کا جنرل منیجر جنوہ قادیانی ہے۔ لاہور میوہسپتال کا میڈیکل سپرنٹنڈنٹ قادیانی ہے۔ غرض ایسے کئی ادارے قادیانی امت کے ہاتھ میں ہیں، جہاں اس کے افراد کی بڑی سے بڑی اکثریت معاشی طور پر پرورش پا سکتی اور سیاسی طور پر اقتدار کی راہیں ہموار کرتی ہے۔

۱۰۔ ابھی تک پریس قادیانی امت کے ہاتھ نہیں آسکا، لیکن وزارت اطلاعات و نشریات کی معرفت پریس کو مہربل کر دیا گیا ہے۔ اور ملک کے بیشتر ورکنگ جرنلسٹوں میں کرپشن کی نیورکھ دی گئی ہے جس کی بدولت قادیانیت کے پیچ و خم کا مسئلہ خارج از احتساب ہو چکا ہے۔

۶۔ ملک کے بعض اہل قلم اور اہل صحافت کو بالواسطہ و بلاواسطہ مختلف شکلوں میں مصادفہ دے کر اس قسم کے مضمون لکھواتے جا رہے ہیں جس سے قادیانی اُمت کے مخالفین ضعیف ہوتے جائیں اور اس انتشار و افتراق کو ہوا ملتی رہے جو ان کے آئندہ اقتدار کی ضروری اساس ہے۔

۷۔ سرحد و بلوچستان کی علیحدگی سے متعلق بالکل انہی خطوط پر قادیانی اُمت اقدام و کلام کا انبار لگا رہی ہے۔ جن خطوط پر شیخ مجیب الرحمن کو رگیدا جا رہا تھا۔ میرزائی اُمت بظاہر پیپلز پارٹی کے ساتھ ہے لیکن اُس کے مختلف نوجوان مختلف پارٹیوں میں حسب ہدایت شامل ہیں۔ پنجاب نیشنل عوامی پارٹی میں ایک ایسا احمدی نوجوان شریک ہے جس کا بھائی بڑے دنوں سے کراچی کا ٹیپٹی کشر ہے اور باپ میرزا غلام احمد کا صحابی ایک زمانہ میں پبلک کاتالون شہر تھا۔ قادیانی اُمت کا طرز عمل یہ ہے کہ مذمت کے روپ میں سرحد و بلوچستان کی سیاسی فضا کو اتنا مسموم کر دیا جائے کہ علیحدگی کا مطالبہ حقیقت بن جاتے جب عالمی استعمار کی خواہش کے مطابق پاکستان جبکہ مغربی پاکستان تنہا کئی ریاستوں مثلاً پختونستان، بلوچستان اور سندھ و دیش وغیرہ میں تقسیم ہو تو پنجاب میں مکران طاقت، یا سکھوں کے ساتھ مشترکہ طاقت کی سربراہی ان کے ہاتھ میں ہو۔

میرزائی سیاست کا نقشہ یہ ہے کہ عالمی استعمار اس پاکستان کو ضرب و تقسیم سے تین چار ریاستوں میں بانٹنے کا ارادہ کر چکا ہے۔ پختونستان بنے گا، بلوچستان بنے گا۔ سندھ و دیش بنے گا۔ ان کے اضلاع میں تھوڑا بہت رد و بدل ہوگا۔ ہو سکتا ہے سندھ کا کچھ علاقہ بھارتی راجستان کو چلا جائے۔ پختونستان میں پنجاب کے ایک دو اضلاع آجائیں۔ بلوچستان سندھ کے ایک دو اضلاع لے جائے اور پنجاب میں ڈیرہ غازی خاں کے ضلع پر اس کی نگاہ ہو۔ لیکن جتنی جلدی یہ ہو قادیانی اپنے لیے اتنا ہی مفید سمجھتے ہیں۔ قادیانی اُمت کی اس مہرہ بازی کا حاصل کلام یہ ہے کہ اپنے اس ہلقانی مقدر کے بعد پاکستان ختم ہو جائے گا تو سکھ استعماری شہ اور بھارتی تعاون سے پنجاب پر اپنے اس استحقاق کا دعویٰ کریں گے کہ وہ ان کے گوروں کی نگہری ہونے کے باعث اُن کا ہے۔ جس طرح یہود نے فلسطین کو اپنے پیغمبروں کے مولد و مسکن و مرقد ہونے کی بنا پر حاصل کیا اور اسرائیل بنا ڈالا۔ اسی طرح پنجاب سکھوں کے لیے ہوگا، بعض معلوم وجوہ کے باعث پنجاب اُس وقت پختونستان، سندھ و دیش اور بلوچستان کی ناراضی میں گھرا ہوگا۔ میرزائی اُمت گوروں کی نگہری کے طالبین سے معانقہ کر کے اپنے ”بدینۃ النبی“ قادیان کی مراجعت پر خوش ہوگی۔

تب عالمی استعمار کی مداخلت سے ایک نیا پنجاب پیدا ہوگا جو سکھ احمدی ریاست ہوگا اور جس کا پاکستانی وجود ختم ہو جائے گا۔

پاکستان کا اصل خطرہ یہ ہے کہ پنجاب اس خوفناک سانحہ کی زد میں ہے، نہ جانے حزب اقتدار اور حزب اختلاف اس بارے میں کیوں غور نہیں کرتیں۔ اس سیاسی مسئلہ کا اس وقت تعاقب نہ کیا گیا اور ایک پرنٹنگل خطرہ کے طور پر اس کا محاسبہ نہ کیا گیا تو کیا پاکستان کی آنکھ اُس وقت کھلے گی جب طوفان سرے گزر چکا ہوگا اور پاکستان کی تاریخ استعماری انقلاب کے ہاتھوں الٹ چکی ہوگی تب مرنے والے ملکوں کے کہ ان علاقوں میں ایک ایسی قوم رہتی تھی جس نے اپنے مسلمان ہونے کی بنیاد پر بر عظیم ہندوستان سے کٹ کے ایک علیحدہ ملک پاکستان بنوایا تھا، لیکن اس پر تیسری یا چوتھی دہائی بھی نہ گذری تھی کہ اپنی مجرمانہ غفلتوں اور احمقانہ سرکشیوں سے اس ملک کو خود مٹا ڈالا اور اب وہ ملک و قوم ماضی کی ایک طربناک یاد کا المناک تتمہ ہیں!

اس پمفلٹ کی آواز ہر گوشہ میں پہنچ گئی اور یہ شرف اس دور میں بفضلِ تعالیٰ 'پٹان' ہی کو حاصل ہوا کہ اُس نے عوام و خواص میں قادیانیت کو برہنہ کیا۔ حتیٰ کہ سول کے تمام محکموں اور فوج کے ہر سہ شعبوں میں قادیانی مسئلہ اپنے جدید خطرات سمیت واضح و آشکار ہو گیا۔

جن دنوں (جنوری ۱۹۷۳ء) لاہور میں اسلامی ممالک کے سربراہوں کا اجلاس ہوا۔ راقم نے بہ عنوان اسلام کے خدائے ایک پمفلٹ لکھا۔ اس کے عربی اور انگریزی تراجم نہایت خوبصورت کاغذ پر شائع کئے جب کانفرنس منعقد ہوئی تو راقم نے عربی و انگریزی پمفلٹ کے بنڈل مندوبین اور اُن کے ساتھیوں کی قیام گاہوں پر خود جا کر تقسیم کئے اس کے علاوہ قادیانیت سے متعلق علامہ اقبال کے دولہ مقالے چھپوا کر ہر مندوب تک پہنچاتے۔ راقم سے کئی ملکوں کے مندوبوں اور جرنلسٹوں نے کہا کہ انہیں پاکستان سے مختلف مباحث پر بہت سائل پھر ملا ہے، لیکن وہ اپنے ساتھ اسلام کے خدائے نام کا پمفلٹ لے جا رہے ہیں کیونکہ ان کے ملک میں قادیانیت کو جاننا ضروری ہو چکا ہے۔ ہم ان کے تبلیغی مشن کو اپنے ہاں بھلا کر ایک سانحہ اور ایک خطرے کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ اس پمفلٹ کی بعض چیزیں زیر نگاہ کتاب کے بعض پچھلے ابواب میں آچکی ہیں، لیکن سوال نمبر ۱ و ۲ و ۳ کا نہیں، پمفلٹ کا ہے کہ اس کی اشاعت سے قادیانی امت تمام اسلامی ممالک کے مطالعہ و اعتقاد میں عریاں ہو گئی۔ بعض عبارتیں تندرکھ رہی تھیں اس کا پورا متن حسب ذیل ہے۔

مرزا غلام احمد سے مرزا ناصر احمد تک

قادیانی امت کے استعماری خدو خال

— علامہ اقبالؒ بیسویں صدی میں بڑے عظیم پاک و ہند کے ایک عظیم فلسفی تھے انہوں نے اس بڑے عظیم کو دو چیزیں دی ہیں: ۱۔ مشترکہ ہندوستان کو برطانوی غلامی کے خلاف انقلابی نوا، کہ ان کی شاعری میں غیر ملکی غلامی کے خلاف احتجاج بھی تھا اور اجتماعی جدوجہد کی ایک دعوت بھی — اردو شاعری نے ان کے رشحاتِ قلم سے نئے بال و پر حاصل کیے۔ ۲۔ وہ ہندوستان میں اسلامی فکر کے اثباتی شاعر تھے، ان کا فلسفہ قسطنطنیہ کی دعوت اور پیغمبرؐ کی سیرت پر تھا۔ وہ ملتِ اسلامیہ کی غلطی رفتہ کوٹھانے کے متنی اور عصرِ حاضر کے مادی معاشرے میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے داعی تھے۔ پاکستان انہیں اپنے وجود کا مضمون رکھتا اور اپنی قومی زندگی کا سب سے بڑا ذہن تسلیم کرتا ہے۔ اُدھر ہندوستان، انہیں اپنی ذہنی غفلتوں میں شمار کرتا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں شدید سیاسی فاصلہ کے باوجود دونوں ملکوں نے پورا سال غلامی کی پیدائش کے صد سالہ جشن کا اعلان کیا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو مہاتما گاندھی کے بعد ہندوستان کے سب سے بڑے راہ نمائے۔ ہندوستان آزاد ہوا، تو وہ پہلے وزیرِ اعظم منتخب کیے گئے اور اپنی موت تک اسی مہم پر متمکن رہے۔ انہوں نے اپنے بعض خطوط کے علاوہ اپنی کتاب تلاشِ ہند *DISCOVERY OF INDIA* میں بھی قادیانی سیدانک خراج ادا کیا ہے — اقبالؒ نے احمدیت (قادیانیت) کا محاسبہ کیا تو سکر و نے ان سے بحث چھیڑ دی اور احمدیت کو ملتِ اسلامیہ کا جزو قرار دے کر بالواسطہ اس کا دفاع کیا۔

— میرزا غلام احمد کے پیروکار اپنے تئیں احمدی کہتے، اور اپنے طائفہ کو جماعتِ احمدیہ کا نام دیتے ہیں۔ چونکہ میرزا صاحب کا تعلق مسکن اور مدفن قادیان ہے، اس لیے مسکن انہیں قادیانی کہتے ہیں یا میرزا غلام احمد کی ملتِ گہوشی کے باعث میرزائی کہتے ہیں۔ اس کتابچے میں میرزائی اور قادیانی کے بجائے جہاں تاں احمدی لکھا گیا ہے، وہ پاکستان سے باہر کے ملکوں کو بتانے کے لیے، جہاں اسی نام سے وہ متعصب کیے جاتے ہیں۔

علامہ نے اس کا منبک جواب دیا۔ جو اہر لال سپر انداز ہو گئے۔ علامہ نے برطانوی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ احمدیت کی مفید خدمات کا صلہ دینے کی مجاز ہے، لیکن مسلمانوں کے لیے احمدیت کو نظر انداز کرنا خطرہ کا باعث ہے۔ اس طرح نہ صرف ملت اسلامیہ کی وحدت ختم ہوتی، بلکہ محمد عربی کی اُمت کا ہزارہ ہو کر تشنہ و افتراق کی راہیں کھلتی ہیں اور ان کے بنیادی معتقدات کی عمارت منہدم ہو جاتی ہے۔

علامہ اقبال اور پنڈت جواہر لال نہرو میں قلم کے تعلقات تھے۔ پنڈت جی حضرت علامہ سے احمدیت کے متعلق استفسار کیا، تو اس کے جواب اور ان مضامین کے سلسلہ میں علامہ نے پنڈت جی کو لکھا:

”اس سے متعلق میرے ذہن میں کوئی شک نہیں کہ احمدی، اس لام اور ہندوستان

دونوں کے خدای ہیں۔“

پنڈت جی نے اپنے نام پر بڑے آدمیوں کے خطوط کا ایک مجموعہ (A BUNCH OF OLD LETTERS) شائع کیا ہے، اس میں علامہ کا مٹھورہ بالا خط موجود ہے۔

احمدیت کیا ہے؟

میرزا غلام احمد قادیانی کے پیروکار احمدی کہلاتے اور ان کے مسلک و مشرب کا عرف احمدیت ہے میرزا کا خاندان سکھوں کے عہدِ اقتدار میں اُن کی فوج میں ملازم تھا۔ ملاحظہ ہو، سر لیل گریفن کی مایلیف۔ زمین چناب اُن کے دادا عطا محمد اور عطا محمد کا والد گل محمد سکھوں کی طرف سے لڑتے رہے۔ عطا محمد سردار فتح سنگھ اہلووالہ کی چاکری میں بارہ سال بیگوال رہا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے عطا محمد کی رحلت کے بعد اُس کے بیٹے غلام مرتضیٰ (والد میرزا غلام احمد) کو واپس بلا لیا۔ جلدی جاگیر کا ایک حصہ عطا کیا۔ غلام مرتضیٰ مہاراجہ کی فوج میں داخل ہو گیا اور کشمیر کی سرحدوں کے علاوہ بعض دوسرے مقامات میں مسلمانوں کی سرکوبی پر مامور ہوا۔ غلام مرتضیٰ نے سکھوں کی فوج میں بھرتی ہو کر ہری سنگھ نلوہ کے زیرِ قیادت پٹھانوں پر طورخم تک چڑھائی کی۔ حضرت سید احمد اور ان کی عمت کو بالاکوٹ میں شہید کرنے والی فوج میں شامل تھا۔ انگریزوں نے پنجاب فتح کیا، تو وہ اور اُس کے بھائی ان کے ہو گئے اور سات سو روپے پٹن حاصل کی۔ میرزا غلام کا دور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کو مٹانے کے لیے جنرل نکلسن کی فوج میں تھا، اُس نے ۶۶ نیوا انفٹری (سیالکوٹ) کے باغی فوجوان کو جنرل نکلسن کے

ساتھ درونک اذیتیں دے کر ہلاک کیا۔ جنرل بکسن نے لکھا کہ قادیان کے تمام دوسرے خاندانوں سے یہ خاندان ننگ حلال رہا ہے۔ میرزا صاحب نے اپنی اُن گنت کتابوں میں انگریزوں سے اپنی غیر متزلزل وفاداری کا اعتراف کیا اور اس پر فخر ناز کیا ہے۔ اور خلاصہ اس کا خود مرزا صاحب کے الفاظ میں یہ ہے کہ وفاداری کی ان کتابوں سے پچاس الماریاں بھرتی ہیں۔

احمدیت کا آغاز

میرزا غلام احمد ۱۸۳۹ء یا ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۸ء کی جنگ آزادی کے وقت ان کی عمر سولہ یا سترہ برس کی تھی۔ ابتدائے دینی کمشنریاں لکھوٹ کے دفتر میں قلیل تنخواہ پر محرری کی اور ۱۸۶۶ء سے ۱۸۶۸ء تک ملازم رہے۔ ۱۸۶۹ء کے شروع میں برطانوی ایڈیٹروں اور مسیحی راہ نمادوں کا ایک وفد اس غرض سے ہندوستان آیا کہ ہندوستانی عوام میں وفاداری کی نوکری پیدا کی جاسکتی اور مسلمانوں کے جذبہ جہاد کو سلب کر کے انہیں کیونکر رام کیا جاسکتا ہے۔ اس وفد نے ۱۸۷۰ء میں واپس جا کر دور پور میں مُرتب کیں۔ ان میں برطانوی سلطنت کا ہندوستان میں درودو — کے مُرتبین نے لکھا کہ:

(THE ARRIVAL OF THE BRITISH IN INDIA)

”ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت اپنے روحانی راہ نمادوں کی اندھا دھند پیروی کا رہے۔ اگر اس وقت میں ایسا کوئی آدمی مل جائے، جو اپنا ملک پرافٹ (سوداگری) نبی ہونے کا دعویٰ کرے تو اس شخص کی نبوت کو حکومت کی سرپرستی میں پروان چڑھا کر برطانوی مفادات کے لیے کام لیا جاسکتا ہے۔“ (تفصیلات)

میرزا صاحب اس غرض سے نامزد کیے گئے۔ انہوں نے پہلے تو ایک مناظر کاروب دھارا کے پادریوں کے ساتھ تو رجسٹروں سے مسلمان ناغوش تھے۔ گویا مرزا صاحب مسلمانوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ابتداً اس طرح نمودار ہوئے۔ پھر ایک جماعت پیدا کر کے ۱۸۸۰ء میں مُلم من اللہ ہونے کا اعلان کیا۔ پھر اپنے مُتحد ہونے کا نادر پھونکا۔ دسمبر ۱۸۸۸ء میں اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بیعت لینے کا حکم فرمایا ہے۔ ۱۸۹۱ء میں مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کروایا اور اپنے غلطی نبی ہونے کی اصطلاح ایجاد فرمائی۔ نومبر ۱۹۰۴ء میں اپنے کرشن ہونے کا بیان دافا۔ اس دوران میں یہ کانام بھی مرزا بن گیا کہ آریہ سماج سے ٹکراؤ پیدا کیا۔ ہندوستان سے متعلق عربی باتیں نکھیں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ سوامی دیانند کی ستیارتھ پرکاش کا آخری باب حضور سرور کائنات کے خلاف دریدہ دہنی سے لکھا گیا اور یہ بزرگ عظیم کے

مسلمانوں اور ہندوؤں کو ایک دوسرے سے لڑانے بھڑانے اور کٹانے کا برطانوی حربہ تھا۔

حُرمتِ جہاد اور اطاعتِ برطانیہ

مرزا صاحب نے اپنی قوت کا آغاز ان وعادی سے کیا کہ :

(۱) میرے پانچ اصول ہیں، جن میں دو حرمتِ جہاد اور اطاعتِ برطانیہ ہیں۔

(تبلیغ رسالت از غلام احمد صفحہ ۱۰۷)

(۲) میں نے مخالفتِ جہاد کو پھیلانے کے لیے عربی و فارسی کتابیں تالیف کیں اور وہ تمام عرب، شام، مصر، بغداد اور افغانستان میں شائع کی گئیں۔ میں یقین کرتا ہوں کہ کسی نہ کسی وقت ان کا اثر ہوگا۔

(تخصیص از تبلیغ رسالت جلد ۸، صفحہ ۶۲ مصنف غلام احمد)

(۳) ”میں نے ۲۲ برس سے اپنے ذمہ یہ فرض لے رکھا ہے کہ وہ تمام کتابیں جن میں جہاد کی مخالفت ہو،

اسلامی ملکوں میں ضرور بھیج دیا کروں گا۔“ (تبلیغ رسالت جلد ۱۱، صفحہ ۲۶)

(۴) ”میں سولہ برس سے متواتر ان تالیفات میں اس بات پر زور دے رہا ہوں کہ مسلمانانِ ہند پر

اطاعتِ گورنمنٹ برطانیہ فرض اور جہاد حرام ہے۔“ (تبلیغ رسالت، جلد سوم صفحہ ۳)

(۵) ”مجھے مسیح و ممدی جان لینا نبی حکمِ جہاد کا انکار ہے۔“ (تبلیغ رسالت جلد ہفتم)

یہ مقاباپ کا کلام، بیٹے کا ارشاد ہے کہ :

(۶) ”حضرت مسیح موعود نے اپنی پاک تعلیم میں گورنمنٹِ عالیہ کی اطاعت و وفاداری کو جزوِ مذہب

قرار دیکر، ان منافقِ مسلمانوں سے ہمیں علیحدہ کر دیا جو خونی ممدی کے استغفار میں ہیں کہ وہ عیسائی سلطنتوں

کو ٹا کر ان نام کے مسلمانوں کو حکمران بنا دے گا۔“ (الفضل، جلد ۴، نمبر ۸۶، یکم مئی ۱۹۱۷ء)

(۷) ہمارے سر پر سلطنتِ برطانیہ کے بہت احسان ہیں۔ وہ مسلمان تختِ جاہلِ بختِ نادان اور سختِ نالائق

ہے جو اس گورنمنٹ سے کینہ رکھے۔ اس گورنمنٹ کا شکر ادا نہ کریں، تو ہم خدا کے بھی ناشکر گزار ہو جائیں گے۔ خدا کا مسیح تو

کتا ہے کہ ہر مسلمان کو انگریزوں کی کامیابی کے لیے دُعا کرنی چاہیے لیکن جاہل، نادان اور نالائق مسلمان

کہتا ہے کہ انگریزوں کو شکست ہو تو زیادہ بہتر ہے“ (افضل، جلد ۵، جون ۱۹۴۰ء، خطبہ مرزا بشیر الدین محمود)
 (۸) ”بعض اہم سوال کرتے ہیں، اس گورنمنٹ سے جہاد کرنا درست ہے یا نہیں؟ یہ گورنمنٹ ہماری مٹن
 ہے۔ اس کا شکریہ ادا کرنا فرض اور واجب ہے۔ مٹن کی بدخواہی ایک بدکار اور حرامی کا کام ہے۔“

(افضل، جلد ۲۶-۱۲، ستمبر ۱۹۳۹ء)

(۹) مسیح موعود (مرزا غلام احمد) فرماتے ہیں، میں ممدی ہوں، برطانوی حکومت میری تلوار ہے۔ میں بغداد کی
 فتح سے کیوں خوشی نہ ہو؟ عراق، عرب، شام، ہم ہر جگہ اپنی تلوار کی چمک دیکھنا چاہتے ہیں۔“

(افضل، جلد ۶، نمبر ۳۲-۳۴، مورخہ ۶ دسمبر ۱۹۱۰ء)

(۱۰) ”ہم نے سرکار انگریزی کی راہ میں اپنا خون بہانے اور جان دینے سے کبھی دریغ نہیں کیا۔“

(تبلیغ رسالت جلد ہفتم، مرزا غلام احمد، ۲۴ فروری ۱۸۹۸ء)

پس منظر و پیش منظر

مرزا صاحب ان دعویٰ کو لے کر میدان میں آئے، تو بڑے عظیم میں مصالح و مقاصد کا نقشہ یہ تھا کہ۔
 (۱) سارا ملک برطانوی اقتدار کے ٹکنبز میں اچکا تھا، لیکن مسلمانوں کے دل و دماغ میں جہاد کا جو عقیدہ
 راسخ تھا، انگریز اس کی ناقابل تہیز سپرٹ سے پریشان تھے، مسٹر ڈبلیو، ڈبلیو ہنٹر کی تصنیف ”ہمارے ہندوستانی
 مسلمان“ ظاہر کرتی ہے کہ انگریز جہاد کی اس روح سے کیونکر ہراساں تھے اس کے علاوہ اور بہت سی برطانوی
 یادداشتیں، مسلمانوں کے جذبہ جہاد سے انگریزوں کی سراسیمگی ظاہر کرتی ہیں۔

(۲) انگریز سب سے پہلے بنگال پر قابض ہوئے۔ وہ ۱۸۵۷ء سے کہیں پہلے بنگال کے مسلمانوں کو ان کی طویل
 مزاحمت کے بعد زیر کر چکے تھے۔ ان کے یمن دیکار کے علاقوں میں انگریزوں کے لیے کوئی خطرہ نہ تھا۔ وہاں بعض
 علماء کی طرف سے اس قسم کے فتوے چل رہے تھے اور محمد بن سوساٹی کلکتہ نے بھی کچھ مغل کے بعض علماء سے
 اسی قسم کا فتویٰ حاصل کر کے شائع کیا تھا کہ ہندوستان دارالحرب نہیں، دارالسلام ہے۔

(۳) بڑے عظیم کے جن صوبوں میں شلمان اقلیت میں تھے، اور یہ صوبے بنگال سے ادھر صوبہ بہار سے شروع ہو کر دہلی تک تھے اور دہلی سے آگے پنجاب تھا۔ ان کی حد بندی اس طرح کی گئی کہ مسلمان وسط ہند کے تمام صوبوں میں عددًا اقلیت میں تھے سلطنت اور دھ کے مسلمانوں کو مغلوب کر لیا گیا اور دہلی کے مسلمان لیا میٹ ہو چکے تھے حتیٰ کہ آخری فرمانروا بہادر شاہ ظفر کو قید کر کے زنگوں میں جلا وطن کیا گیا اور قید رکھا گیا۔ اب مسئلہ شمال مغربی سرحدی علاقوں کی مسلمان اکثریت کا تھا۔ اس کے تمام علاقے افغانستان سے ملحق تھے اور ان میں جذبہ جہاد غیر ختم تھا۔ سرحد، بلوچستان اور سندھ میں انگریز حکمران ہو چکے تھے، لیکن مسلمانوں کے جہاد اور انگریزوں کے استعمار میں جھڑپیں جاری تھیں۔

(۴) جنگ امبیلہ (صوبہ سرحد) ۱۸۹۳ء میں ہوئی، اس کے مجاہدین و معاندین جو ہندوستان کو دارالحرب کہتے اور جہاد و غرہ کو فرض قرار دیتے تھے، انگریزوں کے لیے داخلی طور پر خطرہ تھے۔

(۵) انگریزوں نے ۱۸۹۶ء، ۱۸۹۷ء، ۱۸۹۸ء اور ۱۸۹۹ء میں پٹنہ، راج محل، نالندہ اور انبالہ میں ان علماء اور ان کے معاندین پر پانچ مقدّمات قائم کیے جو ہندوستان میں برطانوی اقتدار کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے جہاد کا رشتہ قائم کیے ہوئے تھے، انہیں موت، عمر قید اور ضبطی جا بیداد کی سخت سے سخت سزائیں دے کر پامال کیا گیا۔

(۶) افغانستان میں برطانوی اقتدار کی بیل منڈھے نہ چڑھی تو ۱۸۹۲ء میں سر مارٹین ڈیوڈ نے افغانستان اور ہندوستان کے مابین طوفان کے ساتھ سرحدی لائن قائم کی۔ جو ڈیوڈ لائن کہلاتی رہی۔ اور اب بھی سرکاری کاغذوں میں اس کا یہی نام چلا آ رہا ہے۔

(۷) پنجاب مسلمانوں کی اکثریت کا وسیع تر علاقہ تھا۔ انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی کو اس صوبہ ہی کے بل پر ختم کیا اور تجربہ سے اندازہ ہو گیا کہ اس کے لیے پنجاب کا سپاہی ایک عظیم فوجی متاع ہے۔ ہندوستان بھر میں پنجاب برطانوی عملداری کے لیے ریڑھ کی ہڈی تھا۔ یہاں کے روسا نے انگریزوں کی توقعات سے کہیں زیادہ برطانوی عملداری کے لیے جاں سپاری اور وفاداری بشرط استواری کا ثبوت دیا تھا۔ پنجاب کی سرحدوں سے مسلک صوبوں میں رُوح جہاد قائم تھی اور وہ تمام ترکستان کے علاقے تھے۔ ان علاقوں سے ملحق افغانستان و ایران تھے، ان سے آگے دُور دُور تک اسلامی مملکتوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ اُدھر ان علاقوں کے شانوں پر مڑیں تھیں اور برطانوی عملداری روس کو اپنے لیے خطرہ سمجھتی تھی۔ پنجاب کو اپنے قبضہ میں رکھنے اور ان علاقوں سے رُوح جہاد ختم کرنے کے لیے مرزا غلام احمد کو برطانوی سرکار نے مبعوث کیا۔ برطانوی سرکار کو بزمِ خویش یقین تھا

مرزا غلام احمد نے مسلمان عوام کو پادریوں کے خلاف بھڑکایا اور مسیحی عقائد پر رکیک حملے کیے تو پادریوں نے برطانوی سرکار سے شکایت کی کہ میرزا تو ہین سمیت کامیج ہو رہا ہے۔ مرزا نے ملکہ وکٹوریہ کو خط لکھا کہ:

”مشریوں سے مناظرہ کرتا ہوں تو مسلمانوں میں تیغ جماؤ کا اقتدار بڑھتا ہے۔“

ایک دوسری جگہ لکھا کہ:

”میں نے عیسائی رسالہ نور افشاں کے جواب میں سختی کی تو اس کا مقصد یہ تھا کہ سریع الغضب مسلمانوں کے دخیانہ جوش کو ٹھنڈا کیا جائے اور میں نے حکمتِ علی سے وحشی مسلمانوں کے جوش کو ٹھنڈا کیا۔“

گویا میرزا صاحب پادریوں سے عیسائیت اور اسلام کے زیرِ عنوان جو مناظرے کرتے تھے۔۔۔ میں غرض سے تھے۔۔۔ کہ مسلمانوں کا ان پرافتاد قائم ہو کہ وہ انگریزوں کے فرستادہ نہیں بلکہ جہاد کی منسوخی کا اعلان ایک منہم کی حیثیت سے خدا کی رضا پر کرتے ہیں۔

میرزا صاحب نے اپنے تئیں نبی منوانے کے لیے بے تحاشہ گالی گلوچ کی۔ اُس وقت تمام ہندوستان میں پنجاب ہی شاید سب سے اُن پڑھ صوبہ تھا، اُس کے باشندوں کو اس طرح مرعوب کیا کہ :

« تمام مسلمانوں نے مجھے قبول کر لیا ہے۔ صرف کھجریوں اور بدکار عورتوں کی اولاد نے مجھے نہیں مانا۔ »

(آئینہ کلمات صفحہ ۴۵)

(۲) جو شخص میرا مخالف ہے وہ مُشرک اور جہنمی ہے (تبلیغ رسالت جلد ۹، صفحہ ۲۷۸)

(۳) جو شخص ہماری فتنے کا قائل نہیں ہوگا، تو سات سمجھا جائے گا کہ اُس کو ولدِ الحرام بننے کا شوق ہے اور حرامِ اولیٰ کی ہی نشانی ہے“

(۴) ”ہمارے دشمن یا بانوں کے خنزیر ہو گئے اور ان کی عورتیں کیتوں سے بھی بڑھ گئیں“
(درّ ثبین عربی صفحہ ۲۴۹)

میرزا صاحب ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو وفات پا گئے، ان کے جانشینوں حکیم نور الدین خلیفہ اول (مئی ۱۹۰۸ء تا مارچ ۱۹۱۴ء) اور ثانی میرزا بشیر الدین خلیفہ ثانی (مارچ ۱۹۱۴ء تا ۱۹۶۵ء) نے احمدیت کو استعمار کی

ایکسی بنایا۔ اس آنکسی نے پہلی جنگِ عظیم میں انگریزوں کی بے نظیر خدمات انجام دیں۔ عرب ریاستوں کو مسلمانوں کی رمنع قطع اور مسلک و مشرب کا فریب دے کر ان کی قطع و برید کا برطانوی مشن پورا کیا اور جاسوسی کرتے رہے۔ اور ہندوستان میں جاسوسی کے مرکزی و صوبائی محکموں سے متعلق رہے۔ مسلمانوں کو برطانیہ سے وفاداری کا سبق اس طرح پڑھایا کہ ان کے روحانی رشتے کی روح مفقود ہو جائے۔ پہلی جنگِ عظیم میں بغداد کے سقوط پر چرائیاں کیا۔ مدینہ و مکہ کے متعلق حقیقۃً الرؤیا (مصنفہ بشیر الدین محمڈ) میں لکھا کہ ان کی چھاتیوں سے دودھ خشک ہو گیا ہے۔

قادیان کے متعلق الفضل ۳ جنوری ۱۹۲۵ء میں لکھا کہ وہ تمام جہان کے لیے آتم ہے۔ اس مقام مقدس سے دنیا کو ہر ایک فیض حاصل ہو سکتا ہے۔

فضل ۱۲ ستمبر ۱۹۳۵ء میں مرقوم ہے کہ ہم ان لوگوں سے متفق نہیں جو کہتے ہیں کہ کسی صورت میں بھی حرمین پر حملہ نہیں کیا جاسکتا۔ مدینہ پر بھی چڑھائی ہو سکتی ہے۔

اس سے پہلے ۱۱ ستمبر ۱۹۳۲ء کے الفضل میں مرقوم تھا کہ قادیان میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ والی بکات نازل ہوتی ہیں۔ قادیان کا سالانہ جلسہ قلی حج ہے اور یہ نفل اب فرمن بن گیا ہے۔

قادیانی جاسوس

میرزا غلام احمد نے ملک سے باہر جہاد کی تیغ اور برطانیہ کی طاعت سے متعلق بہ قول خود بے پناہ لٹریچر بھیج دیا اور مسلمان ملکوں میں تقسیم کر دیا۔ ان کا بیٹا بشیر الدین محمڈ خلیفہ ثانی ایک شاطر انسان تھا۔ اس نے اپنے متعقین کو انگریزوں کی جاسوسی کے لیے مقرر کیا۔ بعض جگہ مشن قائم کیے۔ بعض جگہ ملازمین دلوائیں اور بعض جگہ پہلی جنگِ عظیم میں عرب ریاستوں کے احوال و آثار چوری کرنے کے لیے اپنے متعقین بھیجے۔ مثلاً :

۱۔ پہلی جنگِ عظیم میں اپنے سالے ولی اللہ زین العابدین کو سلطنتِ عثمانیہ میں بھیجا۔ اس نے ترکوں کی پانچویں ڈویژن کے انچارج جمال پاشا کی معرفت ۱۹۱۴ء میں قدس یونیورسٹی دمشق میں دینیات کی لیکچررشپ حاصل کی۔ لیکن اس کا کام انگریزی فوجوں کے لیے جاسوسی کرنا تھا کہ وہ دمشق میں کیونکر داخل ہو سکتی ہیں۔ جو نئی انگریزی فوجیں دمشق میں داخل ہوتی ہیں وہ انگریزی کمانڈر کے حسبِ ہدایت مامور ہو گیا اور عربوں کو ترکوں سے بھڑانے کے فرائض انجام دیتا رہا لیکن جب عراقی اس کے جاسوسی خط و خال سے آگاہ ہو گئے تو بھاگ کر قادیان آ گیا اور ناظرِ امورِ عالم ہو گیا۔

۲۔ پہلی جنگ عظیم کے فوراً بعد مکہ معظمہ میں احمدی مشن قائم کیا گیا، میر محمد سعید حیدر آبادی اس کا انچارج تھا۔ اور کرنل ٹی۔ ڈبلیو۔ لارنس (برطانوی محکمہ جاسوسی کا اہم عہدیدار) کی ہدایت پر کام کرتا تھا۔ اس مشن کے ارکان نے مکہ معظمہ اور ترکی میں برطانوی مصالح کے مطابق تخریب کاری کا جال بچایا (الفصل ۳ ستمبر ۱۹۲۵ء ملاحظہ ہو) آفرین محمود اور مصطفیٰ کمال کے مستحکم ہونے پر میرزائی سب کچھ چھوڑ کر مجازو ترکی سے فرار کر گئے۔ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ وہ گرفتار کیے جا رہے ہیں۔ اور ان کے جرم کی سزا موت ہے۔

(۳) ترکی میں مصطفیٰ کمال کو قتل کرنے کے لیے مصطفیٰ صغیر نام کے جس نوجوان کو، مور کیا گیا اور میرزا معراج دین (پرنسٹن سی۔ آئی۔ ڈی)، ایک تاجر کی حیثیت سے اس کے ساتھ منسلک کیے گئے۔ اس نوجوان (مصطفیٰ صغیر) کو میرزا بشیر الدین محمود نے ایک مقصد جان نثار کی حیثیت سے مقرر و منتخب کیا اور برطانوی حکومت کے حوالے کیا تھا۔ ۴۔ پہلی جنگ عظیم میں برطانوی فوج کا میاب ہو کر عراق میں داخل ہوتی تو اس کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کے روپ میں بہت سے احمدی تھے، ولی اللہ زین العابدین کا چھوٹا بھائی اور میرزا بشیر الدین محمود کا سالا بھرا حبیب اللہ شاہ، جو انگریزی فوج میں ایک ڈاکٹر تھا، بغداد فتح ہونے پر برطانوی گورنر مقرر کیا گیا اور فوج کی لوٹ چائی گئی۔ پھر وہ بکدوش ہو کر واپس آگیا۔ آخر ۱۹۲۴ء میں عراقی حکومت نے میرزائی عناصر کو ان کی فلاحی سرگرمیوں کے باعث نکال دیا۔

۵۔ شام میں جلال الدین شمس کو بھیجا گیا۔ اس کے پسر فلسطین و شام کا مشن تھا لیکن دسمبر ۱۹۲۷ء میں اس کی پڑا سارا سرگرمیوں کے باعث اس پر قاتلانہ حملہ ہوا، وہ بچ گیا، لیکن بہت دیر تک زیرِ علاج رہا۔ شام میں استعماری گرفت ڈھیل پڑ گئی تو جلال الدین شمس کو نکال دیا گیا۔ اور وہ ۱۹۲۸ء مارچ ۱۹۲۸ء کو حیفّا آگیا۔ اب برطانوی مصالح کامرک فلسطین تھا۔ اور اس کو یہودی ریاست بنانے کے لیے عربوں کی وحدت میں نقب لگانے والے ایسے ہی نام نہاد مسلمان درکار تھے جو میرزا بشیر الدین محمود نے متیا کیے۔ فلسطین میں برطانیہ کی جاسوسی کا افسر علی ایک یہودی تھا۔ احمدی مشن اس کے ماتحت تھا اور اس طرح یہودیت اور احمدیت کے گٹھ جوڑ کا آغاز ہوا۔ اس آغاز ہی سے اسرائیل قائم کرنے کی استعماری کوششوں کو پروان چڑھایا۔ آج احمدی ان بے نظیر خدمات ہی کے صلہ میں اسرائیل کی حکومت سے ممتاز ہو رہے اور آج کل عرب ریاستوں کی بیخ کنی اور مجری کر رہے ہیں۔ لائڈ جارج (وزیر اعظم انگلستان) نے فلسطین میں احمدیوں کی خدمات کا اعتراف کیا اور وہ ان سے غایت درجہ مطمئن تھا۔ ۱۹۲۳ء میں میرزا بشیر الدین محمود فلسطین گیا اور اس نے اعلان کیا کہ یہودی اسی خطہ کے مالک ہو جائیں گے، تاریخ احمدیت

۱۲۱۰ (۱۷۱۰) میرزا محمود نے فلسطین کے ہائی کشر سے ملاقات کی، اور آئندہ خدمات کا نقشہ طے پایا۔ جلال الدین شکر کے ساتھ محمد المغربی الطرابلسی اور عبدالقادر غزوہ صالح نام کے دو عربوں کو منسلک کیا گیا۔ اصلًا دونوں یہودی تھے اور استعماری مقاصد کے لیے انہیں مسلمان کیا گیا تھا۔

۶۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت نے رُوس سے ہمیشہ خطرہ محسوس کیا اور وسط ایشیا میں اسلامی علاقوں کی معرفت اس خطرہ کے مفروضوں یا حقیقتوں کی نوعیت معلوم کرنے کے لیے مختلف دفتروں میں کئی جاسوسی دفن بھیجے۔ جو مختلف واسطوں سے رُوس جاتے رہے۔ ایک احمدی محمد امین خاں کو ۱۹۲۱ء میں مبلغ کے رُوپ میں روانہ کیا گیا۔ وہ ایران کے راستہ معلومات حاصل کرتا ہوا رُوس میں داخل ہوا لیکن رُوسی حکومت نے پکڑ کے جیل میں ڈال دیا۔ آخر برطانوی مداخلت سے رہا ہوا۔ اُس نے قادیان واپس آکر میرزا بشیر الدین محمود سے مزید ہدایات لیں، اور ایک دوسرے شخص ظہور حسین کو ساتھ لیکر لوٹ گیا۔

ظہور حسین بھی رُوسی پولیس کے ہاتھ لگیا اور انگریزوں کے لیے جاسوسی کے الزام میں ہاسکو وغیرہ کے قید خانہ میں دو سال رہا۔ بالآخر برطانوی سیفر مقیم ہاسکو کی کمک دووے رہا ہوا۔ شہزادہ ولیز ہندوستان آیا تو میرزا بشیر الدین محمود نے وفاداریوں سے متعلق پانچ سو پیش کیا۔ اس میں بڑا ہنگامی کہ حضرت میرزا غلام احمد کی پیش گوئی کے مطابق رُوس کی حکومت بالآخر احمدیوں کے ہاتھ میں ہوگی اور اللہ تعالیٰ احمدیت کو بخار میں مغرب پھیلادے گا۔

۷۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ۱۹۱۹ء میں انگریزوں اور افغانستان کے درمیان جنگ چھڑ گئی تو قادیانی ایک کپن کی شکل میں افغانستان کو انگریزوں کے زیر نگیں لانے کے لیے مصروف ہو گئے۔ میرزا محمود کا چھوٹا بھائی چھ ماہ تک ٹرانسپورٹ کور میں آزمیری کام کرتا رہا۔

برطانوی حکومت اول تو افغانستان کو اپنے قبضہ میں لانا چاہتی تھی۔ جب افغانستان اس کی نوآبادی بن سکے تو اپنی ریشہ دوانیوں کے لیے چن لیا، تاکہ افغانستان کمزور ہو۔ اس کام کے لیے جو مہرے جاسوسی کے تحریری فرائض انجام دے رہے تھے، ان میں ایک شخص نعمت اللہ قادیانی بھی تھا، اس کو جولائی ۱۹۲۲ء میں گرفتار کر کے انگلند کیا گیا۔ فروری ۱۹۲۵ء میں دو اور قادیانی ملا عبدالحلیم اور ملا نور علی اسی پاداش میں موت کے گھاٹ اتارے گئے۔

قادیانی اُمت کی برطانیہ سے اندھا دھند وفاداری اور مسلمان ملکوں میں انگریزوں کی خاطر جاسوسی کا ریکارڈ اتنا ضمیمہ ہے کہ اگر کسی سرکاری جماعت کا ریکارڈ اس قدر شرمناک نہیں۔ اس سے نئی الحقیقت کئی سوکتوں کی ایک لائبریری قائم ہو سکتی ہے۔

میرزا غلام احمد اور اُن کی اُمت کے دو ہی شعار رہے ہیں :

۱۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت چھن جانے پر میرزا غلام احمد جہاد کی منسوخی کے لیے ایک نبی بن کر سامنے آیا اور اُس نے الہام کا حامی بننا کرا طاعتِ برطانیہ کو فرض قرار دیا۔ اُس کی اُمت نے اُس کی موت کے بعد ایک ایسے طاغوت کی حیثیت اختیار کر لی جو ہندوستان میں برطانوی استعمار کے انجن کی بھاپ تھا۔ اور جس کے وجود سے مسلمانوں کی وحدت و وحدت ہو کر کمزور پڑتی اور ختم ہوتی تھی۔

۲۔ قادیانی اُمت نے اپنے پیغمبر کی سند کے تمام اسلامی ملکوں میں برطانوی استعمار کی خدمت گزاری اپنے اوپر فرض کر لی۔ وہ مسلمانوں کے روپ میں اُن ممالک میں جاتے اور رہتے، لیکن عقیدۂ امین کا کفر سمجھ کر انہیں سبوتاژ کرتے۔ تمام اسلامی ملکوں کے مسلمان اُن کے ظواہر سے دھوکا کھاتے۔ المحقر قادیانی اُمت کے افراد اسلامی مملکتوں میں برطانیہ کا غنیمت کا مانتے تھے۔

علامہ اقبالؒ نے قادیانی اُمت کے عمیق مطالعہ کے فوراً ہی بعد ہندوستان کی برطانوی حکومت سے مطالبہ کیا کہ میرزائیوں کو مسلمانوں سے الگ کر دیا جائے۔ وہ محمد عربیؐ کی اُمت میں نقب لگا کر ایک علیحدہ اُمت پیدا کرتے ہیں میرزا غلام احمد خود کوئی اُمت پیدا کر سکتے تھے۔ اگر وہ الگ اُمت پیدا کرتے، تو اسلامی ملکوں میں انگریزی استعمار کے لیے مفید نہ ہوتے۔ انہوں نے اپنے پیروؤں کی جمعیت کو اس طرح ڈھالاکہ وہ اپنے سوا تمام مسلمانوں کو کافر سمجھتے لیکن کام ان سے اس طرح لیا گیا کہ وہ مسلمانوں ہی کا ایک فرقہ اور جماعت ہیں۔

علامہ اقبالؒ قادیانی اُمت کے الگ تھلک عقائد اُن کی اسلام سے غداری اور برطانوی استعمار کی خدمت گزاری سے اس قدر بدظن ہو گئے کہ انہوں نے نہ صرف احمدیوں کو مسلمانوں سے الگ کر دینے کا مطالبہ انتہائی شدت سے کیا بلکہ مسلمان اداروں سے انہیں نکلوادیا۔ لاہور ہائی کورٹ کے ایک جج مرزا ظفر علی جی حضرت علامہ کے مؤید ہو گئے اور اس طرح انگریزی خواندہ جماعت کی ایک بڑی تعداد میں بھی ان کی علیحدگی کا مطالبہ قائم ہو گیا۔ علامہؒ نے فرمایا کہ :

۱۔ قادیانی مسلمانوں میں صرف سیاسی فوائد کے حصول کی خاطر شامل ہیں، ورنہ وہ تمام عالم اسلام کو اپنے عقائد کی رو سے کافر قرار دیتے ہیں۔

۲۔ وہ اسلام کی باطنی جماعت ہے اور مسلمانوں کو اس مطالبہ کا پورا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو ان سے الگ کر دیا جائے۔

۳۔ وہ مسلمانوں میں یہودیت کا شفی ہیں۔

برِ عظیم کی آزادی تک قادیانی امت کی تاریخ میں ایک شوشہ یا ایک نقطہ بھی ایسا نہیں جس سے معلوم ہو کہ وہ اس برِ عظیم کی جدوجہد آزادی سے موافق تھے، یا کبھی انہوں نے برطانیہ سے ہندوستان چھوڑ دینے کا مطالبہ کیا ہو۔ ان کی غیر مختتم کاسہ لسی کے باوجود برِ عظیم آزاد ہو گیا۔ ہندوستان آزاد ہوا۔ پاکستان قائم ہوا تو برطانیہ سے ان کی وابستگی کے لیے ہندوستان میں کوئی جگہ نہ تھی اور نہ وہاں وہ کہ وہ مختلف محاذوں پر برطانیہ کے بیلے فضیلت کا لم ہو سکتے تھے۔ انہوں نے پاکستان کا رخ کیا۔ پنجاب میں آزادی سے کچھ عرصہ بعد تک سرفراز سہادی انگریز گورنر تھا، اس کے سامنے برطانوی استعمار کے مختلف پلان تھے۔ چنانچہ اُسی کی معرفت رقبہ قادیانی امت کو ملا۔ یہ اُن کے لیے اس طرح کا ایک گمبختا جس طرح امریکیوں نے پشاور سے کوہاٹ کی طرف بدمیر کے مقام پر اپنا ایک عسکری مرکز قائم کیا تھا اور وہاں کسی پاکستانی کو جانے کی اجازت نہ تھی۔

جی لوگوں نے میرزا ایت کے تعاقب کی تحریک چلائی، ان میں زعمائے احرار مسلم لیگ میں شامل نہ تھے، اور نہ پاکستان کو ہندوستان کے مسلمانوں کا سیاسی حل سمجھتے تھے۔ علامہ اقبالؒ پاکستان سے پہلے وفات پا گئے۔ مولانا ظفر علی خان گودکنا رہے تھے۔ میرزا بشیر الدین محمود کو خیال ہوا کہ اُن کے مخالف جو متحرک اور اشجع ہیں، مسلم لیگ میں عدم شمول کے باعث اب پاکستان میں سرمٹھانے کے قابل نہیں رہے مسلمانوں نے انہیں مُسترد کر دیا ہے۔ اس مفروضہ پر اُس نے پاکستان کو اپنی ریاست بنانے کی اندوہی مہم کا آغاز کیا۔ اُس نے جنرل سر ڈگلس گریسی کے ایماء پر مجاہدین کے نام پر ”فرقانِ ثلین“ قائم کی۔ یہ اُس شخص کا اقدام تھا جس کے باپ میرزا غلام احمد نے جہاد کو الہاماً منسوخ کیا تھا، اور جو برطانوی عہد میں خود بھی منسوخ جہاد کا داعی تھا۔

مشرقی پاکستان کے پاکستان سے کٹ جانے کے بعد آج مغربی پاکستان میں بلوچستان عالمی طاقتوں کی بدولت ایک سیاسی مسئلہ ہے اور وہاں بیرونی نگاہیں بھی ہوتی ہیں۔ انگریزوں نے برِ عظیم چھوڑنے سے پہلے بلوچستان کے موجودہ گورنر نواب آف قلات کو اپنے ڈھب پر لانا چاہا، کہ وہ بلوچستان کو نیپال کی طرح آزاد حیثیت دینا چاہتے ہیں۔ مسٹر ڈی۔ وائی فل (پولیٹیکل ایجنٹ کوئٹہ) نے نواب قلات کو ترغیب دی کہ انگریز برادرانہ کی طرح بلوچستان کو آزاد ریاست کا درجہ دینے کے لیے تیار ہیں۔ اُن دنوں بلوچستان کا ایجنٹ جنرل جعفری تھا، وہ خود قلات گیا اور لاڈلوانٹ بیٹن کا پیغام دیا کہ وہ بلوچستان کو آزاد ریاست بنانے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن قائدِ اعظمؒ مطلع ہو گئے اور بیل منڈ سے نہ چڑھی۔ آخر برطانوی حکومت کے ان سیاستدانوں نے میرزا محمود سے طویل ملاقات کر کے بلوچستان کا پلان

ان کے حوالے کیا اور خود چلے گئے۔ میرزا محمود نے جولائی ۱۹۴۸ء میں کوئٹہ کا دورہ کیا اور بلوچستان کو قادیانی صوبہ بنانے کا اعلان کیا۔ ان کا یہ خطبہ ۱۸ اگست ۱۹۴۸ء کے ”الفضل“ میں درج ہے۔

اگر ۱۹۵۳ء میں قادیانیت کے خلاف مجلس عمل کی تحریک نہ چلتی تو میرزائی پاکستان میں استعماری سیاست کے سبب ہلاکت اپنے قدم جا رہے تھے۔ اس تحریک نے تمام ملک کو چوکا کر دیا۔ قادیانی تبلیغ ہیٹھ کے لیے رک گئی اور تمام مسلمان اُن سے باخبر ہو گئے۔ لیکن سر فخر اللہ خاں نے وزیر خارجہ کی حیثیت سے بیرون پاکستان اپنی ساکھ قائم کر لی اور عالمی استعمار سے اس کی ضرورتوں کے مابین رابطہ قائم کر لیا۔ اور ہر ملک استعماری اور نظریاتی طاقتوں کے محور میں چلا گیا۔ اور قادیانی استعماری طاقت کے مہرے ہو گئے۔

چین — امریکہ اور روس دونوں کے لیے خطرہ یا پرالیم ہو چکا تھا۔ دونوں محسوس کرتے تھے کہ ہندوستان سوشلسٹ ہو گیا تو پھر ایشیا اور افریقہ میں انہیں کوئی سامقام یا رستوخ حاصل نہ ہو گا۔ کیونکہ اس طرح ایک ارب اور بیس کروڑ انسان سوشلسٹ ہو جاتے تھے، ان عالمی طاقتوں نے ہندوستان کو ساتھ ملا کر چین کے خلاف محاذ بنانا چاہا۔ ہندوستان کا جواب یہ تھا کہ اس کے دو طرف مشرقی و مغربی پاکستان دشمن کی حیثیت سے موجود ہیں۔ جب تک وہ ہیں، ہندوستان کا ایسے کسی محاذ میں شامل ہونا مشکل ہے۔ امریکہ اور روس نے صدر ایوب سے کہا کہ وہ ہندوستان سے مشترکہ دفاع کرے۔ صدر ایوب نے مشکلات پیش کیں اور عذر کیا۔ اس پر دونوں طاقتیں پاکستان اور ایوب خاں کے خلاف ہو گئیں۔ اسی ناراضی کا نتیجہ ۱۹۶۵ء کی جنگ تھی۔ جو استعماری طاقتوں کے پاکستانی گماشتوں کی پخت و پز سے معزز وجود میں آئی۔ خدا نے پاکستانی فوج کے بازوؤں کو توانائی دیکر پاکستان کو بچالیا۔ ورنہ نقشہ مختلف ہوتا۔ اور جانے کیا ظہور میں آتا۔ عالمی طاقتیں سمجھتی تھیں کہ مغربی پاکستان کے اعضاء فتح ہو گئے اور اس کی شکل بدل گئی تو مشرقی پاکستان کسی تردد کے بغیر خود بخود الگ ہو جائے گا، لیکن قدرت کو منظور نہ تھا، پاکستان محفوظ ہو گیا، لیکن اس کے ساتھ عالمی طاقتوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ مشرقی پاکستان کبھی الگ نہ ہوتا، لیکن عالمی طاقتوں کے جو ایجنٹ مغربی پاکستان میں حکومت کی شینہ زری کے بڑے بڑے عمائد پر کام کر رہے تھے، انہوں نے مشرقی پاکستان کو کاٹ دیا اور قادیانی اس منصوبہ کے سرخیل تھے۔ مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کے خلاف محاشی استحصال کا جو عہدہ تھا اس کو سوا کرنے والا میرزا غلام احمد کلپوتہ، میرزا بشیر الدین کا بھتیجا اور داماد ایم۔ ایم۔ احمد تھا۔ جو ایوب خاں کے زمانہ میں بیرونی پشت پناہی سے مالیات کا انچارج تھا، اور آج ان استعماری خدمات کے صلہ میں عالمی بینک کا اہم عہدیدار ہے۔ لفظ ”جائتمیر“

کہ پاکستان میں ایٹمی توانائی کا سربراہ عبدالسلام بھی قادیانی ہے۔

ظفر اللہ خاں، ایم۔ ایم۔ احمد اور عبدالسلام تینوں ہی پاکستان سے باہر لندن کی جلوہ گاہ میں رہتے اور دانشمندی کے اشارہ ابرو پر رقص کرتے ہیں۔ قادیانی ہائی کمانڈ نے ۱۹۷۱ء کے انتخابات میں پاکستان کے اسلامی ذہن کو اسرائیل کے روپے کی طاقت پر سبوتاژ کیا اور اس کے بعد سے ملک کے غیر اسلامی ذہن کی معرفت پاکستان کی معاشی و عسکری زندگی پر قابض ہو رہے ہیں۔ یورپ کی نظریاتی و استعماری طاقتیں نہ تو اسلام کو بطور طاقت زندہ رکھنے کے حق میں ہیں اور نہ اس کی نشاۃ ثانیہ چاہتی ہیں۔ ہندوستان کی خوشنودی کے لیے پاکستان اُن کی بندر بانٹ کے منصوبہ میں ہے۔ وہ اس کو بلقان اور عرب ریاستوں کی طرح طرح چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم کرنا چاہتی ہیں۔ ان کے سامنے مغربی پاکستان کا بٹوارہ ہے۔ وہ پنجستان، بلوچستان، سندھ، ویش اور پنجاب کو الگ الگ ریاستیں بنانا چاہتی ہیں۔ ان کے ذہن میں بعض سیاسی روایتوں کے مطابق کراچی کا مستقبل سندھاپور اور ہانگ کانگ کی طرح ایک خود مختار ریاست کا ہے۔ خدا نخواستہ اس طرح تقسیم ہوگئی تو پنجاب ایک عصفور (SANDWICH) صوبہ ہو جائے گا، جس طرح مشرقی پاکستان کا عصفہ مغربی پاکستان میں صرف پنجاب کے خلاف تھا، اسی طرح پنجوستان، بلوچستان اور سندھ ویش کو بھی پنجاب سے نالامنی ہوگی پنجاب تنہا رہ جائے گا، تو عالمی طاقتیں سکھوں کو بھڑکا کر مطالبہ کر دیں گی کہ مغربی پنجاب اُن کے گورنروں کا مولد، مسکن اور مرگھٹ ہے۔ لہذا ان کا اس علاقہ پر وہی حق ہے جو یہودیوں کا فلسطین (اسرائیل) پر تھا۔ اور انہیں وطن مل گیا۔ عالمی طاقتوں کے اشارے پر سکھ حملہ آور ہوں گے۔ اُس کا نام شاید پولیس اکیشن ہو۔ جانیں میں لڑائی ہوگی لیکن عالمی طاقتیں پلان کے مطابق مداخلت کر کے اس طرح لڑائی بند کر دیں گی کہ پاکستانی پنجاب، بھارتی پنجاب سے پیوست ہو کر سکھ احمدی ریاست بن جائے گا۔ جس کا نقشہ اس طرح ہوگا کہ صوبہ کا صدر سکھ ہوگا، تو وزیر اعلیٰ قادیانی۔ اگر وزیر اعلیٰ سکھ ہوگا تو صدر قادیانی! اسی غرض سے استعماری طاقتیں قادیانی اُمت کی کھلم کھلا سرپرستی کر رہی ہیں۔ بعض مستند خبروں کے مطابق سر ظفر اللہ خاں لندن میں بھارتی نمائندوں سے بھخت و پز کر چکے ہیں۔ قادیانی اس طرح اپنے نبی کا مدینہ (قادیان)، حاصل کر پائیں گے جو ان کا شروع وطن سے مطیع نظر ہے اور سکھ اپنے بانی گوردوانک کے مولد میں آجائیں گے۔ یہی دونوں کے اشتراک کا باعث ہوگا۔ قادیانی عالمی استعمار سے اپنی ریاست کا وعدہ ملے چکے ہیں۔ اور اس کے عوض عالمی استعمار کے گماشتہ کی حیثیت سے اسرائیل کی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے وہ مسلمانوں کی صف میں رہ کر عرب ریاستوں کی بیخ کنی اور مغربی کے

یہ افریقہ کی بعض ریاستوں میں مٹن رچا کے بیٹے ہیں۔ اور حیفا (اسرائیل) میں حکومتِ یہود کے مشیر برائے اسلامی ممالک ہیں۔ وہ پاکستان میں حکمران جماعت کے ہاتھوں، سرحد و بلوچستان کی نائنزہ جماعت کو چھوڑ کر پنجاب و سندھ میں اسلامی فہم کے قتلِ عمد سے موعودہ استقامت کی آبیاری کر رہے ہیں۔ اور اس وقت طاقتوں کی معرفت اسرائیل اور ہندوستان کے آئینہ کار ہیں اور یہ ہے اُن کا سیاسی چہرہ جس سے ان کا داخلی وجود ظاہر ہوتا ہے۔

ۛ ۛ ۛ

قومی اسمبلی کا تاریخی فیصلہ

قادیانی بزرگچہر اس گمان میں تھے کہ پیپلز پارٹی کی پناہ لے کر وہ اس مقام تک پہنچ چکے ہیں کہ پاکستان میں ان کے اقتدار کا راستہ صاف ہو چکا ہے اور آئندہ انقلاب کی غماں ان کے ہاتھ میں ہوگی۔ مرزا ناصر احمد نے اپنے میٹری رشتہ کو معنوی کرنے کے لیے انگلستان اور افریقہ کا سفر کیا اور سر ظفر اللہ کی معرفت عالمی استعمار کے ان اہلکاروں سے محنت کی جو افریشیائی ممالک میں انقلاب کی نواٹھاتے اور مختلف قوموں کے سیاسی قوی کو اپنے مہروں کی وساطت سے شہ کرتے ہیں۔ میرزا صاحب کے اس سفر کا مقصد کتابچہ شائع کیا گیا۔ اس کتابچہ میں نایم جریا کی ایک مسجد کے دروازہ پر کھڑے سے محمد رسول اللہ بدل کر احمد رسول اللہ کندہ کیا گیا تھا۔ چنان نے اس کی فوٹو سیٹ شائع کی، تو ملک میں ایک فدا پیدا ہو گیا۔ میرزائیوں نے اپنے روایتی کذب کی اساس پر فائدہ اٹھانا چاہا، لیکن جو چیز خود ان کی طاعت شدہ اس کی توجہ و تعبیر میں تو آئیں بایں شائیں کی گئی، مگر وضع طور پر اس تصویر کی تغلیط و تردید نہ ہو سکی۔ ایڈیٹر چنان کو جہ سیکرٹری نے یہ یاد کیا۔ اس نے کتابچہ دیکھ کر تصدیق کی کہ چنان کا فوٹو سیٹ درست ہے اور فرمایا کہ اس جہ نیلے و، ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی ہے۔ جس سے لار اینڈ آرڈر کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔

میرزا ناصر احمد اور اس کی شوریٰ کے ارکان ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔ انہوں نے ماضی کے واقعات بے نیاز ہو کر اپنا کام جاری رکھا اور نجی مغللوں میں تاثر دیتے رہے کہ ملک کا انقلاب اب ان کے ہاتھوں ہوگا

ملک کی ہنیت حاکم ہوں گے۔ مرزا صراحتاً نے ربوہ میں عسکری تربیت کا ڈول ڈالا اور جنگ کے تربیتی گھوڑوں کی نمائش پر انعامات کا ۹ لاکھ کیا۔ اس غرض سے گھروں کی بنا ڈالی۔ اپنے پیروؤں سے دھاتی کروڑ روپے طلب کیے اور اعلان کیا کہ رقم پانچ کروڑ ہو جائے گی اور یہ اس روپے کی پردہ پوشی کے لیے جیل تھا، جو عالمی استعمار کی معرفت ربوہ میں آ رہا تھا، لیکن اس کا بڑا حصہ غیر ملکی جنگوں کی مدد غنڈوں میں تھا۔ میرزا صراحتاً اور اس کے فرستادہ معتمدوں نے ملک بھر میں دام تزیور بچھا رکھا تھا۔ ان کے حوصلے اتنے بڑھ چکے تھے کہ ان کے فرستادہ مختلف قومی تنظیموں میں داخل ہو کر ان کی خبریں حاصل کرتے اور سیاسی تربیت دیتے تھے۔ اس زمانہ میں بعض سیاسی کارکنوں اور کئی ایک صحافیوں کو بلا واسطہ خرید کیا گیا۔ میرزائی اس حد تک بے لگام ہو چکے تھے کہ اپنی طاقت کے ہلکے ہلکے تجربے کرنے لگے۔ انہوں نے ۲۵ جنوری ۱۹۷۵ء کی صبح کو چوڑھ کی ایک مسجد میں گھس کر اس کے پیش امام کو زرد کوکب کیا۔

ایک قادیانی العقیدہ نوجوان رفیق احمد باجوہ تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں سٹوڈنٹس یونین کا صدر تھا۔ اس کی طبیعت نے قادیانیت کی سیاہ کاریاں دیکھ کر ابا کیا، تو اس کو جان بچانا مشکل ہو گیا۔ اس کے والد کو خلافت ربوہ کی طویل خدمات سے محروم ہونا پڑا وہ جان بچا کر اپنے گاؤں چوڑھ پہنچے، تو انہیں وہاں قتل کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بال بال بچ گئے۔ اور علاقائی افسر کا عالم یہ تھا کہ میرزا نایت کے رسوخ کی بدولت کوئی سی کارروائی کرنے سے معذور تھے۔ چودھری طغر اللہ خاں ۱۸ جنوری ۱۹۷۳ء کو داہگہ سے چُپ چاپ قادیان گئے۔ وہاں ہندوستان کی حکومت کے سیاسی نمائندوں اور انٹیلی جنس بیورو کے افسر علی سے ملاقات کی۔ چٹان نے اسی زمانہ میں اس کا انکشاف کیا، دوسرے کسی اخبار میں یہ خبر نہ آ سکی۔ مولانا شمس الدین بلوچستان کی صوبائی اسمبلی میں ڈپٹی سپیکر تھے۔ اُن کی عمر ۲۹ برس تھی۔ اہل ربوہ نے قرآن پاک میں تحریریت کی اور وہ نئے بلوچستان میں ترقیم کیے گئے، تو اس کے خلاف جولائی ۱۹۷۳ء میں زبردست تحریک چلی۔ بارہ روز تک فورٹ سندھین اور اس سے ملحق علاقہ نظم و نسق کے اعتبار سے معطل رہا۔ تقریباً ۲۰ علماء و گزشتہ کیے گئے۔ مولانا شمس الدین کو فوج کے زیر حراست میوند میں رکھا گیا۔ میر غلام قادر بسید نے ایک دعایت کے مطابق آپ کو وزارت اعلیٰ کی پیشکش کی کہ نظم و نسق بحال کریں۔ آپ نے پیشکش کو ٹھکرا دیا اور اپنے اس مطالبہ پر قائم رہے کہ محرف قرآن کے تمام نسخے ضبط کیے جائیں اور قادیانی بلوچستان چھوڑ دیں۔ آخر صوبائی حکومت سپر انداز ہو گئی۔ اس نے محرف قرآن کے تمام نسخے ضبط کر لیے اور قادیانیوں کو بلوچستان چھوڑنا پڑا۔ واقعہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی تاب نہ کر قادیانی خود ہی بھاگ گئے۔ کچھ لوگ کوئٹہ میں رہ گئے۔ اس دوران میں مولانا منظور احمد چنیوٹی کو مکرر گئے اور وہاں

ردِ قادیانیت کی غرض سے قرار صاحبان کے استاد قرار دیتے جو سعودی حکومت کی طرف سے بطور مدرسہ افریقہ کی مختلف ریاستوں میں جاری تھے۔ ان کی سامعی جمیدہ سے سعودی عرب کے تمام قادیانی بھاگ گئے جو ان کے علم میں تھے اور اسرائیل کی خدمت بجا لانے پر آمور تھے۔ میرزا ناصر احمد سیاسی چالوں میں مشغول رہا۔ اُس نے جماعت احمدیہ کی ایک مجلس مشاورت کو کو خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ :

”جماعت احمدیہ کی صد سالہ جوبلی کے فخذ میں ۹ کروڑ ۵۹ لاکھ سے زائد کے وعدے ہو چکے ہیں۔ مصر، انگلستان سے ڈھائی کروڑ روپے کے وعدے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ بیرونی ممالک کی احمدی جماعتوں نے ۴ کروڑ ۱۲ لاکھ ۴۵ ہزار ۴ سو ۵ روپے کے وعدے کیے ہیں۔

(الفضل ربوہ ۳۰ مارچ ۱۹۶۴ء)

ایڈیٹر چٹان نے ہر شمارے میں قادیانی امت کے سیاسی محاسبہ کو اپنا شعار بنالیا، حتیٰ کہ مرکزِ مجلس اقبال کے جلسہ میں قادیانیت کے خلاف افکارِ اقبال کی روشنی میں ایک ایسی محرکہ یا تقریر کی جس سے قادیانی ایوانوں میں تھر تھری مچ گئی۔ میرزائی اخباروں نے ایڈیٹر چٹان کے خلاف طوفانِ بدتمیزی برپا کیا اور اقتدار کے خواب کی رو میں اتنی فحش و فاش گالیاں بھجیں کہ ان کا ہر بول، میرزا غلام احمد کی قبر کا فاتح ہو گیا۔ ایڈیٹر چٹان نے ۲۸ اپریل کو ننگانہ میں تقریر کرتے ہوئے قادیانیت کے بارے میں تجزیاتی تقریر کی۔ اس میں کہا کہ میرزا غلام احمد برطانوی اغراض کا روحانی بیٹا تھا۔ قادیان میرزا نیت کا مکہ ربوہ اعصابی مرکز، تل ابیب تربیتی مرکز اور وائٹنگٹن اس کا بنک ہے۔ مکہ مکرمہ میں ۸ اپریل کو رابطہ عالم اسلامی کے زیرِ اہتمام دنیا بھر کی ایک سوزاند اسلامی تنظیموں کا ایک مشترکہ اجلاس ہوا۔ اس میں قادیانیت کو تسلیم اسلامیہ سے خارج قرار دیا گیا۔ اور اس سے متعلق دولوک قرار داد منظور کی گئی کہ اس کا وجود برطانوی استعمار کا پروردہ ہے۔ اس نے مسلمانوں کے اجتماعی مفاد سے ہمیشہ غداری کی ہے۔ اس کے معابد و مرکز کی تعمیر اسلام دشمن طاقتیں کرتی ہیں۔ اس جماعت کے پیرو، نہ صرف یہ کہ محرف قرآن مجید شائع کرتے ہیں بلکہ عرب ریاستوں میں اسرائیل کے ایجنٹ ہیں۔ اس مؤثر میں فیصلہ کیا گیا کہ اس جماعت کا ہر میدان میں مکمل بائیکاٹ کیا جائے۔ انہیں اہم سرکاری عہدوں سے الگ کر دیا جائے اور ان سے وہی سلوک کیا جائے جو دوسرے باطل فرقوں سے کیا جاتا ہے۔ ایک سوالیہ مجملہ تمام مندوبین کی زبان پر تھا کہ جب پاکستان نے اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا، تو حیفہ میں قادیانی مشن کیا معنی رکھتا ہے ؟

میرزا ناصر احمد مسلمانوں میں بیجان و اضطراب کے باوجود اپنی مہر بازی میں شغول تھا۔ کبھی اس کے فرستادہ، ملک کی سیاسی تحریکوں اور تنظیموں میں شامل ہو کر تربت کھیلنا چاہتے اور کبھی مسلمانوں کی مدافعت و مزاحمت، یا جوش و جواب کو پرکھنے کے لیے مختلف تجربے کرتے، جب انہوں نے محسوس کیا کہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی معرفت ملک کے اسلامی ذہن کو حسبِ منشاء قتل نہیں کر سکے اور نہ سیاسی اصطلاح کے مطابق دایاں بازو پر جھاڑو پھری ہے، بلکہ منبر و محراب کی دینی فضا جو ان کی محاسب قوت ہے، پہلے سے کہیں تیز ہو رہی ہے، حتیٰ کہ اوقات کی ساجد میں بھی ان کے خلاف دعوے ہوتے ہیں، تو وہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف ہو گئے۔ جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا خلیفہ ربوہ کی صدارت میں چند سبکدوش میرزائی جرنیلوں نے جمع ہو کر وزیراعظم بھٹو کے قتل کی سازش کی۔ ان کے علاوہ بعض دوسرے لوگوں کو بھی قتل کرنے یا کرانے کا منصوبہ تیار کیا گیا، لیکن یہ سب چیزیں مولانا ساجد محمود ایڈیٹر لولاک، لائل پور کے مصنفہ ذرائع سے عوام تک پہنچتی رہیں۔ چنانچہ ان تمام عزائم کو اس شد و مد سے عوام کے سامنے رکھا کہ ربوہ حیران رہ گیا کہ اس کے اسرار و دون پر وہ تمام احتیاطوں کے باوجود چنانچہ اور لولاک تک کیونکر پہنچتے ہیں۔ کئی ایک قادیانی اسی شب میں ربوہ سے نکال دیے گئے، لیکن ناصر احمد اندر خانہ اس غلط فہمی میں تھا کہ اسکی جماعت آئندہ پاکستان کی حکمران طاقت ہوگی۔ اُس نے لاہور میں اپنی جماعت کو ہدایت دیکر وائی ایم سی۔ اے ہال لاہور میں سیرتو انسٹی پر ایک جلسہ کروایا۔ اس کا صدر ایوبی دود کے ایڈوکیٹ جنرل راجہ سید اکبر کو بنایا۔ راجہ صاحب ایڈیٹر چنانچہ کے مقدمہ میں خصوصی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ اس جلسہ سے قادیانیوں کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان مزاحم ہوں، تو ان سے معرکہ رچا لیا جائے۔ اس غرض سے تمام قادیانی اپنے غنڈوں سمیت مسلح ہو کر آئے۔ لیکن قادیانی محاسبہ کمیٹی نے ان تمام نوجوانوں کو سختی سے روک دیا جو سیرتو النبی کی آڑ میں قادیانیت کی اس نمائش کو ناپسند کرتے اور راجہ سید اکبر کی صدارت سے بیزار تھے۔ میرزاہیت کا یہ جلسہ صحرائی بوند باندی کی طرح گزر گیا۔ میرزائیوں نے اپنی مترادفوں کو اس حد تک طول دیا کہ ملک غلام مصطفیٰ لکھ کی وزارت غلطی سے سبکدوشی کو بھی میرزا ناصر احمد کا ”معجزہ“ گردانتے رہے۔ معلوم نہ ہو سکا کہ ان سے ناراضی کا سبب کیا تھا۔ ملک غلام مصطفیٰ لکھ وزارت غلطی سے الگ ہو کر کوٹ کھیت کی طرف مزدوروں کے ایک مظاہرہ میں گئے، تو راجہ منور احمد ایم پی اے نے اپنی سرکاری حیثیت سے فائدہ اٹھا کر میرزائی نوجوانوں سے ان پر حملہ کر دیا اور بُری سے بُری زبان استعمال کی۔

میرزائیوں نے ایک بڑا حوصلہ یہ کیا کہ ملک غلام مصطفیٰ لکھ ایک دوست کے ہاں شادی میں لاینبور

گئے، تو ان کے خلاف وہاں ہنگامہ برپا کر لیا اور ہنگامہ کرنے والے تقریباً سبھی نوجوان قادیانی تھے۔ ان نوجوانوں نے کھر صاحب کی موٹر پر پتھر اڑا دیا۔ غرض ربوہ کی منصوبہ بندی کا خلاصہ یہ تھا کہ مختلف تجربوں کی ترازو میں تول کر مسلمانوں کا وزن معلوم کر لیا جائے کہ اب ان کی طاقت کیا ہے؟ اور وہ کس حد تک مزاحمت و مدافعت کر سکتے ہیں۔ اسی کا حصہ ربوہ ریلوے سٹیشن پر ۲۹ مئی کا سانحہ تھا۔ میرزا ناصر احمد کی شہ پر نشتر میڈیکل کالج ملتان کے لگ بھگ ایک سو طلبہ کو میرزا غنڈوں نے اس بُری طرح زد کوب کیا کہ ڈیڑھ درجن طلبہ ہلکاں ہو گئے اور جب گاڑی میرزا غلام احمد کے بزدلوں کی مشق ناد کے بعد لال پور پہنچی، تو غم و غصہ کی ایک طوفانی لہر دوڑ گئی۔ دیکھتی آنکھوں شہر سے دس ہزار افراد پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے۔ ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی بھاری جمعیت کے ساتھ آ گئے۔ انہوں نے نہایت تدبیر و فراست سے صورتِ حالات پر قابو پایا، درندہ عوام کے جذبات کو تشدد کے شعلوں کی طرح کھول رہے تھے۔ اس واقعہ کی تفصیلات یہ ہیں کہ ۲۲ مئی کو نشتر میڈیکل کالج ملتان کے ایک سو طلبہ سیاحت کی غرض سے پشاور جا رہے تھے، تو ربوہ اسٹیشن پر انہوں نے ختم نبوت زندہ باد کے نعرے لگائے۔ ان طلبہ میں ایک دو طلبہ قادیانی تھے۔ انہوں نے ربوہ کے حسبِ ہدایت پخت و پز کی اور واپسی پر ان طلبہ کی پٹائی کا فیصلہ کیا گیا، چنانچہ جب ۲۹ مئی کو چناب ایکسپریس پشاور سے چلی، تو ربوہ کے اوباش تیار ہو گئے اور گاڑی کی آمد سے پہلے تقریباً پانچ ہزار افراد، لاطھیوں، کھلاڑیوں، ہاکیوں، خنجروں، تلواروں اور پستولوں سے مسلح ہو کر پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے۔ جب گاڑی ربوہ سے پہلے نشتر آباد کے سٹیشن پر پہنچی، تو اس کے قادیانی العقیدہ اسٹیشن ماسٹر نے ربوہ کے ہم عقیدہ اسٹیشن ماسٹر کو طلبہ کی بوگی کا نشان دیا اور تیسری کو مستعد کرنے کے لیے گاڑی کی روانگی میں تاخیر کی۔ پھر جب گاڑی ربوہ سٹیشن پر پہنچی تو ان ہزار ہا افراد نے طلبہ کی بوگی پر حملہ کر دیا۔ طلبہ نے دغیانہ ہجوم کو دیکھ کر بوگی کے دروازے بند اور کھڑکیاں مقفل کر لیں، لیکن میرزا غنڈوں نے دروازے اور کھڑکیاں توڑ ڈالیں۔ اندر گھس گئے اور تمام طلبہ کو بُری طرح زد کوب کیا۔ ۳۰ طلبہ سخت زخمی ہوئے۔ نشتر میڈیکل کالج یونین کے صدر ارباب عالم کو اس تری طرح پٹیا کہ وہ بے ہوش ہو گئے۔ ربوہ کے اسٹیشن ماسٹر نے سگنل ہونے کے باوجود گاڑی کو چلنے نہ دیا۔ وہ قادیانی غنڈوں کی حوصلہ افزائی کرتا رہا۔ نو اے وقت کے نامہ نگار کی روایت کے مطابق پچاس ساٹھ قادیانی سرگودھا سے سوار ہوئے کہ اس کا رخیر میں حصہ لیں اور طلبہ کی نشت نہی کریں۔ ان حملہ آوروں میں تعلیم الاسلام کالج کے طلبہ بعض اساتذہ، اکثر دوکاندار اور کئی ایک قہرِ خلافت کے معتمدین تھے۔ انہوں نے طلبہ کی پٹائی کے علاوہ ان کا سامان چھین لیا اور مالِ غنیمت گردان

کر گئے۔ دلچسپ پہلو یہ تھا کہ میرزائی اپنے ساتھ بانزاری فطرت کی تین چار سو عورتیں بھی لائے تھے، جو طلبہ کی بیانی پر مایاں بیٹیتیں اور رقص کرتی رہیں۔ جب گاڑی لال پور پہنچی، تو ایک طوفان برپا ہو گیا۔ مسلمانوں کا احتجاج کھوں رہا تھا۔ مولانا آج خود ایک ایسی اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ عوام کو صبر و تحمل کی تلقین کی اور طلبہ کو یقین دلایا کہ جو عورتیں ان کے جسم پر لگی ہیں، وہ میرزائیت کے تابوت میں آخری میخ ثابت ہوں گی۔

ادب اس واقعہ کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جائیگا، بلکہ ربوہ کے شعبہ ہائے تعلیم کو کیفر کردار تک پہنچانے کے دم لیں گے۔ اسی وقت مولانا آج محمود اور مولانا فضل رسول نے ایڈیٹر چٹان کو فون پر ان حالات سے مطلع کیا۔ ایڈیٹر چٹان نے اگلی صبح لاہور کے مقتدر علماء اور سیاسی زعماء کا اپنے دفتر میں اجلاس بلوایا۔ اس بھر پور اجلاس میں دھواں دھار تقریریں ہوئیں اور اس امر کا فیصلہ کیا گیا کہ دو روز میں سرکردہ علماء کو جڑ کرٹے کیا جائے کہ آئندہ اقدام کیا ہو اور میرزائیت کو اس کے حقیقی مقام پر کیونکر پہنچایا جاسکتا ہے۔ لائپلپور کے علماء و زعماء اور مقامی انتظامیہ ڈپٹی کمشنر اور پولیس سپرنٹنڈنٹ نے عوام کے مشتعل جذبات کو ٹھنڈا کیا۔ چنانچہ ایچ پیس زخمی طلبہ کو سڑے کر مٹان روانہ ہو گئی۔ وہاں مجروحین کو ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ اپنے ساتھی طلبہ کو دیکھ کر دوسرے طلبہ کو سخت ہفتہ آیا۔ انہوں نے قادیانی طلبہ کو زعفران میں لے کر طارق ہوسٹل اور ایسے سینا ہوٹل سے ان کا سامان باہر نکال کر آگ لگا دی۔ پھر میٹرڈیکل ہال اور شبستان ہوٹل پر حملہ کر دیا اور کچھ نقصان پہنچایا۔ لیکن پولیس نے دونوں اداروں کو بجایا۔ اگلے روز (۳۰ مئی) کو سانحہ ربوہ کی خبر اخبارات کے ذریعہ ملک میں پھیل گئی، تو ہر جگہ میرزائیت کے خلاف لہر پیدا ہو گئی۔ اور قدیم مطالبہ میں گونج پیدا ہونے لگی کہ میرزائی مسلمانوں کا حصہ نہیں۔ انہیں خارج از اسلام قرار دیکر علیحدہ اقلیت قرار دیا جائے۔ راقم نے ۳۰ مئی سے ۱ ستمبر تک جب میرزائیت کو نیشنل اسمبلی نے اسلام سے خارج قرار دیکر علیحدہ اقلیت قرار دیا۔ اس تحریک کے متعلق تاریخ دار ایک اشاریہ مرتب کیا تھا جس سے واقعات کی رفتار کے علاوہ عوام کے جذبات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں نے اس بار وجود میں کیونکر کامیابی حاصل کی اور میرزائیوں کے جماعتی وجود کا تعین کیونکر ہوا۔ تمام روزنامہ چین و من درج ذیل ہے۔

۳۱ مئی : تمام صوبے میں ۳۰ مئی کو ربوہ کے واقعہ پر زبردست مظاہرے ہوئے۔ اکثر شہروں میں مکمل ہڑتال ہوئی۔ کئی جگہ قادیانیوں کے متعدد مکانوں اور دکانوں کو نذرِ آتش کیا گیا۔ پولیس

نے اکثر جگہ لاکھی چارج کیا۔ انسپکس چیک کی اور بعض جگہ فائرنگ کی، جس سے کئی افراد زخمی ہو گئے۔ بعض شہروں میں اکثر مظاہرین گرفتار کیے گئے۔ ہر جگہ رتوہ کو کھلا شہر اور میرزائیوں کو علیحدہ اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ حکومت سے کہا گیا کہ اس سانحہ کی عدالت عالیہ کے کسی جج سے تحقیقات کرائی جائے۔ سرگودھا میں تمام کاروبار بند رہا۔ تاجر، طلبا، مزدور اور شہری سڑکوں پر نکل آئے۔ میرزائیوں کی دکانوں پر پتھر اڑا دیا گیا۔ انہوں نے اپنی دکانوں سے ہجوم پر فائرنگ کی۔ بعض طلبہ کو پکڑ جس بے جا میں رکھا۔ زرد کو بکایا اور شدید زخمی کر دیا۔ ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کے وفد نے سانحہ رتوہ کے خلاف زبردست احتجاجی جلوس نکالا۔ جس کی قیادت بانکے صدر چوہدری محمد اکبر حمید ایڈووکیٹ نے کی۔ قاری عبد السمیع، رانا ظہور احمد، مفتی محمد طفیل گوندی اور دوسرے دانشمندان نے مختلف احتجاجی اجتماعات سے خطاب کیا اور حکومت سے مطالبہ کیا وہ سانحہ رتوہ کے تمام مجرموں کو گرفتار کر لے اور قرار واقعی سزا دلوائے، ورنہ حالات کی ذمہ داری حکومت پر ہوگی۔ پولیس نے رتوہ کے اسٹیشن پر حملہ کرنے والے نشتر قادیانیوں کو گرفتار کر کے سرگودھا جیل میں بھیج دیا۔ جن پانچ افراد نے سرگودھا میں مظاہرین پر فائرنگ کی۔ انہیں سٹی پولیس نے زیر دفعہ ۳۰۷ء معطلہ گرفتار کر لیا۔ تمام شہر میں سخت اضطراب پایا جاتا ہے۔ راولپنڈی شہر کے تمام بازار اور منڈیاں بند رہیں۔ کل صدر کے دو کمانڈر بھی احتجاجی ہڑتال کر رہے ہیں۔ شاہراہ پہلوی پر قادیانیوں کی نو مسجد اور ان کے دارالطالعہ پر تقریباً ڈیڑھ سو لوگوں نے دھاوا بول دیا۔ اس کے لڑ پیر اور فخرچہرہ آگ لگا دی۔ لائل پور میں مکمل ہڑتال رہی۔ ایک زبردست ہجوم نے کئی ایک ٹکڑیوں میں بٹ کر میرزائیوں کی دکانوں کا سامان نذر آتش کر دیا۔ تمام کالجوں، سکولوں اور ردیفیونیورسٹی کے طلباء نے کلاسوں کا بائیکاٹ کیا۔ جوم نے میرزائیوں کی بعض بڑی بڑی دکانوں کو جلا دیا۔ اکثر جگہ پولیس سے ٹکراؤ ہوا۔ بعض دکانیں مظاہرین نے لوٹ لیں۔ تمام شہر میں سیکورٹی پولیس اور ڈسٹرکٹ پولیس گشت کرتی رہی۔ مظاہرین اپنے احتجاج و اقدام میں مستعد و مشتعل رہے۔ ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن نے عدالتوں کا بائیکاٹ کرنے اور احتجاجی جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا۔ تمام سیاسی، دینی اور قومی جماعتوں نے میرزائیوں کو مسلمانوں سے الگ کئے جانے کا مطالبہ دہرایا اور حکومت پر زور دیا کہ وہ انہیں خارج از اسلام قرار دینے کا دیرینہ مطالبہ فوری طور پر قبول کرے۔ تمام جماعتوں کا ایک مشترکہ اجلاس کچہری بازار کی جامع مسجد میں منعقد ہوا۔ مفتی زین العابدین، مولانا تاج محمود، مولانا طفیل احمد، چوہدری مسعود علی رمنوی اور ملک احمد سجاد اعوان نے سانحہ رتوہ پر زبردست تقریریں کیں۔ اور

میرزائیوں سے متعلق مسلمانوں کے متفقہ فیصلہ پر صاد کیا۔ اس کے بعد ایک زبردست جلوس نکالا گیا، جو حبیب بنک کی بڑی بلڈنگ کے سامنے پراسن طور پر ختم ہو گیا۔ پولیس نے مظاہرہ کرنے کی بنا پر چالیس افراد کو حراست میں لے لیا جن میں زیادہ تر طلبہ ہیں۔ میرزائیوں کی بہت بڑی تعداد بھاگ کر توبہ چلی گئی ہے۔ ضلع کے تمام بڑے قصبوں مثلاً ٹوبہ ٹیک سنگھ، گوجرہ، کمالیہ، سمندری، جڑانوالہ، چک جھمرہ وغیرہ میں زبردست احتجاجی مظاہرے ہوئے۔ میرزائی کی دکانوں کے تجارتی سامان کو نقصان پہنچایا گیا۔ گوجرہ میں چوہان میڈیکل سٹور، رفیق میڈیکل سٹور، سگر میٹوں کی ایک اینجنسی اور کپڑے کی ایک دوکان کو جلا دیا گیا۔ شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کی گئی لیکن مظاہرین نے اپنا احتجاج جاری رکھا۔ جناح کالونی لائیبیری میں میرزائیوں کی دو کوٹھیوں کو آگ لگا دی گئی۔ پولیس نے اب تک پچاسی افراد کو گرفتار کیا ہے۔ اور کئی جگہ اشک اور گیس چھوڑ کر لامعنی چارج کر چکی ہے۔ چک جھمرہ میں زبردست مظاہرے کیے گئے۔ اس کی نواحی بستیوں میں بھی احتجاج کا زور بندھا رہا۔ اکثر جگہ میرزائیوں کی دکانوں اور مکانوں کا سامان لوٹ کر رکھ کر دیا گیا۔ مقامی میرزائی جماعت کے امیر کا جزل سٹور لوٹ کر آگ لگا دی گئی۔ یہ آگ اتنی پھیل کہ لائل پور سے فائر بریگیڈ نے پہنچ کر قابو پایا لیکن اس وقت تک پورا سٹور اور دوکان جل چکے تھے۔ ہجوم کو اس قدر غصہ تھا کہ میرزائیوں کے گھروں اور دکانوں کے دروازے، کھڑکیاں اور پھتیں تک اکھاڑ کر نذر آتش کر دیں۔ علاقہ کے بجلی گھر کا ایس۔ ڈی۔ او میرزائی تھا۔ اس کے گھر پر حملہ کیا اور سامان نکال کر آگ لگا دی۔ جڑانوالہ میں مکمل ہڑتال کی گئی، مطالبات کا اعادہ کیا گیا۔ رحیم یار خاں میں مکمل ہڑتال رہی اور ایک زبردست جلوس نکالا گیا۔ جھنگ میں جمعیت العلماء اسلام کے زیر اہتمام احتجاجی جلوس نکالا گیا۔ سارا شہر بند رہا۔ سلا نوالی میں مظاہرے ہوئے، حتیٰ کہ طالبات نے بھی جلوس نکالا۔ تمام قصبے نے ہڑتال کی۔ خانیوال میں نوجوانوں اور طالب علموں نے زبردست مظاہرہ کیا اور بلاک مل میں واقع احمدیہ لائبریری کو آگ لگا دی۔ ایک میرزائی عورت نے ہجوم پر فائرنگ کی۔ عوام نے پتھر اڑا دیے۔ پولیس نے حالات کو بگڑنے سے بچایا۔ شہر میں ہڑتال رہی۔ سکیورٹی پولیس کے مسلح دستے گشت کر رہے ہیں۔ کئی ایک نوجوانوں کے ملحدہ طالب علم رہنما طارق جاوید کو گرفتار کر لیا گیا۔ کمالیہ میں دو میل لمبا جلوس نکلا اور پراسن مظاہروں کے بعد منسٹر ہو گیا۔ ساہیوال میں بارہ بجے دوپہر سے مکمل ہڑتال ہے۔ تمام تنظیموں کے اجلاس میں میرزائیوں کو اقلیت قرار دینے اور سانحہ ربوہ کی تحقیقات کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ چنیوٹ میں زبردست جلوس نکالا گیا۔ شاہ میڈیکل سٹور کے قادیانی العقبہ مالک کے مکان

کی چھت سے جلوس پر شدید غنٹ باری کی گئی، جس سے جھوم بے قابو ہو گیا اور شہر میں میزرائیوں کی تمام دکانوں کو شاہ میڈیکوز سیت نذر آتش کر دیا۔ ایک قادیانی العقیدہ دندان ساز کے مکان سے جلوس پر اندھا دھند فائرنگ کی گئی، جس سے متعدد طلباء زخمی ہو گئے۔ تین کی حالت نازک بیان کی جاتی ہے۔ شہر میں مکمل ہڑتال ہے جو کل بھی جاری رہے گی۔ گجرات میں ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن اور مختلف دینی رہنماؤں نے زبردست رد عمل کا اظہار کیا۔ کئی ایک جلوس نکالے گئے اور حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اس سلسلے میں مسلمانوں کے مطالبات کو بلا تاخیر منظور کرے۔ ملتان میں انتظامیہ نے کالج کے ہسٹل بند کر دیے اور طلباء کو فوری طور پر گھروں میں چلے جانے کا حکم دیا ہے۔ تمام شہر میں ڈسٹرکٹ پولیس کے ہمراہ سیکورٹی پولیس گشت کر رہی ہے۔ پولیس نے چھ طالب علم لیڈروں کے علاوہ کئی ایک افراد کو دفعہ ۴۴ کی خلاف ورزی اور ڈیفنس آف پاکستان روزے کے تحت گرفتار کیا ہے۔ شہر میں ایک بکے دن سے مکمل ہڑتال ہے۔ ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن نے ربوہ کو کھلا شہر قرار دینے اور سانحہ ربوہ کے حقیقی مجرموں پر مقدمے قائم کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔

پنجاب اسمبلی میں حزب اختلاف کے ارکان نے سانحہ ربوہ کے پیش نظر حکومت سے مطالبہ کیا کہ میزرائیوں کو فوراً اقلیت قرار دیا جائے، انہیں کلیدی آسامیوں سے سبکدوش کر دیا جائے اور ربوہ سٹیشن کے سانحہ کی تحقیقات اعلیٰ سطح پر ہو۔ جموں کو عبرت ناک سزا دی جائے۔ اس بحث میں چودہ ارکان نے حصہ لیا۔ مسلمان رحمت اللہ ارشد اپوزیشن لیڈر نے نہایت شاندار الفاظ میں میزرائیت کا تجزیہ کیا۔ سید تابش اور سنی معرکہ آرا تقریر کی۔ ملک خداداد بن دیاں نے پرجوش خیالات کا اظہار کیا۔ حاجی محمد سیف اللہ نے مسلمانوں کے جذبات کی نمائندگی کی۔ مخدوم زاہد حن محمود نے بھی تائیدی تقریر کی۔ حافظ علی اسد اللہ نے اقرار کیا کہ میزرائی پاکستان میں عجمی اسرائیل قائم کرنا چاہتے ہیں۔ میاں خورشید انور چودھری امان اللہ، خان زاہد خان محمد وغیرہم نے اپوزیشن کے دوسرے لیڈروں کی ہم نوائی میں تحریک ہائے التوا کی تائید کی۔ لیکن سپیکر نے بیکہر لہجہ بارت ندی کو مستند عدالت میں پیش کر دیا گیا ہے۔ اس پر حزب اختلاف کے ارکان نے کھڑے ہو کر ختم فتوہ زندہ باد کے نعے لگائے۔ آج پھر قادیانیت کے مسئلے کو ایک تحریک کی شکل دینے کے لیے دفتر چٹان لاہور میں مقامی علماء و زعماء کا ایک اہم اجلاس ہوا، جس میں سیاسی جماعتوں کے نمائندے بھی شریک تھے۔ اس میں اجلاس کو ایک وسیع شکل دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ گورنمنٹ کالج، اسلامیہ کالج اور ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے طلباء نے احتجاجی مظاہرے کیے۔ دفعہ ۴۴ کی خلاف ورزی کرنا چاہی، تو پولیس والوں نے

انسوکس چھوڑ کر انہیں منتشر کر دیا۔ یونیورسٹی نیو کمپس کے ہوشوں میں سے قادیانی طلبہ کو مسلمان طلبہ سے نکال کر بھاگ لاہور کے تبارقی مراکز میں ہڑتال رہی اور نصف دن کے بعد تمام بائیس بند ہو گئیں۔ گنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج، فاطمہ جناح میڈیکل کالج، انجینئرنگ یونیورسٹی اور دوسرے تمام کالجوں کی سٹوڈنٹس یونینوں نے ربوہ کی جارحیت کے خلاف احتجاج کیا اور قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ کیے جانے کا مطالبہ دہرایا۔ جمعہ کے روز تمام کالج احتجاجاً بند رہے۔ تمام شہر میں میرزاہیت کے خلاف غم و غصہ کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ تمام ہوشل بند کر دیے گئے۔ قادیانی طلبہ بھاگ گئے۔ پنجاب یونیورسٹی کو ماتحت کالجوں سمیت غیر معین عرصے کے لیے بند کر دیا گیا۔ گنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے ہوشل سے قادیانی طلبہ کو نکال دیا اور ان کے بند کمروں سے سامان اٹھ کر نذر آتش کر دیا گیا۔ سپر سائنس کالج وحدت روڈ سے بھی مسلمان طلبہ نے قادیانی طلبہ کو فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ انجینئرنگ یونیورسٹی کے طلبہ نے ایک میرزائی کی کار کو نذر آتش کر دیا۔ فائر بریگیڈ نے آگ پر قابو پانا چاہا تو طلبہ نے خشت بارش کی ایک کار چل کر راکھ ہو گئی۔ دو گھنٹے تک جی بی روڈ پر ٹریفک بند رہا۔ مسٹر جاوید ہاشمی سابق صدر پنجاب سٹوڈنٹس یونین نے طلبہ کو پرامن رہنے اور احتجاج کو منظم کرنے کی تلقین کی۔ مسٹر اے وزیر اعلیٰ پنجاب نے واقعہ ربوہ کی عدالتی تحقیقات کا حکم دیدیا۔ چیف جسٹس سردار محمد اقبال نے اس غرض سے مسٹر جسٹس کے۔ ایم۔ صمدانی کو تحقیقاتی افسر مقرر کیا ہے۔ راقم نے مقامی زعماء کے ساتھ شہر کا دورہ کیا اور مسلمانوں کے جذبات سے آگاہی حاصل کی۔ تمام حلقہ خیال پر مشتمل مجلس عمل قائم کرنے کے لیے مولانا تاج محمود اور مولانا محمد شریف جالندھری کے مشورے سے ملک کے مختلف اکابر کو تار دیے گئے۔ راقم نے بعض قانونی گذارشات کے سلسلے میں جسٹس کے۔ ایم۔ صمدانی کے علاوہ چیف جسٹس سردار محمد اقبال سے ملاقات کی اور اس سلسلے میں انکوائری کے حدود معلوم کئے۔ اور مسلمانوں کے تمام فرقوں کی طرف سے تحقیقات میں تعاون کا یقین دلایا۔

محکم جان :- مسٹر جسٹس کے۔ ایم۔ صمدانی نے ۳۱ مئی کو تحقیقات کے دائرہ کار کا اعلان کیا۔

مسٹر حنیف رائے نے ایک بیان میں کہا کہ تحقیقاتی رپورٹ کی روشنی میں واقعہ ربوہ کے کسی مجرم کو معاف نہیں کیا جائیگا۔ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے ایک بیان میں کہا کہ عوام تحقیقاتی رپورٹ کی اشاعت کا انتظار کریں۔ چودھری ظہور الہی نے واقعہ ربوہ پر قومی اسمبلی میں تحریک التوا پیش کی۔ میاں طفیل محمد امیر جماعت اسلامی نے ایک بیان میں کہا کہ میرزاہیت کی جماعت قرار دیکر اس پر پابندی لگا دی جائے، کیونکہ ان کی جماعت موجودہ حکومت اور ملک کی سالمیت کے خلاف سازش کر رہی ہے۔ لاہور کی تمام مساجد میں نماز جمعہ کے

اجتماعات میں قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے اور سانحہ رتوہ کے ظروموں کو کمیز کر داترک پہنچانے کا مطالبہ کیا گیا۔
 پیر پکا ڈاشرلیف نے لاہور پہنچ کر مسلم لیگ لائزز سرکل کے افتتاحی اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ واقعہ
 رتوہ کے نتائج بہت خطرناک ہو سکتے ہیں۔ پولیس نے مسٹر جاوید ہاشمی کو اس "جرم" میں گرفتار کر لیا کہ انہوں
 نے مسلمان طلباء میں قادیانی طلباء کے خلاف اشتعال پیدا کیا اور ان کا سامان جلوا دیا ہے۔ لائل پور کے حالات
 احتجاج کے عروج پر پہنچ گئے۔ بین سوچین اشخاص کو گرفتار کیا گیا۔ پولیس کی فائرنگ سے ایک شخص ہلاک اور دو زخمی
 ہو گئے۔ انسپورس کا گولہ لگنے سے ایک شخص انتقال کر گیا۔ مسلمانوں نے زبردست احتجاجی جلوس نکالے کئی قادیانیوں
 کے مکان، دوکانیں اور پارکوں وغیرہ جلادی گئیں۔ ایک احمدی مقبول احمد نے رونا آباد میں ایک شخص غلام محمد
 کو گولی چلا کر شہید کر ڈالا۔ اس کی فائرنگ سے ایک عورت بھی شدید زخمی ہو گئی۔ لوگوں نے اُس کے مکان پر تہ
 بول کر سامان جلا ڈالا۔ لائل پور کی گلشن کالونی میں سفینہ پرنٹنگ مل کے قادیانی عقیدہ مالکان کی خوبصورت
 کوئٹہ کو نذر آتش کر دیا گیا۔ ان کی کار کے علاوہ دوسرا سامان بھی جھٹک گیا۔ ایک اور قادیانی طور احمد کی کوئٹہ
 جلادی گئی۔ اُس کی کار کے علاوہ ہزاروں روپے کا سامان نذر آتش کیا گیا۔ اس نے مسلمانوں پر گولیاں برساتیں
 تھیں۔ غلام محمد آباد میں میرزائیوں کے متعدد مکان جلادیے گئے اور ان کا سامان آگ میں جھونک دیا گیا۔ تمام
 دن میرزائیوں کے مکانوں اور دوکانوں کو لوگوں نے اُن کی فائرنگ کے جواب میں ایندھن کی طرح پھونکا۔
 ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن نے میرزائیت کے خلاف احتجاجی جلوس نکالا۔ زرعی یونیورسٹی کے طلباء نے بھی مظاہرہ
 کرنا چاہا، لیکن پولیس نے لالھی چارج کر کے جلوس کو منتشر کر دیا۔ عوام کے احتجاج و اضطراب اور غم و غصہ
 کا دریا ٹٹا ٹٹس تار تار ہوا۔ ان میں زیادہ اشتعال اس سے پھیلا کہ میرزائیوں کے ہر گھر میں اسلحہ تھا اور وہ
 بے خوف ہو کر مسلمانوں پر فائرنگ کرتے تھے۔ شہر بے قابو ہو گیا، تو وزیر اعلیٰ پنجاب مسٹر حنیف رائے نے
 آئی۔ جی پولیس کو حکم دیا کہ وہ لائل پور کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ بہاول پور میں مکمل ہڑتال رہی۔
 زبردست احتجاج کیا گیا۔ ایک قادیانی عقیدہ پٹرولیم سروس پر مشتمل ہجوم نے پتھروں کے مظاہرہ کیا۔
 مسٹر فریدی پراچہ صدر پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین نے سرگودھا میں حکومت کو متنبہ کیا کہ وہ رتوہ کو
 کھلا شہر قرار دے اور میرزائیوں کو مسلمانوں سے الگ کر دے؛ ورنہ طلباء تحریک چلانے پر مجبور ہو جائیں
 گے۔ شاہ کوٹ میں مکمل ہڑتال رہی۔ گجرات میں زبردست احتجاجی مظاہرے کیے گئے۔ شاہ کوٹ میں مکمل ہڑتال
 رہی۔ وزیر آباد میں زبردست مظاہرہ ہوا۔ میانوالی میں طلباء نے ہڑتال کی اور جلوس نکالا۔ شہر میں کشیدگی بڑھ

گئی۔ پولیس گشت کر رہی ہے۔ تمام ضلع کی تحصیلوں سے میرزائی دُوم دبا کر بھاگ رہے ہیں۔ جیم بارخاں میں احتجاجی جلوس نکالا گیا۔ ڈسٹرکٹ جیمسٹریٹ نے منتشر ہونے کا حکم دیا۔ عوام مشتعل ہو گئے۔ انہوں نے شاہی روڈ کے ایک قادیانی ہوٹل اور بکلی کی ایک دکان پر خشت باری کی۔ پولیس نے آنسو گیس چھوڑی، جو جم نے پان کی ایک دکان کو آگ لگا دی۔ پولیس نے جامع مسجد قلعہ منڈی میں بھی گیس کے گولے چھوڑے۔ چند مظاہرین گرفتار کئے گئے۔ ڈسٹرکٹ بارالیوسی ایشن نے واقعہ ربوہ پر شدید احتجاج کیا۔ بمبکرتیں زبردست احتجاج کیا گیا۔ علاقے میں دفعہ ۴۴ لگا دی گئی۔ گورنمنٹ کالج کے طلباء نے ایک پُر امن جلوس نکالا۔ ایک زبردست جلسہ عام کیا گیا۔ پشتیاں میں طلبہ نے جلوس نکالا۔ استغاثہ نے روکنا چاہا، نتیجتاً پولیس اور طلباء میں بڑھ چڑھائی ہوئی، جو نصف گھنٹہ جاری رہی۔ آٹھ طلباء گرفتار کیے گئے، اس پر باقی طلباء نے مورچہ لگا دیا، تو انہیں فوراً رہا کر دیا گیا۔ میرزا غلام احمد کا پتیلا جلا دیا گیا۔ شہر نے اگلے روز مکمل ہڑتال کی۔ مارف والا میں زبردست جلوس نکالا۔ ایک قادیانی ڈاکٹر خالد ہاشمی کی دکان پر قبول دیا اور فریچر وغیرہ کو آگ لگا دی۔ اگلے روز پھر جلوس نکالنے کا اعلان کیا گیا۔ پسرور میں مکمل ہڑتال کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ خانیوال میں احتجاج جاری ہے۔ ساہیوال میں نماز جمعہ کے بعد جلوس نکالا گیا۔ ٹاؤن ہال میں جلسہ ہوا۔ لوگوں نے اپنے مطالبات کا اعادہ کیا۔ چنیوٹ کی احمدیہ مسجد پر مسلمانوں نے قبضہ کر لیا۔ اُس کا نام مسجد نبوت رکھا۔ تمام شہر نے وہیں نماز جمعہ ادا کی۔ تحریک طلباء اسلام کے مرکزی صدر ملک رب نواز نے دو گھنٹے تک تقریر کی، اس کے بعد ستر ہزار افراد پر مشتمل جلوس نکالا گیا۔

ڈپٹی کمشنر اور ایس۔ بی جھنگ نے پریس کانفرنس میں انکشاف کیا کہ ربوہ، لایاں، اور شہر آباد کے ایشن ماسٹروں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ حافظ آباد میں زبردست احتجاجی اجتماع ہوا اور طعنے قضیات میں عظیم مظاہر کیے گئے۔ اکثر جگہ میرزائیوں کی مختلف دکانوں کو جلا دیا گیا۔ سیالکوٹ میں زبردست مظاہرے کیے گئے۔ ظہور الحق سینٹر کو بعض افراد نے چاقوؤں سے زخمی کرنا چاہا۔ اس کے دفتر کو آگ لگا دی۔ حافظ آباد اور گوجرانوالہ کے مابین ٹریفک معطل ہو گیا۔ عوام نے احمدی مسجد گوجرانوالہ کا محاصرہ توڑنے سے انکار کر دیا، کہ اس مسجد سے میرزائیوں نے مسلمانوں کے جلوس پر پتھراؤ کیا تھا۔ تمام مساجد سے احتجاجی جلوس نکالے گئے۔ پولیس نے لوگوں کو منتشر کرنے کے لیے آنسو گیس استعمال کی۔ یکم جون کو مکمل ہڑتال کا اعلان کیا گیا۔ رات گئے گوجرانوالہ کے حالات بے قابو ہو گئے۔ میرزائیوں کی آٹھ دکانیں اور پانچ مکان جلا دیے گئے۔ اس خرابی کا باعث خود قادیانی تھے۔ جنہوں نے مسلمانوں کے پُر امن جلوس پر پتھراؤ کر کے ابتداء کی۔ گوجرانوالہ کے

حالات قابو سے بالا ہو گئے۔ راولپنڈی میں احتجاجی جلوس نکالے گئے۔ مسلمانوں نے راولپنڈی اور سری میں میزائل کی دو مسجدوں پر قبضہ کر لیا۔ اسلام آباد میں احتجاجی ہڑتال کی گئی۔ چھ افراد کو حراست میں لے لیا گیا۔ بہاول نگر کے طلباء نے پُرجوش مظاہرہ کیا۔ میرزائیوں کی دوکانوں کو نقصان پہنچایا۔ صوبہ کے تقریباً سبھی اضلاع کے دیہات و قصبات سے میرزائیوں کے فرار ہو جانے کی اطلاعیں آرہی ہیں۔ حکومت سخت پریشان ہے۔ میزائل نے مختلف اجتماعات میں شریک ہونے کے لیے اپنے کھنٹ چھوڑ رکھے اور لاہور بھارتی کے علاقے میں اپنے دو خفیہ مرکز قائم کیے ہیں جہاں دن میں چار دفعہ رتوہ سے قاصد آتے۔ خفیہ پیغام لاتے اور خفیہ دستاویزے جاتے ہیں۔ سیکورٹی پولیس مختلف مقامات پر متعین کر دی گئی ہے۔ لاہور آتش فشاں پہاڑ کی طرح خاموش ہے۔ علماء و زعماء مسلمانوں میں گھوم پھر کر انہیں صبر کی تلقین کرتے اور دو ایک روز میں ہونے والی مجلس مشورت کے فیصلے تک پُرسکون رہنے کی اپیل کرتے ہیں۔ لاہور کو قابو میں رکھنا آسان نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم ہے کہ اس کے نوجوان (دباستخار) ہمارے ساتھ محبت کرتے ہیں۔ قادیانی اسی کوشش میں ہیں کہ خونخوار فساد برپا ہو، نہ جانے کیوں؟

۲ جون :- حکومت پنجاب نے تختہ امن قائم آرڈیننس کے تحت تمام اخبارات و مطابع اور لٹریچر پر پابندی عائد کر دی ہے کہ نہ تو واقعہ رتوہ سے متعلق کوئی رد عمل ظاہر کیا جائے۔ نہ کوئی خبر دی جائے۔ اور نہ کوئی تبصرہ ہو۔ اس حکم کے مطابق ایسی تمام خبروں، تبصروں، بیانیوں، اطلاعات، تقریروں، کارٹونوں اور اظہارِ خیال وغیرہ کی مانعت کر دی ہے۔ حکومت کی مخصوص اصطلاح کے مطابق فرقہ وارانہ لٹریچر شائع کرنا ممنوع قرار دیا ہے۔ نوائے وقت نے اپنے ادارہ کے دونوں کالم سینڈ چھوڑ دیے ہیں۔ اس حکم کے متعلق روایت یہ بیان کی گئی ہے کہ خان عبدالقیوم خاں وزیر داخلہ کی ربوہ دوستی کے باعث ایسا ہوا ہے۔ میرزا ناصر احمد نے جنرل انتخابات میں احکامات جاری کیے تھے کہ جہاں پیپلز پارٹی کا امیدوار نہ ہو یا پیپلز پارٹی کے مقابلہ میں خان عبدالقیوم خاں کے امیدوار کا پتہ بھاری ہو، وہاں تمام قادیانی خان عبدالقیوم کے امیدوار کا ساتھ دیں۔ صوبہ کے تمام اضلاع میں میرزائیوں سے مسلمانوں کی ناراضی پھیلی جا رہی ہے۔ اب حرمہ، سندھ اور بلوچستان سے بھی رد عمل کی خبریں آنے لگی ہیں۔ مسٹر مہٹس کے ایم۔ محمدانی نے اشتہار کے ذریعہ ۵ جون کو صبح ۹ بجے سے ساتھ رتوہ کی تحقیقات شروع کرنے کا اعلان کیا، اور متعلقہ شہادتیں طلب کی ہیں۔

۳۱ جون :- بعض میرزائیوں کی طرف سے قبول اسلام کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ وہ مختلف اخباروں میں اشتہار دینے لگے ہیں۔ سنسکر کی شدید پابندیوں کے باوجود صوبہ بھر میں سانحہ رتوہ کا شدید رد عمل موجود ہے۔ پولیس کو اس رد عمل کے تدارک کی خاطر وسیع پیمانے پر گرفتاریوں کے احکام دیئے جا رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ سانحہ رتوہ نے قادیانیت کے خلاف دلولہ پیدا کر دیا ہے اور تحریک تمام ملک میں احتجاج کی شکل اختیار کر چکی ہے۔

۳۲ جون :- صوبہ کے حالات جوں کے توں ہیں۔ بعض شہروں میں جزدی ہڑتال ہوئی۔ لاہور کی مسجد وزیر خاں میں ایک جلسہ کے انعقاد کا اعلان کیا گیا، لیکن اس سے پہلے آفا شورش کاشمیری، نوابزادہ نصر اللہ خاں، چوہدری غلام جیلانی، ملک محمد قاسم، سید محمود احمد رضوی، علامہ احسان الہی ظہیر، سید ظفر علی شمش اور علامہ عزیز انصاری گرفتار کر لیے گئے۔ ان سب کو دریائے روای کے ریسٹ ہاؤس میں رکھا گیا۔ مولانا عبید اللہ انور مسجد وزیر خاں میں پہنچ گئے۔ حاضرین سے خطاب کیا۔ اُس کے بعد لوگوں نے جلوس نکالنے کی کوشش کی، تو پولیس اور جہوم میں تصادم ہو گیا۔ آنسو گیس استعمال کی گئی۔ جہوم نے بعض جگہ آگ لگا دی۔ شب کے آغاز میں زیر حراست رہنماؤں کو رہا کر دیا گیا۔ قومی اسمبلی میں واقعہ رتوہ سے متعلق التوا کی بات چٹکیں مسترد ہو گئیں۔ اپوزیشن کے ارکان ختم نبوت زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے واک آؤٹ کر گئے۔ سپیکر نے اعلان کیا کہ احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کے لیے آئین میں ترمیم کرنا ہوگی۔ صوبہ کے جہان کے پیش نظر وزیر اعلیٰ نے اعلان کیا کہ صورت حال خراب کرنے والوں سے کما حقہ نیپٹا جائے گا۔ پنجاب کے علاوہ باقی صوبوں سے بھی میرزائیوں کے خلاف غم و غصہ کی خبریں آرہی ہیں اور احتجاج کے مظاہروں کا زور بندھ چکا ہے۔

۳۱ جون :- مجلس مہمانی نے واقعہ رتوہ کی تحقیقات شروع کر دی۔ جن رہنماؤں کو کل گرفتار کیا تھا، ان کے متعلق میاں خورشید انور اور مسٹر تابش الوری نے تحریک التوا پیش کیں۔ سپیکر نے مسترد کر دیں۔ اپوزیشن نے علامتی واک آؤٹ کیا۔ صوبہ کے حالات اسی طرح بے قابو ہیں۔ بہاول پور اور حضرو میں پولیس نے احتجاجی جلوسوں پر لاکھٹی چارج کیا۔ آنسو گیس بھینکی۔ اکثر شہروں میں ہڑتال رہی۔ سرگودھا میں آتش زنی کی وارداتیں ہوئیں۔ پولیس نے میرزا ناصر احمد سے تعیناتی رابطہ قائم کیا۔

۳۱ جون :- میرزا ناصر احمد نے ہائی کورٹ میں ضمانت قبل از گرفتاری کی درخواست دی۔ حزب اختلاف کے باریانی گروپ نے حکومت کو پانچ مطالبات پیش کیے، جن میں قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے

کا مطالبہ بھی تھا۔ نوابزادہ نصر اللہ خاں نے ایک بیان میں واقعہ ربوہ کی شدید مذمت کی اور وزیر اعظم و وزیر اعلیٰ سے سوال کیا کہ انہوں نے اس واقعہ کی مذمت کیوں نہیں کی؟

۸۔ **رجوان** :- مٹر حنیف رائے نے ایک بیان میں صوبہ کی صورت حال کو ناقابلِ برداشت قرار دیا۔ میاں طفیل محمد نے ایک بیان میں کہا کہ ربوہ کی ریاست اندر ریاست ختم کی جائے۔ اسلام آباد میں مظاہرین نے زبردست مظاہرہ کیا۔ پولیس نے عوام کو مشیل اسبل تک جانے سے روکا۔ لاٹھی چارج کیا۔ انسپیکٹر جینٹی۔ لاہور میں نیلہ گنبد کی مسجد سے نماز جمعہ کے بعد جلوس نکالا گیا۔ ۳۲ افراد گرفتار کر لیے گئے۔ رحیم یار خاں کے علاوہ کئی علاقوں آتش زنی کی وارداتیں ہوئیں۔

صوبائی وزیر اعلیٰ _____

ان سب نے وزیر اعظم سے کہا کہ ہم قادیانیوں کے سلسلہ میں اپنے موقف نے تقریباً دو اڑھائی سو ملین روپے خرچ کیے۔ ان سب نے وزیر اعظم سے کہا کہ ہم قادیانیوں کے سلسلہ میں اپنے موقف سے دستبردار نہیں ہوں گے۔ ربوہ اور چنیوٹ کے درمیان ٹریفک پر اوقاتِ شب میں پابندی لگا دی گئی۔ ربوہ کی دیواروں پر قادیانیوں نے عبارتِ مذکورہ کہ ہے ”خدا اپنی فوجوں کے ساتھ آ رہا ہے“ طغرانہ خاں نے لندن میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے الزام لگایا کہ حکومت پنجاب قادیانیوں کے جان و مال کا تحفظ کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ حکومت اس سلسلے میں غیر جانبدار نہیں ہے۔ عالمی اداروں سے اپیل کی کہ وہ حالات کا جائزہ لینے کے لیے بمقام پاکستان بھیجیں۔ ایک اور اطلاع ہے کہ طغرانہ خاں اور ایم۔ ایم۔ احمد وزیر اعظم سے ملاقات کے لیے راولپنڈی پہنچ گئے ہیں۔

۹۔ **رجوان** :- ہم اس سلسلے میں مسلسل کوشش کر رہے تھے کہ اخبارات پر پابندی کے باعث حالات کا سدھار ممکن نہیں بلکہ انوائس فزٹی حالات کا باعث ہو سکتی ہیں۔ وزیر اعلیٰ نے تمام سلسلہ کی پابندی ختم کر دینے کا اعلان کیا، لیکن صوبہ سندھ کی پابندیاں بدستور قائم ہیں۔ وہاں یہ پابندیاں پنجاب سے پہلے عاید کی گئیں اور اس حکم تحت نوئے وقت اور چٹان کے پرچے سندھ کے مختلف سیشنوں پر ضبط کیے جاتے رہے۔ جسٹس ممدانی کی تحقیقات جاری ہے۔ تحریک استقلال کے مرکزی دفتر نے اپنے کارکنوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ قادیانیوں کے خلاف تحریک میں بھرپور حصہ لیں۔

۱۰۔ **رجوان** :- مرزا ناصر احمد نے آل انڈیا ریڈیو کے نشریہ کے مطابق ایسوسی ایٹڈ پریس امریکہ کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ قادیانیوں کے خلاف فسادات بھٹو کی پارٹی نے کر لئے ہیں اور اس طرح حکمران جماعت

اپنی بگڑی ہوئی ساکھ بھال کرنا چاہتی ہے۔ مرزا صاحب نے مزید کہا کہ خواہ وہ قتل ہو جائیں، لیکن اپنے مسلک سے دستبردار نہیں ہوں گے۔ بی۔ بی۔ سی نے ایک خصوصی پروگرام میں تسلیم کیا کہ پاکستان میں قادیانی فرقے کے خلاف تحریک کا زور ہے۔ اس سے پہلے قادیانی انگریزوں کے مفاد کی خدمت کر کے اپنا وجود قائم رکھ سکتے تھے۔ ”
صوبائی وزیروں میں سے کئی ایک نے اپنا بھجہ بدل لیا اور مسلمانوں کی تائید کرنے لگے ہیں۔ مسٹر صادق ملی وزیر مواصلات نے کہا ہے کہ مسٹر بھٹو اسلام کے اصولوں کے مطابق قادیانی مسئلہ حل کر دیں گے۔ حوام کو ان پر اعتماد کرنا چاہیے۔ ۱۹ جون کو ملک کی ائمہ دینی اور سیاسی جماعتوں کا مشترکہ اجلاس حضرت مولانا احمد علی کی مسجد مدینہ میں منعقد ہوا، جو صبح دس بجے سے ۳ بجے سہ پہر تک جاری رہا۔ اس میں اکثر و بیشتر اکابر نے شرکت کی۔
مولانا مفتی محمد، مولانا یوسف بنوری، مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف، نوابزادہ نصر اللہ خاں، چوہدری غلام جیلانی اور آفا شورش کشمیری نے ساری صورتِ حالات کا جائزہ لیا۔ آخر طویل بحث کے بعد شورش کشمیری کی تحریک و تجویز پر قادیانیوں کے اقتصادی و عمرانی بائیکاٹ کا فیصلہ کیا گیا۔ مجلس عمل قائم کی گئی اور مسلمانوں کے دیرینہ مطالبات کو حتمی جوش و خروش کے ساتھ دہرایا گیا۔ نیز فیصلہ کیا گیا کہ چودہ جون کو ملک گیر ہڑتال کی جائے۔ متحدہ جمہوری محاذ نے اگلے روز مکمل ہڑتال کی تائید کی۔

۱۲ جون - تمام ملک میں قادیانیوں کے اقتصادی اور عمرانی بائیکاٹ کا خیر مقدم کیا گیا اور دلولہ نیگر تحریک پیدا ہو گئی۔ ایک روز پہلے گیارہ جون کو شورش کشمیری نے وزیراعظم سے طویل ملاقات کی۔ انہیں مسلمانوں کے جذبات سے آگاہ کیا۔ قادیانی مسئلے کی بے تفصیل وضاحت کی اور انہیں مجلس عمل کے جتید علماء سے ملاقات پر آمادہ کیا تاکہ وہ جملہ کوائف سے آگاہ ہو سکیں۔ مرزا غلام احمد کے وعادی پر اشتہارات کا ایک وسیع سلسلہ شروع ہو گیا۔ وزیراعظم کے زیرِ صدارت اس مسئلہ پر ایک اعلیٰ سطح کا اجلاس ہوا۔ بدوہ میں قادیانیوں کے خود ساختہ ڈپٹی کمشنر اور ایس۔ پی گرفتار کر لیے گئے۔ ملائی پور ہول سیل کلاتھ مرچنٹ ایسوسی ایشن نے قادیانی کے سماجی بائیکاٹ کا اعلان کیا۔ وزیراعظم نے ایک ہفتہ پہلے تمام علماء سے اپنی ملاقاتیں مکمل کیں۔ گزشتہ شب وزیراعظم بھٹو کی تقریر نے عوام کو بے حد متاثر کیا۔ وزیراعظم نے کہا کہ جو شخص غمِ نبوت پر ایمان نہیں رکھتا وہ مسلمان نہیں ہے اور قادیانیوں کا مسئلہ حل کرنے کا شرف ان شاء اللہ انہیں حاصل ہو گا اور یہی اعزاز انہیں خدا کے حضور رُخِ خود کر دے گا۔ وزیراعظم نے کہا کہ وہ اس مسئلے کو جولائی کے پہلے ہفتے میں قومی اسمبلی کے سامنے پیش کر دیں گے اور پارٹی کے ارکان پر کسی عنوان سے کوئی دباؤ نہیں ڈالا جائے گا۔ وزیراعظم کی

اس نشری تقریر کو لوگوں نے جوق در جوق سنا اور تحسین و تائیں کا اظہار کرتے ہوئے اس تاثر کا اظہار کیا کہ وزیراعظم نے صحیح طریق کا منتخب کیا ہے۔ مٹر بھٹونے ۱۸ جون تک لاہور میں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔ ظفر اللہ خاں نے لندن میں عزیز احمد سے ملاقات کی۔ مولانا محمد یوسف بنوری نے ۱۹ جون کو لائل پور میں مجلس عمل کا اجلاس طلب کیا۔ اسلامی جمیعت طلباء نے اپنے صدر مٹر ظفر جمال بلوچ اور دوسرے عہدہ داروں کی قیادت میں تحریک کو رواں دواں کرینیکا فیصلہ کیا اور والہانہ طور پر منہمک ہو گئے۔

۱۴ جون۔ آج تمام ملک میں قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کے مطالبے کی حمایت میں ہڑتال ہوئی۔ اتنی بڑی ہڑتال اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ اس ہڑتال کو ریفرنڈم سے تشبیہ دی گئی۔ مسجد وزیر خاں میں ایک زبردست جلسہ ہوا جس میں مولانا عبدالستار خاں نیازی، نوابزادہ فضل اللہ خاں، شورش کاشمیری، اسید منظر علی شمس، مولانا عبید اللہ انور، علامہ احسان الہی ظہیر اور سید محمود احمد رضوی نے معرکہ آراء تقریریں کیں، پوزیشن کے ارکان نے بھی عام ہڑتال کے سلسلے میں سہلی کے امروزہ سیشن کا بائیکاٹ کیا۔ ایئر مارشل اصغر خاں نے کہا کہ ہم برسرِ اقتدار آگئے، تو قادیانیوں کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں گے۔ دوسرے تمام مندوبوں میں قادیانیوں کے مکمل بائیکاٹ کی تحریک پھیل چکی ہے۔ سرحد اور بلوچستان کے میرزائی بھاگ کر ربوہ میں پناہ لے رہے ہیں۔ راولپنڈی، اسلام آباد اور گجرات میں تائیں متنازع علماء گرفتار کر لیے گئے۔ پولیس ان کے مکانات میں دیواریں پھانک رہی ہوئی۔ ان علماء میں حضرت مولانا غلام اللہ خاں اور سید محمود گجراتی شامل ہیں۔ مولانا غلام اللہ خاں کی گرفتاری کے خلاف راولپنڈی میں زبردست احتجاج کیا گیا۔ پوزیشن قومی اسمبلی سے واک آؤٹ کر گئی۔

۲۰ جون۔ سرحد اسمبلی نے اتفاق رائے سے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی سفارشی قرارداد منظور کی ہے۔ تمام ملک میں قادیانیوں کے بائیکاٹ کی تحریک زور پکڑ چکی ہے۔ اباب عالم صدر سٹوڈنٹس یونین نشتر میڈیکل کالج ملتان نے جنس ممدانی کی عدالت میں بیان دیتے ہوئے انکشاف کیا کہ قادیانیوں نے ملک میں مارشل لا لگوانے کے لیے ربوہ ریلوے سٹیشن پر ہنگامہ کیا تھا۔ لائل پور اور دادو گجرانوالہ کے ضلعی افسروں سے معلوم ہوا کہ لاہور سے ایک قادیانی العقیدہ بریگیڈ ترائن کے پاس جاناہرہاکر وہ اپنے ستر کو اس کی تحویل میں دیدیں لیکن انہوں نے صوبائی حکومت کے احکام کی عدم موجودگی میں ایسا کرنے سے انکار کیا۔ راولپنڈی کے جن علماء کو گرفتار کیا گیا تھا، انہیں رہا کر دیا گیا ہے۔

۲۲ جون۔ قادیانی مسئلے سے متعلق لوگوں کے جذبات بے پناہ ہو گئے ہیں۔ حکومت نے مری میں

اعلیٰ سطح کی کانفرنس کے بعد کئی ایک اہم فیصلے کیے۔ جن میں ربوہ کو کھلا شہر قرار دینے کا فیصلہ بھی شامل ہے اور ان قادیانیوں کی فہرستیں تیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جو کلیدی آسامیوں پر فائز ہیں۔ لائل پور میں ایک قادیانی نے انڈیا ڈھند فائرنگ کر کے دو مسلمانوں کو زخمی کیا جس سے صورت حال میں توجہ پیدا ہو گیا۔

۲۳ جون :- وزیراعظم بھٹو نے آرمی ایجوکیشن کور کے سالانہ ڈنر سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ حکومت قادیانیوں کے مسئلے کو مستقل طور پر حل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ ایک سرکاری ترجمان نے مرزا ناصر احمد اور ظفر اللہ خان کے الزامات کو بے بنیاد قرار دیا اور بتایا کہ غیر ملکی اخبارات میں حقائق کو مسخ کیا جا رہا ہے۔ لائل پور میں مسلمانوں پر میرزائیوں نے فائرنگ کی۔ ۴۲ افراد گرفتار کر لیے گئے۔ جن میں ۱۹ میرزائی اور ۲۳ مسلمان ہیں۔ ڈی ٹا پ کا فونی میں محکم ہڑتال رہی۔ تمام صوبے میں مجلس عمل کے زیر اہتمام عظیم الشان جلسے ہو رہے ہیں۔ مسٹر جاوید ہاشمی نے بہاولپور میں اعلان کیا کہ ہم وزیراعظم بھٹو کو تحریک ختم نبوت کا مخالف ہرگز نہیں سمجھتے۔ مرزا ناصر احمد امریکی اخباروں کو پاکستان کے خلاف مسلسل بیان دے رہے ہیں۔ جسٹس مہمانی کی عدالت میں مسٹر صالح نور کے بیان سے قادیانی پریشان ہو گئے ہیں۔

۲۸ جون :- قادیانی اپنے بائیکاٹ کی تحریک سے بڑھ چکے ہیں۔ جامعہ الازہر مصر نے قادیانیوں کے خارج از اسلام ہونے کا فتویٰ صادر کیا ہے۔ علامہ ارشد اور ان کے بعض ساتھیوں نے پنجاب اسمبلی میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی تجویز پیش کی۔ اس قرار کو اپر پیمپل پارٹی اور اپوزیشن کے متراکمان نے مشترکہ طور پر دستخط کیے، لیکن صوبائی سپیکر نے اجازت دینے سے انکار کیا۔ راولپنڈی میں مجلس عمل کا اجلاس طلب کر لیا گیا۔

۳۰ جون :- میرزائی اپنے مقابلہ کی تحریک سے سخت پریشان ہیں اور انہیں اپنی تقدیر سامنے نظر آ رہی ہے۔ جسٹس مہمانی کی عدالت میں تحقیقات جاری ہے۔ مجلس عمل نے ۲۸ جون کو اپنے اجلاس میں قادیانی مسئلے کے حل میں تاخیر پر تنویر شمس کا اظہار کیا اور اس سلسلے میں کل ہی قومی اسمبلی میں ایک بل پیش کرنے کا اعلان کیا، چونکہ وزیراعظم بھٹو ڈھاکہ میں ہیں۔ اس لیے اس بل کے مسئلے میں ایک آدھ دن کا التواء ہو سکتا ہے۔ سندھ میں آباد قادیانی اپنی جماعت کی وسیع اراضی میں پناہ لے رہے ہیں اور ان تمام شہروں کو چھوڑ چکے ہیں جہاں مسلمانوں کی دینی محبت کے چراغ روشن ہیں۔

۳۰ جون :- اسلام آباد میں قومی اسمبلی کا اجلاس منعقد ہوا جس میں قادیانیوں کو خارج از اسلام

ایتیت قرار دینے کے لیے حزب اقتدار اور حزب اختلاف نے متفقہ طور پر ایک خصوصی کمیٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ تمام ارکان قومی اسمبلی کے ممبر ہوں گے۔ ان کی تعداد ۴۰ ہوگی۔ امدان میں ۱۰ رکن اپوزیشن کے ہوں گے۔ وزیراعظم جیٹو اجلاس میں شریک ہونے یعنی تفصیلات طے کرنے کے لیے اجلاس دو گھنٹہ ملتوی کیا گیا۔ اس کے بعد اپوزیشن کی قرارداد اور سرکاری تحریک دونوں متفقہ طور پر منظور کر لی گئیں خصوصی کمیٹی کے اجلاس خفیہ ہوں گے اجلاس آج ہی شروع ہو گئے۔ طریق کار وضع کر لیا گیا۔ مجلس عمل نے تحریک میں توانائی پیدا کر دی ہے۔ کوئی سرکاری یا غیر سرکاری شخص میرزا نیت کی بلا داسطہ تو کیا، بالواسطہ حمایت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ کراچی سے پشاور تک جلسہ ہائے عام منعقد کیے جا رہے ہیں۔

۷ جولائی: شورش کشمیری کو حکومت پنجاب نے دلغیس آف پاکستان روز کے تحت گرفتار کر لیا۔ چونکہ شورش کشمیری سخت بیمار تھا، لہذا گرفتار کنندہ جسرٹھ اور پولیس افسرانہیں میوہسپتال کے البرٹ وکرو بلاک میں لے گئے اور وہاں پولیس کے زبردست پہرہ میں رکھ دیا۔ چنان کا ڈیپارٹمنٹ منسوخ کر دیا گیا۔ چنان پولیس کے علاوہ شورش کشمیری کے بچوں کا پولیس مسود پر نظر بھی منبٹ کر لیا گیا۔ تازہ شمارہ کی تمام کاپیاں بھی قادیانیت کی پہرہ کشائی کے مجرم میں منبٹ کی گئیں۔ نوائے وقت واحد روزنامہ ہے جو ختم نبوت کی تحریک میں مسلمانوں سے ہم آواز ہے اور ان کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کر رہا ہے۔ نوائے وقت نے سنسر شپ پر نکتہ چینی کی اور لکھا ہے کہ اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ باقی تمام اخبارات نمیشنل پریس ٹرسٹ کے اخوش میں ہونے کے باعث متعاذیر پر ہیں۔ اکثر ایڈیٹر ہمارے ساتھ ہیں، لیکن ملازمت کے ہاتھوں مجبور و محصور ہیں۔

انگریزوں کے زمانے سے لے کر آزادی کے اس دور تک صرف چنان ہی کو یہ شرف حاصل ہوا اور اس کے ایڈیٹر کے لیے باعث فخر دنا ہے کہ مسند ختم نبوت میں دو دفعہ اس کے پریس منبٹ کیے گئے۔ چنان کا ڈیپارٹمنٹ منسوخ ہوا اور شورش کشمیری قید کر لیا گیا۔ یہ پہلی اور آخری مثال ہے۔ پنجاب اسمبلی میں حزب اختلاف کے ڈپٹی لیڈر میاں خورشید انور، میاں طفیل محمد اور مولانا عبدالستار نیازی نے حکومت کے اقدام کی مذمت کی ہے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے فرزند سید عطاء الحسن بھی اس سلسلہ میں گرفتار کر لیے گئے۔ نوائے وقت نے ہداریہ لکھا اور مرکزی مجلس عمل نے زبردست احتجاج کیا ہے۔ لاہور کی جامع مسجد نیکہ گنبد میں زبردست احتجاجی جلسہ ہوا، جس میں نواب زادہ نصر اللہ خاں، مولانا محمد یوسف بنوری، علامہ سید محمد احمد رضوی، پروفیسر غفور احمد، سید مظفر علی شمس، مولانا تاج محمد، حافظ عبدالعزیز، علامہ احسان الملیٰ ظہیر اور مولانا محمد اعلیٰ خاں

نے شورش کشمیری کی گرفتاری اور چٹان پریس کی منبلی پر تقاریر کیں۔ میسرزائیوں کا معاشرتی مقاطعہ شباب پر ہے۔

♦ ♦ ♦

۱۶ جولائی :- ملک میں تحریک ختم نبوت اپنے اوج پر ہے۔ حکومت کے بعض گوشے میرزائیوں کے معاشرتی مقاطعہ سے سخت پریشان ہیں اور مختلف لہجہ میں مختلف اپیلیں کرتے ہیں۔ کبھی دھمکاتے ہیں اور کبھی وعظ کرتے ہیں کہ اسلام میں معاشرتی بائیکاٹ نہیں ہے۔ گویا اسلام کی تعلیمات حکام و وزراء اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں۔ مہدائی کیشن میں میرزا ناصر احمد کی شہادت ہونے والی ہے۔ فاضل جج نے حکومت کی استدعا پر تحقیقات کا طریق کار بدل دیا اور گواہوں سے دھماکے کی بجائے خود سوال کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ بعض وزراتی و سرکاری گوشے میرزائیوں کا مقاطعہ ختم کرانے کے لیے کئی ایک حلقوں میں لیا پوتی کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک مصدقہ اطلاع کے مطابق گوجرانوالہ کے مشہور صاحبزادہ فیض الحسن اور کراچی کے نعیر احمد جتوئی وغیرہم کی خدمات حاصل کی جا رہی ہیں۔ دکان دونوں نے بعد ازاں معاشرتی بائیکاٹ کے سلسلہ میں بالواسطہ میرزائیت کی امداد کی لیکن تحریک اب ایک مٹا نہیں مارتا ہوا مسند ہو چکی ہے۔

۱۶ جولائی :- آج جسٹس مہدائی کی عدالت میں میرزا ناصر احمد کا بیان قلمبند کیا گیا۔ تمام بیان عدالتی احکام کے تحت، میخدرانہ میں سات گھنٹہ جاری رہا۔ شورش کشمیری کی نگر بندی اور چٹان پریس کی منبلی کے خلاف خواجہ عبدالرحیم باریٹ لار نے بٹ داخل کی اور سماعت کی تاریخ ۲۴ جولائی مقرر ہوئی۔ خواجہ صاحب کے علاوہ شیخ مقبول احمد ایڈووکیٹ، چودھری رفیق احمد باجوہ ایڈووکیٹ اور مسٹر آفتاب فرخ پیش ہوئے۔ واضح رہے کہ مسعود پرنٹنگ پریس، آنریبل چیف جسٹس سردار محمد اقبال کے حکم سے بٹ داخل ہوتے ہی دکانر ہو گیا۔ آنریبل چیف جسٹس نے ایڈووکیٹ جنرل کو بلا کر کہا کہ کل صبح گیارہ بجے تک پریس واپس کر دو اور دن فیصلہ دے کر احکام صادر کر دو نگا۔ حکومت کا کوئی کیس نہیں۔ مسعود پرنٹنگ کو ناجائز طور پر سر ممبر کیا گیا ہے۔

۲۰ جولائی :- حکومت کے میرزائی نواز عناصر نے اپنی ایک بے پالک ایجنسی کو ہزار ہا روپیہ دے کر مولانا محمد یوسف بنوری صدر مجلس عمل کے خلاف تمام اخباروں میں ایک اشتہار چھپوانا شروع کیا۔ اشتہار ایک فرضی انجمن کی طرف سے بے معنی اور پوچھ تھا۔ نوائے وقت نے چھاپنے سے انکار کر دیا۔ اس اشتہار کو دیکھ کر عوام بھڑک اٹھے۔ چودھری رفیق احمد باجوہ کی درخواست پر مسٹر محمد نظامی ایڈیٹر نوائے وقت

اور مسٹر مکین احسن کلیم ایڈیٹر مشرق کو جسٹس مہدانی نے شہادت کے لیے طلب کیا۔ مسٹر عبد نظامی نے مشہورین کی قسمی کھول دی۔ اس کے بعد یہ اشتہار بند ہو گیا۔ جسٹس مہدانی نے ربوہ کا معائنہ کر کے اس کی معیشت عرفی معلوم کی۔ مرزا ناصر احمد نے ملاقات کی خواہش کی اور قعر خلافت میں کھانے پر مدعو کرنا چاہا۔ لیکن آپ نے دونوں درخواستیں ٹھکرا دیں کہا جاتا ہے جسٹس مہدانی کو اس معائنہ میں عجیب و غریب معلومات حاصل ہوئی۔

۲۴ جولائی :- مرزا ناصر احمد نے قومی اسمبلی میں اپنا بیان مکمل کر لیا۔ اس بیان سے پیپلز پارٹی کے غیر جانبدار ارکان اس درجہ برا فروختہ ہیں کہ انہوں نے میرزا ناصر احمد پر کئی بار درشت لہجہ میں جرح کی اور اس کے بعض گستاخانہ کلمات پر ارکان حاضر نے سخت الفاظ میں ٹوکا۔ تمام ارکان قادیانیت کے خارج اناسلام ہونے پر متفق ہیں۔ میرزاویت کے خلاف حکومت کے مختلف محکموں میں بھی شدید قسم کے جذبات پیدا ہو چکے ہیں۔

۲۵ جولائی :- شورش کشمیری نے ۲۵ جولائی کو جسٹس مہدانی کی عدالت میں قادیانی اُمت کے بارے میں شہادت دی۔ شورش کشمیری پولیس کی حراست میں بیماری کے باوجود پیش ہوا اور ان تمام راز سے مرتبہ کا انکشاف کیا جس کے مطابق قادیانی اپنے سیاسی اقتدار کے لیے عالمی اور قومی سطح پر عمل کر رہی ہیں۔ یہ شہادت پانچ گھنٹہ جاری رہی عجیب و غریب انکشاف ہوئے۔ انفوس کہ حکومت نے منہر عائد کر رکھا ہے اور شاعت روک دی ہے۔

۲۶ جولائی :- ایڈیٹر چٹان کو روکا کر دیا گیا۔ حکومت نے چٹان اور پریس کی ضبطی کے احکام بھی واپس لے لیے۔ مہدانی ٹریبونل میں مزید پانچ گواہوں کے بیانات قلمبند کیے گئے۔

شورش کشمیری بدستور بیمار ہے۔ ذیابیطس نے کئی عوارض پیدا کر دیے ہیں۔ اُسٹھ، چلتے، پھرنے کی طاقت مفقود ہو چکی ہے۔ اقرباء ڈاکٹروں کے مشورے سے گھر لے جا رہے ہیں۔ وزن اتنا ٹوٹ چکا ہے کہ سہ نصف معلوم معلوم ہوتا ہے۔

۲۹ جولائی :- مسٹر حنیف رائے وزیر اعلیٰ نے ایک بیان میں کہا ہے کہ قادیانیوں کا مسئلہ مسلمانوں کی خواہش کے مطابق ہمیشہ کے لیے حل کر دیا جائیگا۔ قادیانی مقاطعہ اپنے عروج پر ہے۔ ربوہ کی ناکہ بندی ہو چکی ہے۔ مسلمان کسی قادیانی کے ہاتھ کوئی چیز فروخت نہیں کرتے اور نہ ان سے کوئی چیز لیتے ہیں۔

۳۱ جولائی :- وزیر اعظم بھٹو نے مستونگ (بلوچستان) میں اعلان کیا کہ قادیانی مسئلہ کے فیصلہ کی تاریخ کا اعلان کل کر دیا جائے گا۔ اور قومی اسمبلی کا فیصلہ قطعی ہو گا۔ وزیر اعظم نے بلوچستان کے دورہ میں محسوس کیا کہ عوام قادیانیت کے متعلق کس قدر نازک جذبات رکھتے اور اس مسئلہ کا فوری حل چاہتے ہیں۔ ۳ جولائی

کو صہانی ٹریبونل نے اپنی تحقیقات مکمل کر لی۔ فاضل جج نے ایک ماہ اور ۲۵ دن کام کیا اور ساتھ رپورٹ اور اس کے متعلقات کے بارے میں تمام معلومات حاصل کیں۔ اب رپورٹ کا انتظار ہے۔ تحریک پنجاب میں شدت سے جاری ہے۔ حکومت اکثر جگہ قادیان ختم نبوت کو گرفتار کر رہی ہے۔

دیکھ اگست - جس صہانی کی عدالت میں شورش کشمیری نے ۲۵ جولائی کو جو بیان دیا تھا۔ فاضل ٹریبونل نے ۳۱ جولائی کو اس کے بعض اجراء پریس کے حوالے کر دیے۔ شورش کشمیری نے عدالت کو مرزائی وکلاء کے متناکرہ سوالات کے جوابات میں کہا جماعت احمدیہ کے سربراہ میرزا ناصر احمد کی صدارت میں بعض سرکردہ قادیانیوں نے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے قتل کا فیصلہ کیا تھا۔ مسٹر ایم۔ ایم۔ احمد کے ایک رشتہ دار کے گھر سے دائر لیس ٹرانسکریپٹ برآمد ہوا تھا۔ شورش کشمیری نے کہا کہ مسٹر بھٹو کے قتل کی سازش خود حکومت کے علم میں ہے۔ ایئر مارشل ظفر چودھری نے اپنی سبکدوشی کے بعد مسٹر بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹنے کا فیصلہ کیا۔ رپورٹ کا واقعہ آزمائشی طور پر کیا گیا۔ قادیانی جانا چاہتے تھے کہ حکومت کا رپورٹ اور عوام کا رد عمل کیا ہوتا ہے۔ فاضل جج نے شورش کشمیری سے سوال کیا کہ رُوسی سفارت خانے کے کسی افسر کے ساتھ اس کی ملاقات ہوئی تھی؟ شورش کشمیری نے کہا۔ بالکل نہیں! شورش کشمیری کو بعض وکلاء نے بتایا کہ میرزا ناصر احمد نے رُوسی سفارت خانے کے ایک افسر سے شورش کشمیری کی ملاقات کا افسانہ وضع کر کے عدالت کو تاثر دینا چاہا کہ ان کے خلاف صوبہ بھر میں جو تحریک چل رہی ہے وہ صوبے کے نظم و نسق کو درہم برہم کرنے کی ایک سازش ہے۔ اس کی غایت مسٹر بھٹو کی حکومت کو ختم کرنا ہے۔ شورش کشمیری نے اس کی پرورد روید کی اور فاضل جج سے کہا کہ وہ حکومت کی منی جنس بیورو سے اس بارے میں جتنی معلومات حاصل کر سکتے ہیں کیونکہ اس قسم کے واقعات اس کی احتسابی نگاہ میں ہوتے ہیں۔ شورش کشمیری نے منایت و ثوق سے کہا کہ قادیانی مسٹر بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کر چکے تھے۔ ادا کاٹھ میں مجلس ختم نبوت کے ایک سو کارکن گرفتار کیے گئے۔ پولیس کے تشدد کے خلاف ادا کاٹھ کے شہریوں نے مسلسل چار روز ہڑتال کی۔ تمام سائبرہال میں احتجاجی جلسے ہو رہے ہیں۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے ایک بیان میں کہا کہ قادیانی مسئلہ حل کرنے میں تاخیر ہوئی تو اپوزیشن تو ایسی کہ بائیکاٹ کر دی گئی۔ مسٹر بھٹو نے خاران میں بیان دیا ہے کہ وہ جمعہ کے روز کوئٹہ میں پریس کانفرنس کے دوران قادیانی مسئلے کے سلسلے میں روشنی ڈالیں گے۔ مسٹر حنیف ماسے کوئٹہ پہنچے تو پریس کے نمائندوں نے ان سے مختلف سوال کیے۔ انہوں نے کہا کہ ختم نبوت کا مسئلہ عالم اسلام کا مسئلہ ہے۔ بلوچستان میں قادیانی مسئلے کو جدوجہد کی خصوصیت حاصل ہو

گئی ہے۔ اس مسئلے کے حل کی تاریخ متین کرنے کے لیے اعلیٰ سطح کی کانفرنس منعقدہ کوئٹہ میں غور و خوض کیا گیا۔ ایک اندرونی اطلاع کے مطابق تمام صوبوں کے وزرائے اعلیٰ اور گورنرزمیرزائیوں کو اقلیت قرار دینے پر زور دے رہے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ ہر صوبہ کے حالات اس مسئلہ میں یکساں ہیں۔ اداکارہ میں سیکورٹی فورس کی فائزنگ سے چار آدمی زخمی ہوئے۔ جامعہ عثمانیہ میں نازیوں پر تشدد کیا گیا۔ اس سلسلے میں ہائی کورٹ میں رٹ داخل کی گئی۔ حکومت نے ۳۱ جولائی کو سنسر شپ کی میعاد مزید ایک ماہ کے لیے بڑھادی، جس کی وجہ سے اخبارات میں تحریک کی خبریں نہیں آرہی ہیں، لیکن تحریک سارے ملک میں پھیل چکی ہے۔

۵ اگست :- لاہور میں دفعہ ۱۴۲ کے باعث باغات میں جلے نہیں ہو سکتے، لہذا مختلف مساجد میں دھڑا دھڑ جلے ہو رہے ہیں۔ ہر روز تین چار جلے منعقد کیے جاتے۔ مسٹر بھٹو نے کوئٹہ میں اعلان کیا ہے کہ قادیانی مسئلہ بہتر شکل حل کر دیا جائے گا۔

۶ اگست :- قومی اسمبلی کی خصوصی کمیٹی نے مرزا ناصر احمد سے مزید معلومات حاصل کیں۔ بھلاس تین گھنٹے ہماری رہا۔ راولپنڈی میں مختلف مساجد تحریک کا مرکز ہیں۔ اسلام آباد کی جامع مسجد میں ہر روز قادیانی مسئلے پر تقاریر ہوتی ہیں۔

۷ اگست :- اداکارہ کے حالات مزید خراب ہو گئے ہیں۔ پولیس نے دفعہ ۱۴۲ کی خلاف ورزی کے سلسلے میں بیسے لوگوں کو گرفتار کیا۔ اکثر مقامات پر علماء اور طلباء کو دھڑا دھڑ پکڑا جا رہا ہے۔ مولانا غلام علی اکاڑوی کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ جماعت اسلامی کی مجلس عاملہ نے سنسر ختم کرنے، گرفتار شدگان کو رہا کرنے اور قادیانی مسئلہ مستقل طور پر حل کرنے کی قرارداد پاس کی ہے۔ قومی اسمبلی کے دو اجلاسوں میں مرزا ناصر احمد پر سات گھنٹے جرح کی گئی۔

۱۳ اگست :- ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لاہور نے دو ماہ کے لیے جلے، جلوس اور ایسی تقریریں ممنوع کر دی ہیں، جو قادیانی مسئلے سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن مجلس عمل کے ارکان اپنی تحریک کے سلسلے میں بدستور منہمک ہیں اور شہر کی دیواروں پر قادیانیت کے خلاف مختلف نعرے کندہ ہیں۔

۱۹ اگست :- مفتی محمود نے ایک بیان میں کہا کہ پولیس کا تشدد جاری رہا تو پوزیشن خصوصی کمیٹی کا بائیکاٹ کر دے گی۔ مجلس عمل نے اسیر علماء، اسیر طلباء اور اسیر کارکنوں کی رہائی کا پُر زور الفاظ میں مطالبہ کیا ہے۔ پٹنڈی میں میانوالی سے رہا ہو کر آنے والے طلباء کے استقبالوں پر پولیس نے لاشعری چارج کیا۔ بے تحاشہ آفکوس

پھوٹی۔ کئی افراد زخمی ہو گئے۔ جو مسلے پولیس پر پتھر اڑا کیا۔ پنجاب یونیورسٹی میں سٹوڈنٹ یونین کے صدر فرید احمد پراچہ نے طلباء سے پُر غرض خطاب کیا اور اعلان کیا کہ طلباء تحریک کو کامیاب کر کے دم لیں گے۔

۲۱ اگست :- مولانا ٹریبونل نے اپنی رپورٹ وزیر اعلیٰ کو پیش کر دی۔ موہانی حکومت اپنی سفارشات کے ساتھ وفاقی حکومت کو بھیج دے گی۔ رپورٹ ٹائپ شدہ ایک سو بارہ صفحات اور چھ جلدوں پر مشتمل ہے۔

۲۵ اگست :- میرزا ناصر احمد پر قومی اسمبلی میں گیارہ روز کی جرح مکمل ہو گئی۔ ثقلہ راویوں کا بیان ہے کہ عوام کو مرزا صاحب کا بیان معلوم ہو جائے، تو مرزا صاحب پاکستان میں نہیں رہ سکتے۔ بہر حال میرزا نیوں کا خارج از اسلام ہونا یقینی ہو چکا ہے۔ مفتی محمود نے گجرات میں مجلس ختم نبوت کے زیر اہتمام ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم قادیانی مسئلہ کے بارے میں قومی اسمبلی کی کارروائی سے مطمئن ہیں۔ قومی اسمبلی کی خصوصی کمیٹی نے انجمن احمدیہ اشاعت اسلام کے سربراہ پر سات گھنٹے تک جرح کی۔

۳۱ اگست :- مولانا محمد یوسف بنوری صدر مجلس عمل نے لبنان سے ایک بیان میں کہا ہے کہ ختم نبوت کے مسئلے سے کسی سیاسی جماعت کو فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ یہ ایک دینی مسئلہ ہے اور پوری وقت اسلامیداس میں شریک ہے۔

۴ ستمبر :- مولانا ابوالاعلیٰ امریکہ سے واپس آ گئے اور تحریک کے پہلے جلسے کو خطاب کیا۔ یہ جلسہ شاہی مسجد لاہور میں منعقد ہوا۔ حاضرین ڈیڑھ دو لاکھ کے لگ بھگ تھے۔ حضرت مفتی محمود اور مولانا مودودی کی تقاریر میں ان کے ہزارہا حقیقت مندوں نے جوش و خروش کا اظہار کیا۔ مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا عبدالحق اکوڑہ خٹک، مولانا عبدالتار نیازی، سید مصطفیٰ الازہری، مولانا محمد یوسف بنوری، مولانا محمود احمد رضوی، علامہ احسان الہی ظہیر، سید مظفر علی شمس، اور سید ابو ذر بخاری نے فیتہ الاشرار اجتماع سے خطاب کیا۔ تحریک ختم نبوت کے مسئلے میں گرفتار شدگان کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا۔ مولانا ٹریبونل کی رپورٹ شائع کرنے پر زور دیا گیا۔ تمام مقررین نے اعلان کیا اور عوام نے نعرہ تھکیے سے تائید کی۔ کہ، ستمبر کا فیصلہ عوامی خواہشات کے مطابق نہ ہوا، تو تحریک چلائی جائے گی۔ مسلمان ناموس رسالت کی خاطر ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہیں۔ ختم نبوت کی مخالفت ان کا جہر و ایمان ہے۔ ستمبر کا دن حکومت کے علاوہ عوام کے منتخب نمائندوں کی آزمائش کا دن ہے۔ اس جلسے سے حکومت پر ثابت ہو گیا کہ وہ مسئلہ ختم نبوت کے بارے میں نہ تو گوگو کی پالیسی اختیار کر سکتی ہے اور نہ مسلمان کسی ملامت یا مصلحت کو قبول کرنے پر آمادہ ہوں گے۔ واضح رہے کہ تحریک ختم نبوت کے مسئلے میں دس جولائی کو کھاریاں

کے ایک گاؤں میں دو نوجوان غلام نبی اور محمد یوسف پولیس کی فائرنگ سے شہید ہو گئے تھے۔ اس کا الزام محمد شریف چیمہ سپرنٹنڈنٹ پولیس پر عائد کیا گیا۔ اس کو بدل کر ساہیوال میں سپرنٹنڈنٹ لگا دیا گیا۔ آج کل ایک تحقیقاتی ٹریبونل اس کی تحقیقات پر مامور ہے لیکن عوام اس کو محض اٹک شوقی سمجھتے ہیں۔ اس واقعہ سے سخت نفرت پھیل ہوئی ہے۔ نہ جانے اس ناگوار فعل سے چپٹم پوٹھی کا سبب کیا ہے ؟

۶ ستمبر: ختم نبوت کے مسئلے پر اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے لیے صوبہ بھر میں طلباء نے ۶ ستمبر کو علامتی ہڑتال کی، ۶ ستمبر کا مبارک دن آگیا۔ قادیانیوں کو قومی پارلیمنٹ نے متفقہ طور پر غیر مسلم اقلیت قرار دیدیا۔ اس بے نظیر فتح پر تمام ملک میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ لوگوں نے ہر شہر میں مٹھائی بانٹی، ہر کہیں مسلمانوں نے اپنے مکانوں پر چراغاں کیا۔

اس فتنے سالہ مسئلے کو حل کرنے کے لیے قومی اسمبلی کی خصوصی کمیٹی نے دو ماہ میں ۲۸ اجلاس کیے اور ۹۶ گھنٹہ کی نشستیں جمائیں۔ مولانا مفتی محمود، مولانا شاہ احمد نورانی، پروفیسر غفور احمد، چوہدری ظہور الہی، مسٹر مولا بخش سمرو اور ان کے رفقاء نے مسیح و شام کی مساعی سے وہ تمام لٹریچر جمع کیا، جو خصوصی کمیٹی کے لیے ضروری تھا۔ ان رہنماؤں کے سرکاری کمرے مجلس عمل کا سب آفس بنے رہے۔ مولانا محمد شریف جالندھری کی زیر سرکردگی اسلام آباد میں ماہرین قادیانیت کا عملہ شب در روز کام کرتا رہا۔ وہ تمام لٹریچر جو اس عرصہ میں میرزاویت کے متعلق شائع ہوا، قومی اسمبلی کے ارکان میں تقسیم کیا گیا۔ میرزاویوں کو اقلیت قرار دینے سے متعلق یادداشت تیار کی گئی، جس میں میرزاویت کی پوری تاریخ کے علاوہ، اس کے عقائد و اعمال کا پورا پورا نقشہ تھا۔ تمام ارکان اسمبلی کو راقم کے دونوں کتابچے، عجمی اسرائیل اور فتار اسلام پہنچا دیے گئے؛ حتیٰ کہ ملک کے ہر سفارت خانے کو ان کے انگریزی اور عربی ایڈیشن مہیا کیے گئے۔ راقم نے اس دوران میں اپنی شدید علالت کے باوجود ایک ایسا خط تیار کیا جو قادیانیت کے متعلق ایک تاریخی دستاویز تھا۔ دنیا کی ہر حکومت کے سربراہ، وزیر خارجہ، پاکستان، میں ان کے سفارت خانوں اور تمام ممالک کے نامور جرائد کو وہ خط بھیجا گیا۔ اس خط میں قادیانیت کی تاریخ کے علاوہ اس امر کی وضاحت کی گئی کہ قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کا مسئلہ ہماری دینی وحدت، سیاسی استحکام اور ہماری قومی سالمیت کی بقا کا مسئلہ ہے۔ ہم ان کو اس لیے بھی علیحدہ اقلیت کے طور پر شمع کرنا چاہتے ہیں کہ ان سے ہماری قوم اور ہمارے ملک کو شدید خطرات ہیں۔ اس فرقہ کے لوگ استعمار و اسرائیل کے فتنہ کالم ہیں۔ سر ظفر اللہ خان کے ان بیانات پر جو انہوں نے لندن میں انگریزی پریس کو دیے اور جن کے

کاشتے دفتر چٹان کو دوستوں نے بھیجے۔ راقم نے لندن ٹائمز اور گارڈین کے ایڈیٹروں کو خط لکھے۔ ان سے کہا کہ منظر اللہ خاں نے جھوٹ بولا ہے۔ وہ قادیانی محاسبہ کمیٹی کے خراج پر اپنے نمائندے پاکستان بھیجیں جو خود منور محل کا مشاہدہ و مطالعہ کریں۔ ان ایڈیٹروں نے لکھا کہ یہ مسئلہ پاکستان کا داخلی مسئلہ ہے۔ ہم اس میں جانبدار نہیں اور نہ ہمیں نظر اللہ خاں کے اسلوب فکر سے کوئی دل چسپی ہے۔

قوی اہلی نے میرزا ناصر محمد پراون بک ۴۴ لکھنے اور مرزا غلام احمد کی لاہوری شاخ کے امیر پر سات گھنٹہ جرح کی۔ اس دوران میں وزیر اعظم اور وزیر قانون سے اپوزیشن کے متذکرہ راہنماؤں نے کئی ملاقاتوں میں مذاکرات کئے اور چار پانچ دفعہ نازک موڑ بھی آئے۔ آخری رات تصادم کا اندیشہ لاحق ہو گیا اور مجلس عمل کے راہنما سر کبھت ہو کر قید و بند کے لیے تیار ہو گئے، لیکن فضل ایزدی سے اتفاق رائے ہو گیا اور وزیر اعظم نے الفاظ کا حکم و فلک چھوڑ کر مجلس عمل کے پارلیمانی نمائندوں کی تجویز پر صاد کیا، چنانچہ ۲۷ ستمبر کو بجکر ۳۵ منٹ پر قادیانیوں کی دونوں شاخوں کو اقلیت قرار دے کر دائرۂ اسلام سے خارج کر دیا گیا۔ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے قائد ایوان کی حیثیت سے ۲۷ منٹ تک وضاحتی تقریر کی۔ مسٹر عبدالغنیذ پیرزادہ وزیر قانون نے اس سلسلہ میں آئینی ترمیم کا تاریخی بل پیش کیا اور جب بل متفقہ رائے سے پاس ہو گیا، تو حزب اقتدار و حزب اختلاف کے ارکان آپس میں فرط مسرت سے بغل گیر ہوئے۔ ان کے چہرے خوشی سے تڑپ اٹھے، حتیٰ کہ وزیر اعظم بھٹو اور دلی خاں گر جووشی سے ملے۔ اس کے بعد سینٹ نے بھی پورے آٹھ بجے اجلاس شروع کر کے آٹھ بجکر ۱۰ منٹ پر صاد کیا۔ تمام ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ لوگ فرط مسرت سے دیوانہ ہو گئے۔ شیرینی تقسیم کی گئی اور جگہ جگہ آتش بازی چھوڑی گئی۔

وزیر اعظم بھٹو نے اپنی تقریر میں کہا کہ منکرین ختم نبوت کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا فیصلہ پوری قوم کی خواہش کا ایسیستہ دار ہے۔ اس مسئلہ کو دبانے کے لیے ۱۹۵۳ء میں ظالمانہ طور پر طاقت استعمال کی گئی تھی۔ اس سلسلہ میں مجلس عمل کے پارلیمانی رہنماؤں نے ذیل کا خط اپنے دستخطوں سے پسلیک کر لکھا، جناب سپیکر صاحب، قومی اسمبلی، پاکستان۔

جناب محترم،

ہم درج ذیل تحریک پیش کرنے کی اجازت چاہتے ہیں :

ہر گاہ یہ ایک مسئلہ حقیقت ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کیا۔

اور یہ کہ جھوٹ پر مبنی اس کا دعویٰ نبوت قرآن کریم کی بیشاکیات کو (نحوہ باللہ) جھوٹا ثابت کرنے کی کوششیں اور ترک جہاد کی تلقین، اسلام کے اہم اور بنیادی ارکان سے اس کی کھلی قدری کے مترادف ہیں۔

اور یہ کہ مسلمانوں کے اتحادی کو تباہ کرنے اور اسلام کو ایک جھوٹا مذہب ثابت کرنے کی غرض سے وہ سراستہ ساز کی تخلیق تھا۔

اور یہ کہ تمام امت مسلمہ کا اس امر میں اتفاق ہے کہ مرزا فلام احمد کے پیروکار خواہ اس کی نبوت پر ایمان رکھتے ہوں یا اسے کسی بھی شکل میں ایک مصلح یا مذہبی رہنما مانتے ہوں، دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔

اور یہ کہ اس کے پیروکار، خواہ کسی بھی نام سے موسوم ہوں، اپنے آپ کو مسلمانوں ہی کا ایک فرقہ ظاہر کرتے ہوئے، ان میں رہ کر، اندونی اور بیرونی طور پر تخریبی سرگرمیوں میں مصروف عمل ہیں۔

اور یہ کہ مذکورہ کے مقدس شہر میں ۶ سے ۱۰ اپریل تک رابطہ عالم اسلامی کے تحت منعقدہ دینا اسلام کی مختلف تنظیموں کے اجلاس نے (جس میں دنیا کے ہر حصہ سے ۴۰ مسلمان تنظیموں اور اداروں نے شرکت کی) متفقہ طور پر تسلیم کیا کہ قادیانیت، اسلام اور دنیائے اسلام کے خلاف یکسر تخریبی تحریک ہے، جگذب بیانی اور فریب دہی سے اپنے آپ کو اسلام ہی کا ایک فرقہ ظاہر کرتی ہے۔

لہذا یہ اسلی اس امر کا اعلان کرتی ہے کہ مرزا فلام احمد کے پیروکار خواہ وہ کوئی سنا نام بھی رکھتے ہوں، مسلمان نہیں اور یہ کہ نیشنل اسلی میں سرکاری طور پر ایک بل پیش کیا جائے جس سے آئین میں مناسب ترمیم ہو۔ انہیں اس ترمیم کی رو سے اسلامی جمہوریہ پاکستان میں بطور غیر مسلم اقلیت اپنے حقوق و مفادات کا تحفظ حاصل ہو۔

دستخط کنندگان

(۲) مولانا عبدالمصطفیٰ الازہری

(۴) پروفیسر غفور احمد

(۶) مولانا عبدالحق اکوڑہ ٹنک

(۸) سوار شیر باز خاں خزاری

(۱۰) مسٹر عبدالحمد جتوئی

(۱) مولانا ہفتی محمد

(۳) مولانا شاہ احمد نورانی

(۵) مولانا یحییٰ محمد علی رضوی

(۷) چودھری ظہور الہی

(۹) مولانا خضر احمد انصاری

- (۱۱) صاحبزادہ احمد رضا خاں قصوری
(۱۲) مسٹر محمد ظلم فاروقی
(۱۳) مولانا صدر الشیخ
(۱۴) مولانا نعمت اللہ
(۱۵) مسٹر مٹرا خاں
(۱۶) مسٹر غلام فاروق
(۱۷) مسٹر مولابخش سومرو
(۱۸) مسٹر شاکت حیات خاں
(۱۹) سردار شوکت حیات خاں
(۲۰) مسٹر علی احمد تالپور
(۲۱) راجہ نور شید علی خاں
(۲۲) رئیس عظام چوہاں

مندرجہ بالا تحریک کی بنیادوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے انضمامِ تعلیم کی مختلف دادیاں قطع کرنے کے بعد عبد الحفیظ پیرزادہ وزیر قانون نے

کرتی ہے کہ حسب ذیل سفارشات قومی اسمبلی کو غور اور منظوری کے لیے بھیجی جائیں۔
کل ایوان پر مشتمل خصوصی کمیٹی اپنی رہنمائی اور ذیلی کمیٹی کی طرف سے اس کے سامنے پیش کردہ قومی کی طرف سے اس کو بھیجی گئی قراردادوں پر غور کرنے اور دستاویزات کا مطالعہ کرنے اور گواہوں بشمول سربراہانِ انجمن احمدیہ، ربوہ اور انجمن احمدیہ ایشیاء عرب اسلام لاہور کی شہادتوں اور جرح پر غور کرنے کے بعد متفقہ طور پر قومی اسمبلی کو حسب ذیل سفارشات پیش کرتی ہے:

(الف) کہ پاکستان کے آئین میں حسب ذیل ترمیم کی جائے۔

دآدل، دفعہ ۱۰۶ (۳) میں قادیانی جماعت اور لاہوری جماعت کے اشخاص (جو اپنے آپ کو احمدی کہتے ہیں) کا ذکر کیا جائے۔

(دو) دفعہ ۲۹۰ میں ایک نئی شق کے ذریعے غیر مسلم کی تعریف کی جائے۔ مذکورہ بالا سفارشات کے نفاذ کے لیے خصوصی کمیٹی کی طرف سے متفقہ طور پر منظور شدہ مستودہ قانون منسلک ہے۔

(ج) کہ مجبورہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۲۹۵ الف میں حسب ذیل تشریح درج کی جائے۔

تشریح :- کوئی مسلمان جو آئین کی دفعہ ۲۹۰ کی شق (۳) کی تصریحات کے مطابق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کے تصور کے خلاف عقیدہ رکھے یا عمل یا تبلیغ کرے وہ دفعہ ۲۹۵ کے تحت مستوجبِ سزا ہوگا۔

(ج) کہ متعلقہ قوانین مثلاً قومی رجسٹریشن ایکٹ، ۱۹۶۳ اور امتحانی فہرستوں کے قواعد ۱۹۶۴ میں مندرجہ قانونی اور مضابطہ کی ترمیمات کی جائیں۔

(۵) کہ پاکستان کے تمام شہریوں خواہ وہ کسی بھی فرقے سے تعلق رکھتے ہوں، کے جان و مال، آزادی، عزت

اور بنیادی حقوق کا پوری طرح تحفظ اور دفاع کیا جائے گا۔

اور ان سفارشات کی اساس پر ذیل قابل پیش ہوا

ہر گاہ یہ قرین مصلحت ہے کہ بعد ازیں درج اغراض کے لیے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین میں مزید ترمیم

کی جائے۔

لہذا بذریعہ ذیل قانون وضع کیا جاتا ہے :

۱۔ مختصر عنوان اور آغاز لغات۔ (۱) یہ ایکٹ آئین (ترمیم دوم)، ایکٹ ۱۹۷۴ء مکمل ہو گا۔

(۲) یہ فی الفور نافذ العمل ہو گا۔

۲۔ آئین کی دفعہ ۱۰۶ میں ترمیم۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین میں، جسے بعد ازیں آئین کہا جائے گا۔

دفعہ ۱۰۶ کی شق (۳) میں لفظ فرقوں کے بعد الفاظ اور قومیں اور قادیانی جماعت یا لاہوری جماعت کے اشخاص (جو اپنے آپ کو احمدی کہتے ہیں) درج کیے جائیں گے۔

۳۔ آئین کی دفعہ ۲۶۰ میں ترمیم : آئین کی دفعہ ۲۶۰ میں شق (۲) کے بعد حسب ذیل نئی شق درج کی جائے گی۔ یعنی :

”(۳) جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم، جو آخری نبی ہیں، کے خاتم النبیین ہونے پر قطعی اور غیر مشروط طور پر ایمان نہیں رکھتا یا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی بھی مضموم میں یا کسی بھی قسم کا نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے یا جو کسی ایسے مدعی کو نبی یا دینی مصلح تسلیم کرتا ہے، وہ آئین یا قانون کی اغراض کے لیے مسلمان نہیں ہے۔“

بیان اغراض و وجود

جیسا کہ تمام ایوان کی خصوصی کمیٹی کی سفارشات کے مطابق قومی اسمبلی میں طے پایا ہے، اس بل کا مقصد اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین میں اس طرح ترمیم کرنا ہے تاکہ ہر وہ شخص جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے پر قطعی اور غیر مشروط طور پر ایمان نہیں رکھتا یا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی بھی مضموم میں یا کسی بھی قسم کا نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے یا جو کسی ایسے مدعی کو نبی یا دینی مصلح تسلیم کرتا ہے اسے غیر مسلم قرار دیا جائے۔

عبدالحفیظ پیرزادہ
وزیر اچارج

اس بل کی متفقہ منظور کی بعد نوے سال کا ایک تفسیہ ختم ہو گیا۔ مسلمانوں کی طویل جدوجہد بفضل تعالیٰ کامیاب ہوئی۔ مرزا غلام احمد کی مہسوفی اُمت ایک نامسلمان اقلیت کے طور پر شتم ہو گئی اور عرب و عجم میں وحدتِ ملی کا تصور اس مملکت سے محفوظ ہو گیا جو اس کے سیاسی بدن کا استہاری نامور تھا۔

مجلسِ عمل میں ہر دینی اور سیاسی جماعت کے نمائندے شامل تھے۔ مولانا محمد یوسف بنوری صدر منتخب کیے گئے اور آخر تک اپنے عالمانہ تدبیر سے تحریک کی رہنمائی کی۔ آپ کے علاوہ مجلس تحفظ ختم نبوت کی طرف سے مولانا خان محمد، مولانا محمد شریف جالندھری، مولانا تاج محمد اور سردار میر عالم بخاری مجلسِ عمل میں شامل تھے۔ جمعیتہ علمائے اسلام کی طرف سے مولانا مفتی محمد امین، امین۔ اے، مولانا عبدالحق ایم۔ این۔ اے، مولانا محمد زمان پکیزئی، سینئر بلوچستان، مولانا عبید اللہ انور، مولانا محمد اعلیٰ خاں اور مولانا محمد ابراہیم شریک ہوتے۔ جمعیتہ علمائے پاکستان کی نمائندگی مولانا شاہ احمد نورانی، ایم۔ این۔ اے، مولانا محمد علی رضوی، ایم۔ این۔ اے، مولانا عبدالمصطفیٰ لاہوری، ایم۔ این۔ اے، مولانا عبدالستار نیازی، ایم۔ اے۔ مولانا صاحبزادہ فضل رسول (لاہور)، مولانا غلام علی وکازوی اور علامہ محمد احمد رضوی (لاہور) نے کی۔ علامہ محمد احمد رضوی مجلسِ عمل کے جنرل سیکرٹری رہے۔ اپنے فرائض من و خوبی سے سرانجام دیے۔ آپ نے سواتین ماہ تک پنجاب میں صبح دس بجے مختلف مجلسوں کو خطاب کیا اور تحریک کی حرارت کو قائم رکھا۔ جماعتِ اسلامی کی طرف سے پروفیسر غفور احمد ایم۔ این۔ اے، میاں فیصل محمد اور چودھری غلام حیلانی نے حصہ لیا۔ مجلسِ عمل کی اکثر قراردادیں باہمی انہام و تفہیم کے بعد پروفیسر غفور احمد کے قلم سے مرتب ہوتی تھیں۔ علامہ کرامت علی شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خاں، مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری اور مفتی زین العابدین پیشین پیش رہے۔ مولانا غلام اللہ راولپنڈی ڈویژن میں تحریک کی رُوح رواں تھے۔ انہیں اس مجرم میں کئی دفعہ گرفتار کیا گیا۔ مولانا سید عنایت شاہ بخاری گجرات میں مہر کر رہے۔ ان کے علاوہ جمعیتہ العلماء پاکستان کے رہنما سید محمود شاہ گجراتی کو علامہ کلمتہ الحق کی پاداش میں نظر بند کیا گیا۔ مفتی زین العابدین نے لائیپلز میں تحریک کا شاب قائم رکھا۔ جماعتِ اہل حدیث کی طرف سے میاں فضل حق، مولانا عبدالقادر روپڑی، علامہ احسان الحق ٹھیکر، مولانا محمد صدیق، مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف، مولانا محمد اسحاق چیمیشیخ محل اشرف نمائندگی کہ اتحاد العلما کی طرف سے مولانا گلزار احمد مظاہری اور مفتی سیاح الدین کاکا خیل شریک ہوئے۔ شیعوں کی نمائندگی فرعیضہ سید مظفر علی شمس نے ادا کیا۔ جمہوری پارٹی کی طرف سے نوابزادہ نصر اللہ خاں، رانا ظفر اللہ خاں اور میاں غلام دیکر باری نے شرکت کی۔ چودھری منظور الٰہی ایم۔ این۔ اے، میجر عجاز احمد (لاہوری) اور سید اصغر علی شاہ (راولپنڈی) نے

مسلم لیگ کی نمائندگی کی مجلس احرار کی ترجمانی سید ابو ذر غفاری، تید عطامن اور چودھری ثناء اللہ بھٹہ نے کی۔
 شورش کشمیری قادیانی مجاہدہ کمیٹی کی طرف سے شامل رہے۔ ان سب بزرگوں اور عزیزوں نے کراچی سے پشتاور منک
 بالعموم اور پنجاب کے طول و عرض میں بالخصوص تحریک کو آتش فشاں اور غیر متحرک کر دیا۔ ان کے علاوہ ہر مسجد کے پیش امام
 نے سرور حد کی بازی لگا دی۔ مسلمان طلبہ کی مختلف تنظیموں نے اس سلسلہ میں دعوت و عزیمت کا یکساں قیام کیا۔ پنجاب
 یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین نے اپنے عہدیداروں کی سیاست میں صوبہ کے نوجوان لہو کو گراتے رکھا۔ مولانا یوسف بنوری
 اور مولانا شریف جالندہری نے مجلس تحفظ ختم نبوت کے محفوظ فنڈ میں سے تحریک پر ڈیڑھ لاکھ روپیہ خرچ کیا۔ نواب زاد
 نصر اللہ خاں، مولانا غلام اللہ خاں، علامہ محمدرضوی، تید مظفر علی شمس، مولانا تاج محمڈ، علامہ احسان الہی ظہیر، شورش
 کشمیری، علامہ عزیز انصاری، چودھری ثناء اللہ بھٹہ اور تید ابو ذر غفاری نے ایک ایک دن اور ایک ایک شب
 میں کئی کئی جلسوں کو خطاب کیا۔ شورش کشمیری قید ہو گئے اور رہائی کے بعد طویل علالت کا ہفت بنے۔ اس دوران میں
 علامہ احسان الہی ظہیر، تید مظفر علی شمس، علامہ محمدرضوی، مولانا محمد ارحم نے اپنے لیے خواب و غور حرام کیے رکھا اور تحریک
 کا بائیکاٹ نہ سمجھ نہ ہونے لگا۔ دھرمک کے روزناموں میں نوائے وقت و اسد اخبار تھا، جس نے قادیانی مسئلہ میں مسلمانوں
 کا ہم آواز ہو کر سرور کائنات کی خوشنودی کو مقدم رکھا اور قرن اول کی اس جو افروزی کا ثبوت ہم پہنچایا، جو
 قادیان رسالت کا طعنی امتیاز تھا۔ اس کے ایڈیٹر مجید نظامی اس تحریک میں قلم کی شہ سرفی تھے۔ یا پھر کراچی کا روزنامہ
 'جبارت' اس تحریک پر قربان ہو گیا اور اس کے ایڈیٹر سید صلاح الدین کو قید و بند میں ڈال دیا گیا۔
 غرض ۹۰ برس کی تحریک میں یہ پہلا موقع تھا کہ پورا ملک اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ تمام شہروں اور قصبوں کے
 علاوہ تحریک ہر گاؤں کی چو پال تک پہنچی گئی۔ کوئی محو اند رہا، جہاں قادیانیت کے خلاف نعرہ رعیت نہ گونجا ہو۔
 عوام کے میدانوں اور حکومت کے ایوانوں میں تحریک کے شعلے بھڑکتے رہے اسی کی فوج بھی اس سے سرشار ہو گئی۔ ان
 آثار و مظاہر ہی کا نتیجہ تھا کہ میلہ کذاب کی اسلانی روج، ستمبر ۱۹۷۲ء کو پاکستان سے حبشہ کے لیے رخصت ہو گئی
 اور اس کا استعماری وجود اپنے انجام و مقام کو پہنچ گیا۔